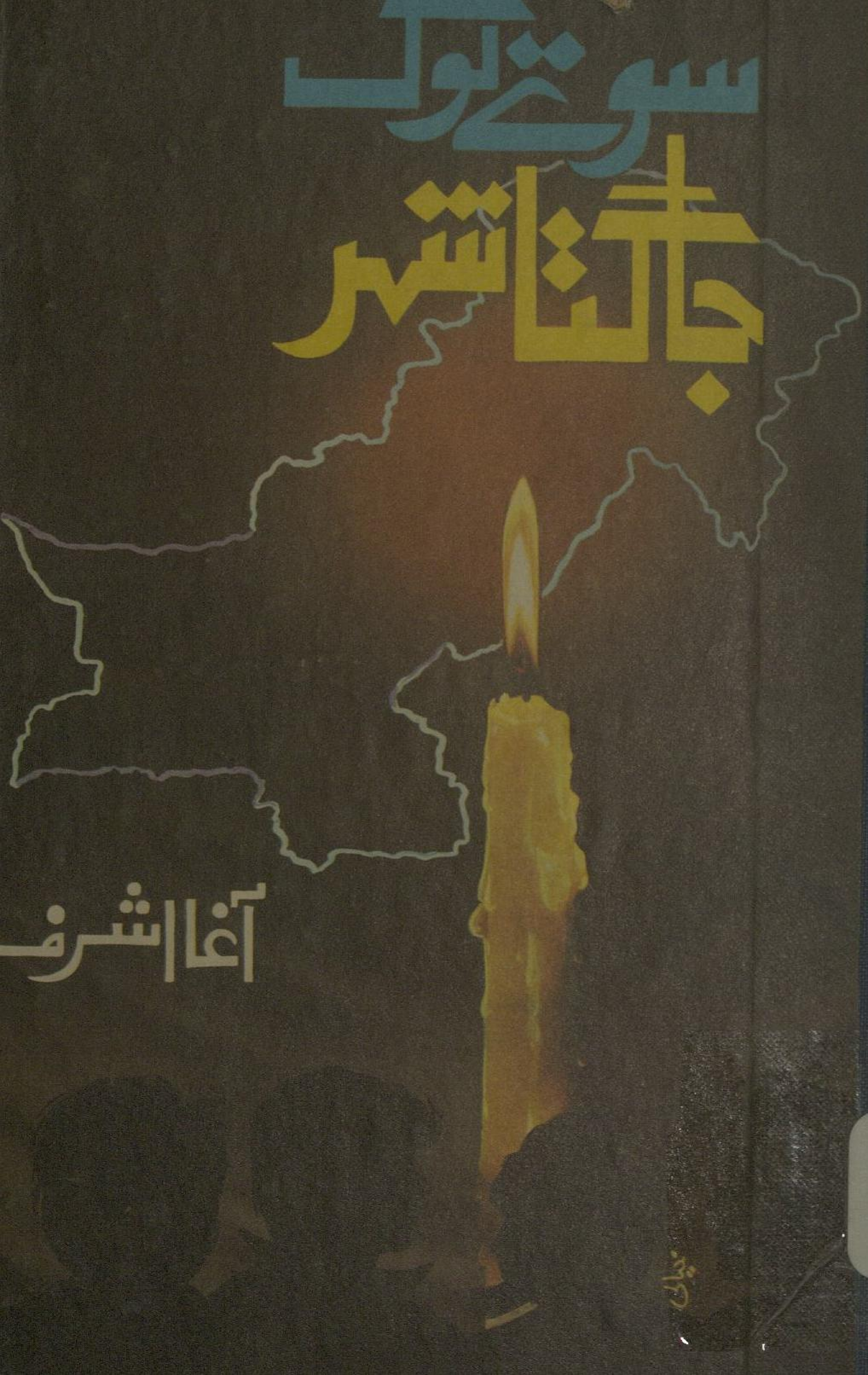


سوتے لوگ
جاگتا شہر
آغا اشرف

سوتے لوگ
جاگتا شہر

ایک تاریخ اور ہماری عبرتناک داستان
ہم نے کیا کھویا کیا پایا۔ تاریخ کے آئینے میں
تشکیل و تعمیر پاکستان کی عظیم دستاویز

سوتے لوگ

جاگتا شہر

آغا اشرف

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور حیدرآباد کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : علمی پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت : [redacted] روپے

مقام اشاعت
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
ادبی مارکیٹ - چوک انارکلی لاہور

اُس اجالے کے نام

جو حقیقت میں اجالا ہے فریبِ اجالا نہیں۔

اک سیاہ رات جو خوابوں پہ گراں گزری ہے!

تدوین وترتیب

آئینہ

یہ اوراق !

نہ تو گل وبلبل کی دلنشیں داستانِ الفت ہیں اور نہ شمع وپروانہ کی خونچکاں حکایت عشق۔ نہ اِن میں زلف ورخسار کے رنگین افسانے ہوں گے۔ نہ ستارہ بار آنکھوں کے غارت گرِ ہوش اشارے اور نہ لب ہائے شیریں کے جنسی چٹخارے۔

" ربابِ نگارِ لبِ جوئبار" والی بھی اِن میں کوئی بات نہیں۔ نہ ان میں راتوں کی نیند حرام کردینے والی حسن وعشق کی وہ شیریں لیکن سنسنی خیز حکائتیں ملیں گی۔ جن میں لیلیٰ وشیریں کسی کی تنہائیوں کے نام ہوتے ہیں۔ اور نہ جنتِ نگاہ عذرا اور فردوس گوش سلمیٰ کا اِن میں کوئی سراغ ملے گا۔

وصل کی کیف پرور ـــــ جذبات انگیز ـــ حیات آفریں لذتوں کے بیان دلفریب سے بھی بالکل کورے ہیں یہ اوراق ـــ اور ہجر وفراق کے موت سے بھی تلخ تر انتظار اور صبر آزما ابتلا وخلفشار کی عکاسی بھی اِن میں کسی جرم کی حد تک ممنوع ہے۔

یہ اوراق ـــــ !

کوئی البم ـــ کوئی مرقعِ نظر نواز بھی نہیں۔ جسے زہرہ جبینوں، لالہ رخوں، پری چہروں، نازک اندام نازنینوں، شعلہ رخساروں مہ پاروں اور برق پاروں کی ہوشربا تصویروں سے مزین کیا گیا ہو۔ کسی لفظ سے کوئی نادرہ نظارۂ جمال دیتی نظر نہ آئے گی۔ کوئی حرف کسی قتالہ کے رخِ زیبا کی نمائشِ نقش ونگار کا آئینہ دار نہ ہوگا۔ کوئی جملہ کسی عشوہ ساز کے عشوہ وغمزہ وادا کی ترجمانی نہ کرے گا۔ کوئی فقرہ کسی لعبت چین کی کاکلِ شبگوں اور پنکھڑی سے ہونٹوں کے قصیدے نہ کہے گا۔ نگاریات وصنمیات کی اِن میں کوئی گنجائش نہیں۔

سماع وعظ کجا نغمہ رباب کجا

نہ تو کوئی مغنیِ آتش نفس ہے ان میں اور نہ اُس کے سحر کار سازو آواز کی سحر کاری و شعلہ نوائی۔ نہ رندِ خانہ خراب ہیں اِن میں۔ نہ میخوار نہ میخانے۔ نہ مُغبچے نہ ساقی۔ نہ ساغر و سبو اور نہ مئے لالہ فام سے لبریز صراحیاں اور مٹکے۔

گلہائے ہزار رنگ سے مہکتی معطر و معنبر گل پوش وادیوں، کہساروں، برگ زاروں، مرغزاروں، یاسمینی و بنفشی کنجوں، نرگسی غرفوں، نقرئی چشموں اور نیلمیں جھیلوں کی تصویر کشی و منظر نگاری بھی نہیں کی گئی ان اوراق میں کسی فرعون و شداد کی ہیبت و جلال کے قصیدے بھی نہیں ہیں یہ اوراق۔ اور نہ کسی چنگیز و ہلاکو کی وحشت و بربریت کے تذکرے۔

ان میں کسی ظل الٰہی، مہابلی، جہاں پناہ، عالم پناہ، اعلیٰ حضرت، خداوند اور ان داتا کی مدح سرائی بھی نہیں کی گئی۔ اور نہ اُس کی دولت و ریاست کے قصرِ بلند کے دروازے پر جبیں سائی و سجدہ ریزی کی گئی ہے۔

سجدہ بس ایک ہی ذات کو روا ہے۔ اور وہ تنہا خدا کی ذات ہے۔ جو اپنی جملہ صفات کے ساتھ اپنی ذات میں تنہا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ جو حد بھی ہے بے حد بھی ہے۔ جو محدود بھی ہے لا محدود بھی ہے۔ جو با نام بھی ہے اور بے نام بھی۔ مختصر بھی اور غیر مختصر بھی۔ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا۔ اُس ذات اعلیٰ صفات کی Magnification اور ——— Minification کا یہ عمل سوائے اُس کی ذاتِ بابرکات کے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اور دیکھو ——— !

ان اوراق کو طلسمات سیاست کے کسی سامری کے سحر و طلسم کا پٹارہ بھی نہ سمجھا جائے۔ اور نہ کسی ذہنی شعبدہ باز کی شعبدہ بازی۔

ظلم کو عدل۔ اندھیرے کو اجالا۔ سراب کو پانی۔ شعلے کو شبنم۔ کانٹوں کو پھول۔ زہر کو امرت۔ راہزنی و روباہی کو رہنمائی۔ جبر استبداد کو مصلحت۔ رندی و ریاکاری کو پارسائی جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ سے تعبیر کر کے ٹھوس و مسلمہ حقیقتوں اور صداقتوں کے خلاف ایک سازش کرنا بھی ان اوراق کا مقصد نہیں۔ اور نہ یہ اُن جھنجھلاہٹوں پر نقاب ڈالنے کی

سرنوشت ہو سکتے ہیں جس میں غاصبوں، قاتلوں، راہزنوں، ریاکاروں، شرپسندوں فتنہ پردازوں، سازشیوں اور باغیوں کو کسی قسم کی رعایت دی گئی ہو۔ لٹیرے کو لٹیرا۔ قزاقی کو قزاق۔ گندم نما جو فروش کو گندم نما جو فروش۔ ابن الوقت کو ابن الوقت۔ ضمیر فروش کو ضمیر فروش۔ ظالم کو ظالم اور موقع شناس کو موقع شناس نہ کہنا ایک جرمِ عظیم ہے۔ ان اوراق میں اسی تعزیرات کی دفعات کی وضاحت کی گئی ہے۔ کسی دباؤ یا لالچ میں آکے سونے چاندی کے اُن ہیکلوں کی تبلیغ واشاعت نہیں کی گئی۔ جن میں پتھر کو خدا اور انسان کو پتھر سمجھا جاتا ہے۔ جن کے اندر قوت و اقتدار کے تختِ طاؤس پر متمکن جبر و استبداد کے نمائندے۔ وحشت و بربریت کے نقیب۔ تباہی و بربادی کے کارندے۔ تاخت و تاراج کے علمبردار۔ ابلیس و اہرمن کے پرستار بڑی دھوم دھام سے خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ زمین پر اس دو روزہ زندگی میں خدا کی طرح چلتے ہیں۔ خدا کے لب و لہجہ میں بولتے ہیں بات کرتے ہیں۔ جو خدا نہیں ہوتے مگر چاہتے ہیں ان کو خدا کہا جائے۔

ہر دَور میں کچھ لوگ زمانے کے خداوند رہے ہیں۔ جنہیں خدا کی طرح بولنے کی عادت رہی ہے جنہوں نے زبانِ بشر میں کلام کرنا اپنی توہین سمجھا ہے۔ اور خدا کی شہنشاہی میں خدا کی زمین پر یوں چلتے رہے ہیں جیسے ان کے زیرِ پا چاند ستاروں کی ردا بچھی ہوئی ہو۔

دنیا کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ اپنی خدائی و کبریائی کو جبر و جور سے تسلیم کرانے کے لیے تیر و تلوار کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ اور جو جبر و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج، صدائے استغاثہ بلند کرتے رہے ہیں باغی و سرکش گردانے جاتے رہے ہیں۔ ان پر بغاوت و سرکشی کی فردِ جرم لگا کر ان کی آواز کو خاموش کرنے کے لیے یا تو انہیں زنداں میں دھکیلا جاتا رہا ہے اور یا پھر وہ حکمتِ عملی کی کسی صلیب پر کھنچ کر مصلوب ہوتے رہے ہیں۔

یہ ظالموں کا قانونِ مکافات رہا ہے کہ ظلم کر کے بھی انہوں نے ظالم کہلوانا پسند نہیں کیا۔ اور اپنے ظلم کا نشانہ بنا کر مظلوموں ہی کو ظالم مشہور کیا ہے۔ مظلوموں کو مصلوب و سنگسار کرنے کے ظالموں نے آج تک نہ جانے کیسے کیسے بہانے تراشے ہیں۔ نہ جانے کن کن حیلوں سے کام لیا ہے۔ جرم کسی اور کا ہوتا ہے سزا کسی اور کو دی جاتی ہے۔ میدانِ کربلا

ہیں ایک طرف تو شہید الشہدا سیدنا حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقا پر جبر وتشدد کے ہیبت ناک دروازے کھول دیئے گئے تھے اور دوسری طرف یہ مشہور کیا جا رہا تھا کہ سبط پیغمبر نواسا رسول جمعیت سے نعوذ باللہ خارج ہو گئے ہیں۔ اور امیر کی اطاعت سے روگردانی کرتے ہوئے ملت پر خروج کیا ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے۔ وہ انسان کسی ایسے جرم کی سزا کا مستحق قرار نہیں پا سکتا جس کا اسے شعور واحساس نہ ہو۔ جس کے ارتکاب میں اس کا اختیار وارادہ شامل نہ ہو۔ جسے قانون خود ہی جرم کرنے پر آمادہ کرے اور پھر خود ہی اسے اپنی گرفت میں لے لے۔ اور پھر اس سے وہ انسانیت سوز سلوک کیا جائے کہ جس کو دیکھ کر بہمیت بھی شرما جائے۔ اور انسانیت چیختے اور اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے دم توڑ دے۔

جس انسان سے جرم کا ارتکاب ہوتا ہے وہ اس جرم کے باوجود انسان ہوتا ہے۔ اسے جرم کی سزا تو دی جا سکتی ہے شرف انسانیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن خود ساختہ خداؤں کے ہیکل عظمت وجبروت میں زیر عتاب آنے والے سزا کے ساتھ شرف انسانیت ہی سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ بری طرح سزا پاتے ہیں۔ ان کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا۔ جبکہ تذلیل انسانیت میزان خداوندی میں اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا مرگ مفاجات ہے۔

یہ اوراق ——— !

کسی سیاسی چپقلش کی سرسامی کیفیت۔ قوت واقتدار حاصل کرنے کی کش مکش کے جنون۔ ذاتی پسند وناپسند کے ہذیان اور شخصی مفاد پرستی کی تائید وحمایت کی سرگذشت بھی نہیں۔

کوئی تسلیم کرے نہ کرے۔ لیکن مسلمات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ حقیقت وواقعیت کو ایسے بدلا جا سکتا ہے۔ اٹل حقیقتیں کبھی نہیں بدلا کرتیں۔ وہ کانچ کی دیوار نہیں ہوتیں جسے ٹھوکر مار کر چی کرچی کر دیا جائے۔

اگر سوچنے سمجھنے اور دیکھنے سننے کی حسیات میں کوئی نقص پیدا نہ ہو چکا ہو تو اس سے کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے کہ عبرتوں اور بصیرتوں کا یہ تقاضا ہے کہ بہرے وقت کی آواز سنیں۔

اندھے ابدی و ازلی قانون کا معجزہ دیکھیں -

حق و صداقت کی آواز کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی - صداقت ہمیشہ سے ایک ابھرنے والا جوہر ہے - جسے جھوٹ کی جسیم چٹانوں سے بھی نہیں دبایا جا سکتا -

جو کوششیں حق و صداقت کے اعلان کے لیے کی جائیں زمانہ چاہے کتنی ہی ان کی مخالفت کرے وہ سیلِ دریا کی طرح اپنی راہ نکال لیتی ہیں - اور کبھی ان لوگوں کی محنت ضائع نہیں جاتی جو حق و صداقت کا ساتھ دیتے ہیں -

لیکن حق و صداقت کا اعلان کوئی آسان کام نہیں - اس کے لیے بڑے صبر و تحمل، اور نظم و ضبط اور قربانی و ایثار کی ضرورت ہوتی ہے -

خون کر لیتی ہے رو رو کے جگر کو شبنم
تب گلستان میں کہیں لالہ و گل کھلتے ہیں

ایثار و وفا - سوز و جنون - دردِ تمنا - اک دل کا لہو کتنے ہی چراغوں میں جلا کرتا ہے -

وہ بڑی ہی برگزیدہ اور عظیم ہستیاں ہوتی ہیں جو حق و صداقت کا اعلان کیا کرتی ہیں - وہ سونے چاندی کی میزانوں میں نہیں تلتیں - ضمیر بیچ کے خریدی ہوئی جاہ و حشمت کے بازاروں میں نہیں بکا کرتیں - وہ دنیا میں حق و صداقت کا بیج بو کر اپنی زندگی کا لہو اس کی آبپاشی میں صرف کر دیا کرتی ہیں - بایں ہمہ ایسا صلہ نہیں پاتیں جس کی وہ مستحق ہوتی ہیں - ان کے خلوص کو عیاری سمجھا جاتا ہے - ان کی صداقت کو شعبدہ بازی کا نام دیا جاتا ہے - اُن کی قیادت و سیادت کی قدر نہیں کی جاتی - ان پر سخت الفاظ کا پتھراؤ کیا جاتا ہے — ان پر مخرب الاخلاق نعروں کے کوڑے چلائے جاتے ہیں - ان کو نفرت و حقارت کے زہر میں بجھی سنگینوں سے چھیدا جاتا ہے - ان پر تعصب اور شخصی مفاد پرستی کے گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں - ان پر ذاتی پسند و ناپسند کے ہذیان کا لاٹھی چارج کیا جاتا ہے - زبان کے پورے زہریلے پن کے ساتھ ان کی مخالفت کی جاتی ہے -

اور یہ کیسی افتاد ہے کہ اندھیروں کے مسافر نیچے چھلانگ لگانے کے لیے اونچے اٹھے ہیں -

زمانہ سے مہلت پائی ہے تو اپنے ہی خلاف سازش اور آپس ہی میں دراندازی کرنے لگے ہیں۔

یہ کیسی کشاکش ہے جس سے دم گھٹا جا رہا ہے۔ یہ کیسی کشود ہے جس نے گرہوں پر گرہیں ڈال دی ہیں۔ جو سوچا گیا بری طرح سوچا گیا۔ جو ہو چکا بہت ہی رسوا کن ہوا۔

اور یہ اوراق ——!

اُن کی روداد ہیں جو اجالے میں آکر بھی ماضی کے اندھیرے کے کفن میں ایک زندہ لاش کی طرح پڑے رہے۔ اور روشنی کے کسی نشان کسی علامت کو ، پہچان پائے — وہ لوگ جنہوں نے اپنے وجود کے ذرات کے رخساروں پر جبر و استبداد کے طماچوں کی خراشیں نہ دیکھیں۔

جو روشنیوں کے شہر میں اپنی بینائی کھو چکے — جن میں بصیرت کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔ جن کے جسم پر اندھیرے کی ایک کینچلی اترتے ہی اندھیرے کی دوسری کینچلی ابھر آئی ہے۔

جلتے جاگتے روشنیوں کے شہر میں یہ رینگتے اندھیروں کے اُن بیماروں کی سرگزشت ہے جن پر تقلید کی ایک پراسرار بیماری آسیب کی طرح مسلط ہے۔ اور ایک خون آشام کی طرح ان کی گردنوں میں اپنے خونخوار دانت کھبو کر ان کا خون چوس رہی ہے۔ جواب تک یہ نہ جان سکے کہ ان کی بیماری کیا ہے۔ ایک سرسامی کیفیت ہے جس میں نیند میں بولنے والے صرف بڑبڑا رہے ہیں۔ یہ وہ گونگے ہیں جو اب بولنے پر آئے ہیں تو یہ سمجھ نہیں پا رہے کہ بولیں تو کیا بولیں۔ بات کریں تو کیا بات کریں۔ انہوں نے زبانوں سے وہ سب کچھ اگلنا شروع کر دیا ہے۔ جو حلق اور ہونٹوں کی استطاعت میں ہے

یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے دکھوں کو لاعلاج بنا رکھا ہے۔ اندھیرے میں ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلتے چلتے جب یہ سیدھے راستے پر چلنے لگے ہیں تو یہی بھول گئے ہیں کہ انہوں نے جانا کہاں ہے۔ ان کی منزل کہاں ہے۔

میں تم سے مخاطب ہوں۔ تم سے —— جو کل کے آدمی ہو اور آج کی باتیں سن کر

بوکھلا رہے ہو۔

جو دھوپ کی سرحدوں پر سے چاندنی کے ہیولوں کو عقل کے سانچوں میں ڈھالنے کو سرگرداں ہو۔ درختوں کے پتوں پر سے ہواؤں کی سرگوشیاں چن کر بوتلوں میں بند کیا کرتے ہو۔ مچھلی کی آنکھ نکال کر سمندر کے گہرے پانیوں کا وزن کرنے کی ادھیڑ بن میں رہتے اپنے ذہن کو جلا دینے کے لیے سانپ کے زہر سے دھویا کرتے ہو۔

تم شور بے میں بہنے اور گھاس پات میں رہنے والی مخلوق ہو۔ تمہارے جسم سے گوبھی کی بُو آتی ہے۔ اور تمہاری سانسوں میں پیاز اور لہسن کی باس رچی ہوئی ہے۔

تم یہ چاہتے ہو چاند کو تمہارے لئے انڈے کی طرح ابال دیا جائے۔ سورج کو پراٹھے کی طرح تل کر تمہارے ناشتے کا اہتمام کیا جائے۔

جب تم اجالوں کے اس شہر میں آئے تھے تمہارا وجود لکڑی کا اور آنکھیں پتھر کی تھیں۔ تمہارے وجود کی جڑیں اندھیروں میں تیر رہی تھیں۔ اور تمہارے زخمی پر بھی انہی اندھیروں میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ تم اپنی ذات کے پتھر سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ بہت آگے جا چکے تھے۔ اور اب جب تم واپس لوٹ رہے ہو تمہارے ماضی کی دہلیز مستقبل کا دروازہ بن چکی ہے۔

تم مجھ میں وہ دیکھ رہے ہو جو مجھ میں نہیں ہے۔ اور میں تم میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم میں ہے۔ تمہاری تصویر میں تمہارے خدوخال ضرور ہیں وہ رنگ نہیں جو تم میں ہونے چاہئیں۔ تم بیشک اپنے آپ کو ہزار زاویوں سے دیکھتے جاؤ اس اندھیرے میں تمہیں کچھ دکھائی نہ دے گا جو روشنیوں کے شہر میں تم نے اپنے آپ پر مسلط کر لیا ہے۔

وقت کہتا ہے آگے بڑھو مگر تم ہو کہ رات کے بھاگتے ہوئے آسیب کے پیچھے لڑھکتے جا رہے ہو۔ تمہارے چہروں پر عجیب سی ہیجانی کیفیت ابھی تک طاری ہے۔ جس نے تمہارے سوچنے سمجھنے اور دیکھنے سننے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا ہے۔ تم پتھر میں ڈھل گئے ہو۔ آنکھوں کی موجودگی میں اپنی بینائی کا احساس کھو بیٹھے ہو۔

تمہارے فکر میں جذبہ کا انتشار ہے۔ وحدت فکر اور تدبر کا تسلسل موجود نہیں۔ تم

خواب کو حقیقت اور حقیقت کو خواب سمجھے ہوئے زندگی کی حقیقتوں اور صداقتوں کو جھٹلا رہے ہو۔

تم چڑھتے سورج کی طرف پیٹھ کئے کھڑے ہو۔ اور اپنے سائے کے سوا کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ اور سمجھتے ہو کہ سب کچھ دیکھ رہے ہو۔ اور میں حیرت سے دیکھتے ہوئے یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری ٹانگوں کا کھویا ہوا توازن اور زبان کا بگڑا ہوا لب ولہجہ بحال کب ہوگا۔ تمہاری بے ربط اور منتشر کوششوں کے نتائج کی بے یقینی اور تصورات ونظریات کی بے ترتیبی کیسے ختم ہوگی۔

تم یہ کب سمجھ پاؤ گے کہ تمہاری اجتماعیت انفرادیت سے زیادہ اہم ہے۔ تمہیں یہ کب معلوم ہو سکے گا کہ تمہارا مقصد حیات یک جہتی و یک رنگی ہے۔ انتشار وخلفشار نہیں۔

تم کو اس بات کا علم وعرفان نہیں۔ تم اس کا علم وعرفان حاصل کرو۔ علم وعرفان ہی ایک ایسی رواں دواں قوت ہے جو انسانی شعور اور آگہی کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی ہے۔ اگر تمہاری موجودہ علمی استعداد نئی دریافتوں اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکی تو اپنا وقار کھو بیٹھے گی۔

تمہارے سینے میں نہ دل ہے نہ داغ ہے نہ درد۔ تم کیا جانو دل کیا ہوتا ہے۔ داغ کیا چیز ہے۔ درد کسے کہتے ہیں۔ تمہاری کل کائنات ختم ہو چکی ہے۔ تم زندہ ہو لیکن حقیقت میں تم مر چکے ہو۔ تمہاری زندگی بیوہ کی کلائی کی طرح ننگی ہے۔ تمہاری زندگی — ہاں تمہاری زندگی — اک جبر مسلسل ہے۔ جسے جبر مسلسل کی طرح کاٹ رہے ہو۔ اور نہیں جانتے تم نے کس جرم کی سزا پائی ہے۔ حرص وہوس کا یہ آئینہ خانہ تم نے اپنی چہرہ نمائی کے لئے بنایا لیکن تمہاری ہی زندگی اس میں ششدر وحیراں ہو کر رہ گئی۔ یہ چہرہ نمائی نہیں خود نمائی ہے۔ شاید اسی لئے کچھ لوگ تم سے علیحدہ ہو گئے۔ اب بھی علیحدہ ہیں۔ اور جب تک تم تم نہ ہو جاؤ گے وہ تم سے علیحدہ رہیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا یہ خلوص کیسا ہے۔ جس نے تمہارے ہر دوست کو تم سے بیزار کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ تمہارا سایہ بھی تم سے بیزار ہے۔ اور تمہارا ہمزاد تمہیں ہی ہلاک کرنے کی گھات میں ہے۔

اس گلستان کا جسے تم پاکستان کہتے ہیں، ہر کلی، ہر غنچہ، ہر کونپل، ہر پھول، ہر پتا،

ہر پودا ہر چیز تم سے خائف ہے۔ تم سے نالاں ہے۔ تمہیں باغبان بننا چاہیئے تھا۔ تم صیاد بن کے بیٹھ گئے ہو۔ ہر طرف اپنا دامِ ہمرنگِ زمین بچھا رہے ہو۔ بلبلیں کیسے گلستان میں ٹھہر سکتی ہیں۔ تم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ مکافاتِ میزان سب کے لئے ہے۔ جو دامِ ہمرنگِ زمیں تم دوسروں کے لئے بچھا رہے ہو اس میں تم خود ہی الجھ کر رہ جاؤ گے۔ تمہارے سراپے اور شخصیت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ تم عجیب ہز بید عجیب۔ پگھلے ہوئے لمحوں کی موم اکٹھی کرنے والو آنے والے وقت کا وقائع نگار جب تمہاری داستانِ حیات رقم کرے گا تو اُس میں یہ بھی رقم کرے گا کہ یہ ماضی و حال کے ان انسانوں کی داستان ہے جو اپنے وجود سے شرافت کا لبادہ اتار کر بدکرداری کی قبائیں اوڑھ لیا کرتے ہیں۔ اور ان کی زندگی کے اونگھتے ہوئے کوچوں اور بازاروں میں معاشرے کے ننگے زخم صدیوں تک عریاں رقص کیا کرتے ہیں۔ تمہاری یہ عریانی، یہ خود ناشناسی۔ یہ گمراہی و غفلت تمہاری ایک ایسی آپ بیتی۔ ایک ایسی سرگذشت ایک ایسی عبرتناک سرنوشت بن جائے گی جسے آنے والی نسلیں نصیحت آموز اور نصیحت آمیز نظروں سے پڑھا کریں گی اور کہیں گی یہ اُن لوگوں کی حکایت ہے۔ جنہوں نے اپنی ہستی کی حکایت کو درمیاں سے سنا۔ جن کو نہ اپنی ابتدا کی کچھ خبر تھی اور نہ انتہا معلوم تھی۔

نطق و کلام

ہم کل بھی سرِ دارِ صداقت کے امیں تھے
ہم آج بھی انکارِ حقیقت نہ کریں گے

کسی نمرود کی خدائی ہو یا کسی جابر و قاہر سلطان کی حکومت ہو۔ کسی شعلہ خو شعلہ مزاج رئیس وقت کی ریاست ہو یا کسی غضب ناک دہشت ناک شہر یار کی قلمرو ہو۔ حق و صداقت کے علمبردار اعلائے کلمۃ الحق کے حامی حق کے اجرا کے لئے بے خطر آتش نمرود میں کود جاتے ہیں اور کتمانِ حق نہیں ہونے دیتے۔

وہ کبھی ایسے تسلط کو برداشت نہیں کرتے جو حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہو۔ اُن کی جنگ حصول سلطنت کی جنگ نہیں ہوتی۔ وہ اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے جنگ نہیں کرتے۔ اُن کی جنگ امتیاز حق و باطل کی جنگ ہوتی ہے۔ ایک نصب العین ایک آئیڈیل کی جنگ ہوتی ہے۔

سید الشہدا نے دشتِ کربلا میں اپنے ایک خطبہ ایمان افروز میں اپنے اسی موقف کا اظہار کیا تھا۔ حق پرست احیائے خلافت الٰہیہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔

وہ عہد گرز یا عصر موسیائی ہو۔ وہ امارت کا آسیب ہو یا اقتدار کا عفریت ہو۔ نفس نفس پر اُن کے لئے سولیاں گڑی ہوں یا قدم قدم پر اُن کے لئے مقتل کھلے ہوئے ہوں۔ وہ اپنی زندگی کو کبھی خائف نہیں ہونے دیتے۔ خوف و خطرہ کی کوئی عمود کوئی زاویہ اُن کے چہروں سے عیاں نہیں ہوتا۔

اور پھر وہ کونسی اذیت و عقوبت ہے جو اُن کو پہنچائی نہیں جاتی۔ وہ طوق و سلاسل میں جکڑے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کا ضمیر اور اُن کا جذبۂ حق پرستی زنجیروں کے حصار میں بھی آزاد ہوا کرتا ہے۔

انہیں حق سے منحرف کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ قید خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں

میں ان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ اُن کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ بھوکا پیاسا رکھ کر ان کو فولادی شکنجوں میں دبایا جاتا ہے۔ چلچلاتی دھوپ میں تانبے کی طرح تپتی زمین پر انہیں ننگے بدن لیٹ جانے کا حکم ملتا ہے۔ کڑکتے جاڑوں میں ان کے چاروں طرف برف کی دیواریں چُن دی جاتی ہیں۔ زنداں و زنجیر اُن کی کتابِ زندگی کا عنوان بن جاتا ہے۔

اُن کے گھر نذرِ آتش کر دیئے جاتے ہیں اور اُن کی خاکستر کے ڈھیر پر ہل چلائے جاتے ہیں۔ ان کی مستورات کو سرِ بازار بے آبرو کیا جاتا ہے۔ ان کے بچوں تک کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان کے ضمیر و نطق پر نیزوں اور سنگینوں کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ ان کے قلم و زباں کو حق گوئی و حق نویسی سے روکنے کے لئے گستاپوں کی پوری گارد ان پر تعینات کر دی جاتی ہے۔ ان کی ہر سانس میں خودکشی کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اُن سے حرمتِ جان، جینے کا حق چھیننے کے لئے کیا کیا حربے اور کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال نہیں کئے جاتے۔

لیکن اُن کا صبر و استقامت باطل کی اطاعت قبول نہیں کیا کرتی۔ ان کا مزاج تابعِ شاہی نہیں ہوتا۔ وہ کسی لالچ سے مغلوب اور کسی ترغیب سے مرعوب ہو کر باطل کی غلامی کے کاغذ پر سمجھوتے کے دستخط نہیں کیا کرتے۔

وہ حق کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ جادۂ حق سے منحرف نہیں ہوتے۔ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔ ان کے عزم و ہمت کی گرفت شدید تر دباؤ میں بھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔

خدا جانے وہ کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ ٹوٹ جاتے ہیں جھکا نہیں کرتے۔ وہ ہر کڑی آزمائش دار و رسن میں جرأتِ اظہار کا بھرم قائم رکھتے ہوئے غیر حق کے روبرو اس پر تیکھی طنزیں اور زہریلی تنقیدیں کیا کرتے ہیں۔

جب بھی زنداں میں انہیں شہریاروں کے شبستانوں میں کھنکتے ساغروں کا خیال آتا ہے وہ اپنے پاؤں کی زنجیریں ہلا دیتے ہیں کہ ان زنجیروں کی طرح شہریاروں کے ساغروں کو بھی ایک نہ ایک دن ٹوٹنا ہوگا۔

وہ زمین و زندگی کے اس عہدِ کربلا میں ظلم و ستم سہتے ہوئے قدم قدم پر باطل کو للکارنے کے لئے زندہ رہنے کی مسلسل کوشش کرتے ہیں۔ ان کو جبر سے مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی

گردنیں کٹ تو سکتی ہیں غلامی کی دستاویز بن کر اُن کے تن پر قائم نہیں رہ سکتیں۔ ان کی کٹی ہوئی گردنوں سے گرتا ہوا لہو بھی نعرۂ حق بلند کیا کرتا ہے۔ حق کی حمایت میں بولتا ہے۔

اُن کی زبان کو نوچا تو جا سکتا ہے، کلمہ غیر حق پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کسی مصلحت کی بنا پر، کسی تقاضے کے پیش نظر، کوئی خاص بات سامنے آجانے سے وہ خاموش بھی ہو جاتے ہیں تو ان کی خاموشی زبان بن جاتی ہے۔ ان کی خاموشی پیغام بن جاتی ہے۔ ان کی خاموشی احساس بن جاتی ہے۔ ان کی خاموشی دل بن کر دھڑکنے لگتی ہے۔

اور سنو ——— !

جو بائے حق جان نہیں دیتے اک رسم ادا کرتے ہیں۔ یہ صدیوں کی پرانی تاریخ رہی ہے کہ تلواروں کے نیچے حق گو، حق پرستوں کے گلے رہے ہیں۔ یہ وہ سنت ہے جس کی پیروی وہ حق و باطل کے ہر محاربے، مقاتلے اور معرکے میں اپنے ہی خون سے غسل طہارت کر کے کیا کرتے ہیں۔ تلواروں کے سائے میں نماز عشق ادا کرنے سے انہیں روکا نہیں جا سکتا۔ انہیں حق کے ساتھ جنون کی حد تک عشق ہوتا ہے یہ اُن کا وظیفہ حیات ہے باطل کے اندھیروں کو اجالنے کے لئے حق کی یہ قربانی بہت ضروری ہے۔

ہزار چاند ستاروں کا خون ہوتا ہے
تو ایک صبح اجالوں کی جھلملاتی ہے

وہ اپنے وقت کے منصور ہوا کرتے ہیں۔ ان کی رگ و پے میں دوڑتے خون کے ہر قطرے سے یہی صدا آتی ہے۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

باور کرو ——— !

میں حق کی قسم کھاتا ہوں ——— !

حق کی قسم آج میں حق و صداقت کی باتیں کرنے کے لیئے ہی تم سے مخاطب و متکلم ہوں۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

دل میں وہ درد نہاں ہے کہ بتائیں کس کو
ہاں اگر ہے تو کوئی محرم اسرار سُنے

میرے قریب آؤ۔ میرے قریب آؤ —— اتنا قریب کہ تمہارے اور میرے یعنی ہم دونوں کے درمیان سے ہوا بھی نہ گزر سکے۔ اتنا نزدیک کہ میری آواز فقط تمہارے ہی کان سُن سکیں۔

خلوت ذہن کے ہر راز کی سرگوشی کو
یہ نہ ہو جائے کہ بازار کا بازار سُنے

میں اس وقت مکاشفات بزرگان دیں کے چرچے نہیں کروں گا۔ رئیس وقت کی پیغمبری کے قصے نہ کہوں گا۔ مزاج ارض وسماوات جاننے والوں کی بات نہیں ہوگی۔ ادب کے جملہ مقامات جاننے والوں کا تذکرہ نہ چھیڑوں گا۔ تم جوافسانہ فرہاد توجہ سے سنو تو میں آج سو بار تیشے کی زباں سے تمہیں افسانہ فرہاد سناؤں گا۔ میں داستان گو تو نہیں اور نہ داستان گوئی میرا پیشہ ہے مگر کوشش کروں گا کہ عزم واستقلال اور سوز و ساز و جستجو کی اس داستان میں کہیں جھول نہ آنے پائے۔

اپنی پوری محویت واستغراق کے ساتھ توجہ سے سنو ——!

وہ کونسا کوہ بے ستوں ہے جو عزم کے فرہاد نے اپنے تیشے سے بکمال صنعت گری نہیں کاٹا۔ اور اُس سے حصول مقاصد کی جوئے شیر نکال کر قصر شیریں تک نہیں پہنچائی۔

اور سنو ——!

شیریں میرے نزدیک کسی کرشمہ رنگ وبو کا نام نہیں اور نہ میری نظر میں نظارہ ونظر کے کسی معجزے کو شیریں کہتے ہیں۔ یہ تو اُس چاہت ولگن سے عبارت ہے جو اگر موجود نہ ہو تو زندگی ایک پھول ہے بے خوشبو۔ ایک شمع ہے بجھی بجھی سی۔ ایک چاند ہے گہنایا ہوا۔ یہ نہ ہو تو زندگی میں کوئی دلکشی ورعنائی باقی نہیں رہ جاتی۔

اے روشنیوں کے اس شہر کے آسیب زدہ لوگو ——!

میں آج تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ تم سنو نہ سنو جی چاہتا ہے بس اپنی دھن میں

کہتا چلا جاؤں - آج تم اپنی سماعت کی کھڑکیاں دروازے میری آواز پر بند نہ کرو -

یاد کی آگ دہک اٹھی ہے

آج دروازے کھلے رہنے دو

یاد کی آگ دہک اٹھی ہے - جس کی روشنی میں چند سائے چند پرچھائیاں مجھے اکسا رہی ہیں کہ سؤاتفاق تم نے کروٹ بدلی ہے اور آنکھیں بھی ذرا سی کھولی ہیں تو میں تمہاری غفلت و تساہل کے اس وقفے سے، اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیند کا تازہ جھونکا تمہاری آنکھوں کے دریچے میں آنے سے پہلے تمہیں بتا دوں کہ جب تیز ہوا چلی تو کچھ لوگ پتنگوں اور پتوں کی طرح اڑ کر حدود شام و سحر سے نکل گئے - دھوپ ذرا تیز ہوئی تو کچھ لوگ موم کی طرح پگھل کر رہ گئے -

تم اگر بتا سکو تو بتاؤ یہ کیا معمہ ہے - یہ کیا بجھارت ہے - یہ کیا پہیلی ہے - یہ کیا بھول بھلیاں ہے - جس کے گمنام و بے نام پوشیدہ راستوں سے راستے پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں - جبکہ تمہارے لئے تو بس ایک ہی سیدھا راستہ ہے - بس ایک ہی صراط مستقیم ہے تمہاری -

بولو ——— خدارا بات کرو ——— !

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے - جیسے میں نے صدیوں سے تمہاری آواز نہیں سنی - جیسے تم ہاروت و ماروت کی طرح چاہ بابل میں گر گئے ہو - جیسے تم نیند کے جھونکوں میں گم ہوتے جا رہے ہو -

حالات کی پیشانی سے چرائی ہوئی تمہارے چہرے و پیشانی کی ہر شکن غمازی کر رہی ہے کہ تم ایک خول میں ہو اور اس خول کے اوپر اور کئی خول چڑھے ہوئے ہیں - جبکہ ان سے باہر بھی زندگی ہے - مگر تمہیں تو شاید اپنے ہونے نہ ہونے کا بھی ہوش نہیں -

اے سحر زدہ لوگو ——— میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم ہو - مگر کچھ ایسی حالت میں ہو کہ تم نہیں ہو -

جسم تمہارا اپنا ہے جنبش پرائی ہے - زبان اپنی ہے لیکن لب و لہجہ کسی اور کا ہے - ذہن اپنا ہے مگر سوچیں بیگانی -

اور وہ سوچیں تمہیں نہ جانے کہاں سے کہاں لیے جا رہی ہیں - اور میں یہ سوچ رہا ہوں - برابر سوچتا رہوں گا -

تتلیاں اڑتی ہیں اور ان کو پکڑنے والے
یہی دیکھا ہے کہ اپنوں سے بچھڑ جاتے ہیں

اور مجھ کو یہ اک کھٹکا لگا رہتا ہے!

آندھیاں میں نے سنا ہے کہ اُدھر بھی آئیں ——
کونپلیں کیسی ہیں شیشوں کے مکان کیسے ہیں ——

وقت کا ہر لمحہ ہاتھ میں پتھر لئے پھرتا ہے - اور یہ زندگی شیشے کا گھر ہے - میں وہم تشکیک کا شکار ہو گیا ہوں -

شہر کے کوچہ و بازار میں سناٹا ہے - کیا کوئی سانحہ گزرا ہے زباں تو کھولو - کیا ان آندھیوں سے کوئی ایسا شعلہ نہ لپکے گا جو تمہارے حال اور ماضی کے اندھیروں کو روشن کرتا چلا جائے گا - کیا یہ تتلیاں ہوا میں اوپر ہی اوپر اڑتی چلی جائیں گی اور تمہارے ہاتھ نہ آئیں گے -

سوچو - ذرا سوچو ——!

انسان میں یہ سوچ زیادہ فطری ہے - زیادہ انسانی ہے -!

اس سے پہلے کہ آج کی شام بھی چپ چاپ افق کے اُس پار چلی جائے - خیالوں کے ساحلوں پر آوارہ ہواؤں کی طرح اندھیروں میں ٹہلنا چھوڑ دو - آسمان پر پھیلے ہوئے شام کے رنگوں کو نظر بھر کر دیکھو - اور اپنی تنہائی کی اونچی اونچی کالی دیواروں کو مت دیکھو - ان کے پیچھے سناٹوں کا ایک گھنا جنگل ہے -

جس میں خوابوں کا ایک چاند بیچارہ تیرتا چلا جا رہا ہے - ہوا چل رہی ہے - ایک ہرا پتّا جھونکوں کی لہروں پر ہلورے کھا رہا ہے - یہ وہ معاملات و محرکات ہیں جو انسان کو زندہ رہنے پر مسلسل ابھارتے رہتے ہیں -

آؤ —— میری طرف آؤ - بس چلے آؤ - گھوم کر پیچھے نہ دیکھو ورنہ یہ اندھیرا تمہیں پتھر بنا دے گا - تم یہیں کہیں کھو کے رہ جاؤ گے - اور زندگی اتنی مہلت نہیں دیتی کہ گم شدہ

چیزوں کو تلاش کیا جا سکے۔

وقت کا کوئی بھی لمحہ کسی نہ کسی حادثہ کو جنم دیئے بغیر اگلے لمحے میں تحلیل نہیں ہوتا۔ میری زندگی کے سب سے خوبصورت لمحے وہ ہوتے ہیں جب میں تمہیں خوش دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہوں کہ کچھ دنوں سے تم مزید کسی حادثے کی زد میں نہیں آئے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ تمہارا خوش ہونا بھی ایک المیہ ہے۔ اور ناخوش ہونا بھی ایک المیہ۔

ذرا دیکھو تو ——— !

کتنا چین ——— کتنا سکون ——— کتنی ٹھنڈک۔ کتنی راحت ہے اس چاند کی چاندنی میں ——— !

یہ تمہارے دہکتے ہوئے دماغوں کو ٹھنڈک پہنچائے گی۔ تمہاری بے چین روح کو چین دے گی۔ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی اس ہریالی میں تمہیں راحت ملے گی۔ سکون ملے گا۔

بڑے سکون سے بیٹھ جاؤ۔ اور مجھے کچھ کہنے دو۔ میں نے اس چاند کے جزیروں کے ننھے ننھے موتیوں اور جھلملاتے جگنوؤں سے ایک مالا پروئی ہے۔

آج مجھے اپنے دل کی پوری مٹھاس کے ساتھ کڑوی باتیں کہنے کا حق دو۔ کیا میں تمہارے آنسو نہیں رویا۔ کیا میں نے تمہاری آہیں نہیں کھینچیں۔ کیا میرا دل تمہارے اور صرف تمہارے لئے نہیں دھڑکا۔ کیا میری آنکھیں آسیب زدہ اندھیرے میں تمہارے ساتھ ساتھ نہیں رہیں۔ کیا میں نے تم کو آپس میں محبت کرنا نہیں سکھایا کہ محبت سے تم اظہارِ محبت کی زبان خود بخود سیکھ جاؤ۔

کیا میں نے تمہیں اس شدت سے نہیں چاہا کہ تمہارے لئے میری چاہت ضرب المثل بن گئی ہے۔ کیا تمہارا ہر جذبہ میرے دل کے لہو میں نہیں ڈوبا اور آنکھ سے آنسو بن کر نہیں ٹپکا۔ مگر میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ میرے ہر جذبے کی سچائی کو اداکاری سمجھا گیا ہے۔ میں تو ہمیشہ تمہارے بہت قریب رہا ہوں۔ لیکن وہ تم ہی تو ہو جو مجھ سے قریب ہوتے ہوئے بھی بے حد دور رہے ہو۔ اور کسی گہری سوچ کے دوراہے پر چلے جا رہے ہو۔
قلم کی سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ حق فیصلے رقم کرے چاہے وہ راقم کے خلاف ہی

جانتے ہوں ــــ!

یقین جانو میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔ تمہاری سماعت کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ تمہاری سماعتوں کے مجھ پر بھی کچھ حقوق ہیں ۔ میں ان حقوق کو پائمال نہیں کروں گا۔ میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگاؤں گا۔ میں جھوٹ کی زمین پر عیاری و ریاکاری کے تاج محل نہیں بناؤں گا۔ میں جعلسازی و ملمع کاری سے کام نہیں لوں گا۔ میں کذب و افترا کا ڈھنڈورا نہیں پیٹوں گا۔

میں کوئی لفظوں کا بازی گر نہیں ہوں ۔ اور نہ میرے پاس چرب زبانی کا وافر سرمایہ موجود ہے۔ تماشا پسندی مجھے پسند نہیں ۔ اور نہ تماشا پسند لوگوں کو مداری کی طرح ڈگڈگی بجا کر اپنے گرد اکٹھا کرنا میرا پیشہ ہے۔ اور نہ خوش باش ذہنوں کو بہلانا میرا ہُنر۔

میں سچائی رقم ہوں ۔ میں سچائی رقم کروں گا ۔ سچ گوئی سے کام لوں گا ۔ سچ ہی میرا سہارا ہے ۔ میں اپنی سچائی کو قحبہ بنا کر سر بازار تمہارے ہجوم میں اُس معزز روح کو تذلیل نہیں کرونگا جو اُس کے جسم میں ہے۔

اور دیکھو ــــ!

اگر یہ غلط ہوا ۔ جھوٹ ہوا ۔ تو میں آج بھی تمہارے ہر گروہ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتا ہوں اور کل بھی سمجھوں گا۔

جھوٹ ایک ایسا پودہ ہے جس کی جڑیں نہیں ہوتیں ۔ جھوٹ کو زیادہ دیر چھپایا نہیں جا سکتا ۔ اور نہ نفسیاتی الجھنیں اور وسوسے چھپانے سے کبھی چھپے ہیں ۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسے نفسیاتی لمحے بھی آجاتے ہیں جب نادانستگی میں اس کی زبان کا بھٹکا ہوا ایک لفظ نہ صرف اُس کے سارے ماضی بلکہ اُس کے حال و مستقبل کو بھی ننگا کر دیا کرتا ہے۔

تم نہیں سمجھتے مگر میں خوب سمجھتا ہوں تیز کلام مقرر تم سے کتنا جھوٹ بولتے رہے ہیں ۔ اگر تم یہ جان لو تو تمہیں یقیناً نطق و کلام سے نفرت ہو جائے۔

جاگتے شہر میں سوتے جاگتے لوگو ــــ!

تم اگر مجھ کو میری آواز سے میری شکل سے نہیں پہچانتے تو مجھے میرے سبز و سفید پرچم

ہی سے پہچانو۔ سبز رنگ تمہاری شادابی کی دلیل اور سفید رنگ تمہارے تحفظ دامن کی علامت اور میرا چاند تمہاری عظمت کا نشاں ہے۔ لیکن یہ وہ چاند نہیں جسے آج کا انسان اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔

جاگتے شہر میں نیند کے ماتے لوگو ——— !

تم جاگتے شہر کی آواز سن رہے ہو۔ جو بیدار جاوید ہے۔ زندہ جاوید ہے۔ اُسے آواز دو۔ وہ تم کو پکار رہا ہے۔ تم اُس کو پکارو۔ تاکہ اُسے یقین ہو جائے تم زندہ لاشیں نہیں ہو جیتے جاگتے لوگ ہو۔

جاگتا شہر تم سے مخاطب ہے۔ تم سے خطاب کر رہا ہے۔ تم سے ہمکلام ہے۔ اُس سے کلام کرو۔ یہ بھی نہیں تو چند لمحوں کے لئے اُسے اپنے کان ہی مستعار دے دو۔

میرے دل میں ایک چنگاری سلگ اٹھی ہے۔ سوچتا ہوں اس چنگاری کو شعلہ بننے دوں یا اُسے بجھا دوں۔ محبت آگ بھی ہے پانی بھی۔ محبت انتقام بھی ہے قربانی بھی۔ اور میں تمہارے معاملے میں منتقم نہیں بن سکتا۔ میں تمہارے لئے بڑی سے بڑی قربانی دوں گا اور تمہیں اپنے عمل کی صداقت سے اس پر آمادہ کر دوں گا کہ تم میرے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہ کرو۔

اس سے پہلے کہ تم ٹکڑے ٹکڑے ہو کے اس اندھیرے میں بکھر جاؤ میں روشنی کر کے رہوں گا۔ میں اس چنگاری کو اپنی سانسوں سے شعلہ بنا دوں گا۔ وقت آئے گا دیکھ لینا اسی شعلے سے ہزاروں آفتاب اٹھیں گے۔ میں تمہیں آسیب زدہ اندھیرے میں بکھرنے نہیں دونگا۔

تم سب میری اولاد ہو۔ میں تمہاری مادر وطن ہوں۔ تم سب میرے بچے ہو۔ میں تمہارا جسم بھی ہوں۔ روح بھی ہوں پرچھائیں بھی۔ میری تشکیل میں تمہارا ہاتھ تھا۔ تمہاری تشکیل میں میرا ہاتھ ہے۔ میری تعمیر کی ہر اینٹ پر تمہارا نام لکھا ہے۔ اور تمہاری تعمیر کی ہر اینٹ پر میرا نام کندہ ہے۔ نہ تم کسی اور سے منسوب ہو سکتے ہو اور نہ میں کسی اور سے منسوب ہو سکتا ہوں تمہاری تفہیم کے لئے میں ایک اہم اشاریہ ہوں اور میری تفہیم کے لئے تم ایک اشاریہ ہو۔ تم سب میرے جسم کی اکائیاں ہو۔ میرے خلیے ہو۔ میرے جزو ہو۔ تم میرے مالی کیولز Molecules

ہو۔ میرے چھوٹے چھوٹے ایٹمی ذرات۔ ایٹمی اجزاء، اور ہر ایٹم کے اندر اس کا ایک پورا نظام شمسی ہوتا ہے۔ اس کا اپنا ایک وسیع دائرہ عمل۔ تم بھی اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرو۔ اپنے پورے نظام شمسی کو بیدار کرو۔

ہمارے بنیادی حقوق کے تصور میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ دوسرے لوگوں کے لئے ان کے حقوق کی تاریخ یو۔این۔او کے چارٹر سے شروع ہوتی ہوگی یا انگلستان کے میگنا کارٹا (Magna charta) سے، ہمارے لئے اس تصور کا آغاز بہت پہلے سے ہے۔

زندگی کے مادی تصور Materealistic Concept of Life کے بارے میں بھی ہمارا کوئی اختلاف نہیں اور ہماری ابتداء بھی توحید کے ایک ہی بنیادی ذرّے (First crystal سے ہوئی ہے جسے تدریجی عمل ارتقا۔ Progressive Evolution اور اس کی چند کڑیوں کو پھاند کر آگے نکلنے والے انقلابی عمل ارتقا Emergent Evolution نے پروان چڑھایا ہے۔

ہماری مذہبی، فکری و نظری سمتوں میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے۔ غیر انسانی طرز عمل اور بہیمانہ رویہ میرے نزدیک بھی نادرست ہے اور تمہارے نزدیک بھی۔ اسلامی شعائر سے روگردانی کا نتیجہ ذلت اور اسلامی شعائر کی بجاآوری کا ثمر عزت و عظمت ہے۔ ہم دونوں مانتے ہیں۔ تم میرے پاسبان ہو۔ میں تمہارا پاسبان ہوں۔ تمہارا دشمن میرا دشمن اور میرا دشمن تمہارا دشمن ہے۔ میرے پاؤں میں اگر کانٹا چبھ جائے تو اس کی چبھن تم بھی محسوس کرو گے۔ اور تمہیں اگر کہیں چوٹ لگ جائے تو اس کے درد کی ٹیسیں مجھے بھی سونے نہ دیں گی۔ تکلیف جسم کے چاہے کسی حصے میں ہو رہی ہو سارا جسم اُس کو محسوس کرتا ہے۔

میں اس لئے عالم وجود میں آیا تھا کہ تم مشترکہ وطنیت کے قائل نہ تھے۔ تمہیں اپنا الگ ایک وطن چاہیئے تھا۔ اپنا ایک الگ تھلگ گھر۔ جس کی جغرافیائی حدود میں

تم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنی ترقی و تعمیر کے لیئے اطمینان سے کام کر سکو۔ اپنے مسائل کو باہمی طور پر حل کر سکو۔ جہاں کوئی مخالف قوت تمہارے مقاصد کا سبوتاژ نہ کر سکے۔

تم پھلو پھولو پروان چڑھو۔ اپنے ملک اور آزادی کی حفاظت کرو۔ اپنی کمزوریوں کا جائزہ لو اور طاقتور بن جاؤ۔ اپنے اعمال کا محاسبہ کرو اور ایک صالح معاشرہ پیدا کرو۔ اقوام عالم میں تمہیں عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جائے۔ اپنی مذہبی و تہذیبی روایات کے مطابق زندگی بسر کرو۔ تم کو کسی دوسری قوم کے دباؤ کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی قوم تم پر ناجائز دباؤ ڈالنے کے لئے تمہاری سرحدوں پر سے جھانکے تو تم اُس سے اچھی طرح نپٹ سکو۔

میں اسی مقصد کے لئے بنا تھا اور بنایا گیا تھا۔ اور مجھے بنانے کا بھی یہی مقصد تھا۔ تم میرے ساتھ چلے تھے۔ اب میرے ساتھ رہو۔ میں جاگ رہا ہوں۔ تم سو رہے ہو۔ میں کہتا ہوں تیز چلو۔ تم رک رک کے چلتے ہو۔ قدم قدم پر ڈگمگا رہے ہو۔ اور بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ تمہاری یہ غفلت Lethargy پیر تسمہ پا کی طرح تم پر سوار ہے۔ رہ رہ کر تمہیں گرا رہی ہے۔ میں تمہیں اٹھانے کو رک رک جاتا ہوں۔ اور تم ہو کہ مجھے رک جانے کا الزام دے کر آبلہ پا کہتے ہو۔ میرا تمسخر اڑانے کے لیے تمہارے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا ہے۔ جب کہ تمہاری طرح تمہارے اس مجلسی تبسم کو بھی میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔ یہ تمہارے دل کی تنہائیوں کا ترجمان نہیں۔

میں خود تنقیدی کا قائل ہوں۔ تم تنقید سے گھبراتے ہو۔ تنقید و تبصرہ اگر تعمیری ہو تو کوئی بری بات نہیں۔ میں تم سے کہتا ہوں د Anti Intelect باتیں نہ کرو اور تم اس کے ردعمل میں اور زیادہ یاوہ گوئی پر اتر آتے ہو۔ میں کہتا ہوں آؤ مشرق میں چلیں اور تم کہتے ہو اڑن کھٹولے میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کریں گے۔ میں کہتا ہوں دن ہے۔ اجالا ہے۔ تم کہتے ہو رات ہے۔ اندھیرا ہے۔

تمہارے دل کی اس درماندگی و بے سمتی کے کیا معنی ہیں۔ اپنے کسی مبصر سے کہو اس منطق کو مجھے سمجھانے کے لئے اپنا کوئی بھرپور فلسفہ لائے۔ ٹھوس حقائق کی دنیا

ہیں تم حکایتیں لے بیٹھو۔ حقائق پسندی سے نظریں چراتے ہو۔ مگر تمہاری یہ حکایتیں اب حقیقتوں کی دنیا میں نہیں چلیں گی۔

میں کہتا ہوں تیز قدم اٹھاؤ۔ آگے بڑھو۔ تم رک رک جاتے ہو اور آگے کی بجائے پیچھے چلنے لگتے ہو۔ لیکن وقت کے راستوں پر کوئی سڑکیں نہیں بنی ہوتیں کہ تم جہاں سے چاہو اپنا سفر دوبارہ شروع کر دو۔ اے میری بستی کے لوگو وقت کا سب سے بڑا ظلم تو یہی ہے کہ تم اپنے ماضی کو مڑ کر دیکھ سکتے ہو۔ اس میں زندہ رہ سکتے ہو۔ لیکن لوٹ کر اس نکتے کی طرف نہیں جا سکتے جہاں سے تم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس لمحہ آغاز کو بیتے آج اٹھائیس سال گزر چکے ہیں۔ جنہیں اٹھائیس صدیاں بھی کہا جا سکتا ہے۔ جیسے تم الٹنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر یہ اٹھائیس کا عدد بھی الٹ گیا تو بیاسی سال ہو جائیں گے اور تمہارا یہ جمود و تعطل گلیشئر بن کر، برفانی تودے بن کر تمہیں ڈھانپ لے گا پھر تم برفانی انسان بن جاؤ گے۔ یا برفانی تابوتوں میں لپٹی ہوئی حنوط ممیاں۔ اور پھر ؎

کون جانے کہ یہ آوارہ کرن بھی چھپ جائے
کون جانے کہ اُدھر دھند کا بادل نہ چھٹے
کس کو معلوم کہ پائل کی صدا بھی کھو جائے
کس کو معلوم کہ یہ رات بھی کاٹے نہ کٹے

ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہم ہی نہیں رہتے دوسرے بھی رہتے ہیں۔ جہاں اقوام عالم اس وقت موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ کمزور و پسماندہ قوموں کو طاقتور اور ترقی یافتہ قومیں یا تو نگل چکی ہیں یا نگلنے کی سازش کر رہی ہیں۔ یہ طاؤس و رباب کا دور نہیں شمشیر و سناں کا دور ہے۔ جس میں وہی قومیں زندہ رہیں گی جو تلوار سے کھیلیں گی، اپنے زخموں سے کھیلنے والی قومیں مٹ جائیں گی۔

انقلابات و تبدلات کے نئے افق سے نیا آفتاب نکلا ہے۔ نیا سویرا۔ جس کی زبان میں بیداری ایک عظیم انقلاب کا نام ہے۔ وہ ساعت دیدار جس کا مدت سے انتظار تھا دروازے پہ دستک دے رہی ہے۔ وہ خواب جس کے شرمندہ تعبیر ہونے کی کوئی امید نہ

نہ بھی حقیقت کے ایک تاج محل میں ڈھل گیا ہے - اِس سے پہلے جو کچھ ناممکنات میں تھا اب ممکنات میں سے ہے اور تاحد ممکنات اُجالا ہی اُجالا ہے - ہر ایک عہد کی آنکھوں میں اس کے خواب رہے ہیں -

اجالے کا یہ تقاضا ہے کہ میں اُن سیاسی سازشوں اور بھیانک جرائم کا پوسٹ مارٹم کر دوں جو تمہاری جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں - اجالے کا یہ تقاضا ہے کہ تم سیاسیات عالم کی بساط پر ایک پٹا ہوا مہرہ بننے سے بچنے کے لئے جدید تکنیکی و میکانیکی انداز و اسالیب اختیار کرو -

اجالے کا تقاضا ہے کہ اجالوں کے جاگتے شہر میں رہتے ہوئے تم سوچوں کی افیون بھنگ پی کر اونگھنے کی بجائے اندھیرے کی ان داستانوں کو دیکھو جو چنگیز و ہلاکو، ہنی بال وا یٹیلا کی داستانوں کی صورت میں تاریخ کے صفحات پر آگ اور خون کے حروف سے لکھی ہوئی ہیں - جبکہ لاشوں کے انبار اور مسمار بستیوں کے کھنڈرات ان داستانوں کے ہیبت ناک عنوانات ہیں - یہ وحشت و بربریت کے اُس دور کی داستانیں ہیں جبکہ انسان نے یہ سیکھا نہ تھا کہ اپنی وحشت و بربریت کے خونخوار چنگل کس طرح خداع و فریب کے مخملیں پردوں میں چھپائے -

جبکہ وہ یہ جانتا نہیں تھا کہ اپنی خون آشامیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح دکھاوے کی صلح و آشتی، مصنوعی انسان دوستی اور جھوٹے امن و امان کے پر فریب اور دل کش و دلفریب نقابوں اور حجابوں میں چھپا لے -

جبکہ اُس نے اپنے ضمیر کے کینسروں اور روح کے ناسوروں کے گھناؤنے تعفن کو ماسک د ر کرنے کے فارمولے نہ سیکھے تھے - جب اُس کی زہر میں بجھی ہوئی ننگی تلواروں کو سیاست و فراست کی سکینڈل سازیوں کے سرابوں میں چھپانا نہ آتا تھا -

لیکن جب انسان کی سیاست و فراست نے اپنی پرانی کینچلی اتار دی - تو اس کی عقل و حکمت اور دانش و بینش برگساں کے انسان کامل The Complete Man کے کائناتی ذہن کی طرح زماں و مکاں کی سیڑھیاں پھاندنے لگی - جب اس کی بربریت و

بہمیت پتھر اور دھات کے زمانے کی گپھاؤں کے اندھیرے سے نکل کر معاشرتی ارتقا کے اجالوں میں اتر آئی۔ تو اس نے اپنی برہنہ و عریاں ہوس خون آشامی اور مردم خوری کو حماقت سمجھا اور اس نے محسوس کیا کہ بین الاقوامی ذہن کا فراڈ اور اس کی بین الاقوامیت کا ڈھونگ اب زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔

اس نے محسوس کیا اور نہایت شدت سے محسوس کیا کہ وہ اپنے غیر انسانی طرز عمل اور بہیمانہ رویے سے جو گھاؤ نسل انسانی کے وجود پر لگا رہا ہے اقوام عالم کے آپریشن تھیٹر میں اب نظروں سے اوجھل نہ رہ سکیں گے۔

اس نے سوچا اور مختلف پہلوؤں اور سمتوں سے سوچا کہ اس کی سیاست و حکمت کی کوئی سائی کیک سرجری یعنی نفسی عمل جراحی اور اس کے مکر و فریب کی فارمیسی کی کوئی میجک ڈرگ د Magic Drug ان کو پوشیدہ نہ رکھ سکے گی۔ تو اسے احساس ہوا اور بری طرح احساس ہوا کہ اب تو

رنگ اڑ جائے گا شگوفوں کا

اعتبار صبا کا نام نہ لو

تو اس نے اپنے خبث باطن کو چھپانے اور اپنی خون آشامی کی پردہ پوشی کے لئے ایسے ایسے ہتھیار اور ہتھکنڈے ہتھیا لئے اور اپنے مختلف مہیب چہروں کو چھپانے کے لئے پلاسٹک سرجری اور میک اپ کے کچھ ایسے موثر و مفید فارمولے دریافت کر لئے کہ وہ دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ خون کا دھبہ تک اس کے دامن و آستین پر نظر نہ آئے۔ اس کے ہونٹ اور دانت بالکل خشک رہیں اور ان پر خون کی سرخی کہیں جھلک نہ دے۔

وہ کھلے بندوں جارحیت کرے اور اس کی جارحیت پر عدم جارحیت کا گماں ہو۔ وہ خود ہی نسل کشی Genocide کے انسداد اور سزا دہی کے لئے کوئی عالمی قرارداد، کوئی بین الاقوامی قانون، کوئی عظیم انسانی منشور Menifesto بنائے اور خود ہی اس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے اس پیمانہ پر نسل کشی کرے کہ مذہبی

جنون اور اعتقادی انتقام کے جوش و جذبہ میں ہزاروں انسانوں کا قتل عام کرتے ہوئے۔ دودھ پیتے بچوں کو بھی زندہ نہ چھوڑے۔ اور مجرم نہ گردانا جائے۔ کوئی عالمی عدالت، کوئی بین الاقوامی قانونِ تحفظ انسانیت، کوئی سخت گیر محتسب نہ تو اس کا اختساب کرے اور نہ اُس پر فردِ جرم لگا سکے۔

وہ نہ صرف کسی فرد، کسی جماعت بلکہ پوری قوم، پورے ملک کو امدادی معاہدوں کی آڑ میں اس دوستانہ و مشفقانہ انداز میں لوٹے کہ اس کی رہزنی، ڈکیتی اور قزاقی پر کسی کو شبہ تک نہ ہو۔

دورِ عقل و تدبر کے فسوں ساز انسان کے انتقام و تخریب چالیں فسوں سازی کا ایک ایسا طلسم ہے۔ جس میں اقوام عالم یوں الجھی ہوئی ہیں جیسے مکھی کے جالے میں مکھیاں۔ اس بحر ظلمات کی موجوں میں نہ شور ہے نہ حرکت۔ نہ تلاطم نہ تموج۔ سطح پر سکوت۔ لیکن اس کی پہنائیوں میں اژدر و نہنگ پنہاں۔ ماسٹوڈون اور میگا تھریم قسم کے عظیم الجثہ قلعہ نما جانور پوشیدہ۔ جو ایک قوم، ایک ملک کیا پورا براعظم نگل جائیں لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان کچھ سن سکیں۔

آج کے انسان کی اس پرسکوت و پرفریب شعبدہ بازی اور طرقِ تخریب و تباہی کا نام ہے پروپیگنڈا —— سیاست ——!!

یہ وہ آتش فشاں ہے جس کی آتش خاموش ہے۔ اور نہایت خاموشی سے اندر ہی اندر تمام متاعِ دین و دانش کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ اور اُس کے دہانے سے آگ کی ایک چنگاری اور دھوئیں کا ایک مرغولہ تک نہیں اٹھنے پاتا۔

یہ وہ مقتل خاموش ہے جس میں قتل ہونے والوں کی چیخیں سنائی نہیں دیتیں اور نہ تڑپنے کی صدا آتی ہے یہ وہ مرگھٹ ہے جس میں جلتے ہوئے مردے نظر نہیں آتے کہ اس کے شعلوں میں نظر بندی کا کچھ ایسا ہی جادو ہے۔

یہ وہ خوفناک و منظم سازش ہے کہ جس کے ورغلانے اور بہکانے پر اب تک کئی ملتیں خودکشی کر چکی ہیں۔ درہم و دینار کی منڈی میں کئی مملکتوں کا دیوالہ نکل چکا ہے۔

اور وہ بے بس ہو کر بیع ہونے پر مجبور ہو گئی ہیں۔

اس خوفناک و منظم سازش نے کئی تہذیبوں کو سر بازار ننگا نچایا ہے اور کئی ملکوں کو مع ان کی پوری آبادی کے مصلوب کر دیا ہے۔ اس منظم سازش کا جال کچھ اس طرح بُنا گیا ہے کہ اس میں پھنسنے والے بتدریج بلا شور و شغب غیر محسوس طور پر مسمرائز ہو جاتے ہیں ان کی نظروں کے زاویے بدل جاتے ہیں۔ ان کی بیداری پر عدم بیداری کا گماں ہوتا ہے۔

یہی وہ سحر سامری ہے جس کے اثر سے مسحور ہونے والوں کی آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی نظروں سے ہیں۔ کان اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں۔ دماغ اپنا ہے لیکن سوچ کسی دوسرے کی ہے۔

جاگتے شہر کے سوتے لوگو!

میں وہ صورِ اسرافیل کہاں سے لاؤں جس کی آواز سات کروڑ بنیند کے ماتو کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے تا کہ تم دورِ عقل و تدبّر کے فسوں ساز انسان کی فسوں سازی سے محفوظ رہ سکو!

سنو ـــــ سنو۔ میری آواز میں اس برگزیدہ ہستی کی آواز بھی شامل ہے۔

جس نے منزل کو رہگذر رکھا
تازہ دم جذبۂ سفر رکھا
جس کے اک جلوۂ تبسّم نے
زندگی کو سحر سحر رکھا

جس پر ایک مردہ قوم کو جلانے کے لئے قوت و حیات کے صحیفے اور شہ پارے نازل ہوئے۔

جس کے قلم سے ۸ کروڑ غلاموں کی آزادی کا آفتاب اٹھا۔ اور جو اُن کے لئے چراغِ حرف حکایات لے کر آیا۔ جس نے اُن کو تلاش ذات اور شعور ذات کی راہ دکھائی۔ اور اُن دھندلائے ہوئے زنگ آلود ذہنوں کو جلا دی۔

جس کے چہرے کی ہر شکن اور جس کے سر کا ہر بال قوم کے دکھ درد کی اک کہانی تھی۔ جس نے قوم کے دکھ اوڑھ رکھے تھے۔ جو پلکوں پر زخموں کے نگینے سجا کر قوم کے آنسو رو رہا تھا۔ جس کے اندازِ بیاں میں قوم کے درد و کرب کی پرچھائیاں تھیں۔

جس کا ہر فعل ہر فکر اُس کی نفسی حقیقت کا اظہار تھا۔ اور وہ حقیقت کیا تھی۔ قوم آزاد ہو جائے۔ قوم کا اپنا ایک اسلامی وطن ہو۔ جس میں وہ اسلام اور اسلامی شعائر کی پیروی کرتے ہوئے اپنا کھویا ہوا مقامِ بلند پھر حاصل کرے۔ پھلے پھولے۔ ترقی کرے اور اپنی ذات میں اتنی مضبوط ہو جائے کہ کسی مخالف و متحارب قوم کے ہاتھوں اپنے مقاصد کا سبوتاژ نہ ہونے دے۔ ہر اُس آنکھ کو نوچ لے جو اُس کے وطنِ عزیز کو جارحیت و توسیع پسندانہ عزائم کی نظر سے دیکھے۔ ہر اُس ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دے جو اُس کی آزادی کی متاعِ عزیز کی طرف اٹھے۔ اور ہر اُس پاؤں کو مفلوج کر دے جو اُس کی سرحدوں کی سمت بڑھے۔ جس نے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کو انسانی اشتراکِ عمل کا سبق دیا۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

اسلام ـــ اخوت ـــ اتحاد ـــ تنظیم ـــ تنظیمِ معاشرہ ـــ تنظیمِ ذات ـــ تنظیمِ خود۔ یہی اُس کے فکر و تدبر کی نہج تھی۔

میری آواز میں اُس کی آواز ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اُس کے خطبات و فرمودات ہمیشہ چاند ستاروں کی طرح روشن رہیں گے۔ اُس کا ایک ایک لفظ میرے لئے۔ تمہارے لئے۔ ہم سب کے لئے کوہِ نور سے زیادہ قیمتی ہے۔

کلام الملوک ملوک الکلام۔ کلام الامام امام الکلام ـــ!

امام العصر۔ شیخ الاسلام۔ شیخ المجاہدین۔ جلیل القدر فرزندِ توحید۔ محبوب الاسلام

والمسلمین - بطل حریت - ضیغم ملت - بابائے قوم - میرا قائداعظم - تمہارا قائداعظم ہم سب کا قائداعظم -

میرا بانی - میرا معمار عظیم - میرا طراحؔ -!!

میں ایک خواب تھا - اُس نے مجھے حقیقت کے تاج محل میں ڈھالا - میں ایک پھول تھا اُس نے مجھے خوشبو عطا کی - میں ایک چاند تھا اُس نے مجھے چاندنی دی - میں حقیقت تھا اُس نے اپنے عزم سے مجھے زندہ کر دیا - میری ہر اینٹ پر اُس کی شخصیت کی چھاپ لگی ہے - اُس کے میزان میں تلے ہوئے افکار میری تقدیر کی لکیریں ہیں - تمہاری تقدیر کی لکیریں ہیں - وہ میرا ہی نہیں تمہارا بھی ہے -

تمہارا قائداعظم - تمہارا رہبر - تمہارا خضر راہ - تمہارا لیڈر - وہ جا چکا ہے - لیکن اُس کی ذات کی پرچھائیاں ہم میں ابھی تک موجود ہیں - وہ ہمیشہ زندہ رہے گا - قرارداد پاکستان میں - پاکستان میں - تمام پاکستانیوں میں -

اس کے فکر و فن کے شاہکار محض نقش گری کی مہارت نہیں بلکہ حقائق کے واضح شعور اور اُن پر اُس کے فکر و فن کی کامل گرفت کی علامت ہے - داخلی کیفیات کو اُس نے صرف محسوس ہی نہ کیا بلکہ کھلی آنکھوں سے اُن مشاہدہ بھی کیا -

برصغیر کے ائمہ فکر میں وہ پہلا مدبر و مفکر ہے - سیاست کے صرافہ کا وہ پہلا سنار ہے جس نے تم ایسے کم عیار کھوٹے سکوں کو اپنے لمس سے درہم و دینار بنا دیا - جس نے تمہاری جہد و بقا کی سیاسی تحریک کو انتہائی ندرت و رفعت اور شدت احساس کے ساتھ فکر و خیال اور جوش و جذبہ کے انقلاب سے آشنا کیا -

تمہاری سیاست میں آفاقیت کا نیا افق اُسی کے تدبر و فراست سے پیدا ہوا - وہ زندگی کی عظمتوں اور رفعتوں کا علمبردار تھا - اور زندگی کے پیچیدہ مسائل اور ان سے متعلقہ حقائق و معارف کا تجزیہ اور ان کی تفسیر بھی -

وہ دنیائے سیاسیات کا ایک ایسا سیاح ایک ایسا کولمبس تھا جس نے ہر طلوع کے ساتھ اپنے اندر ایک نیا براعظم دریافت کیا -

وہ بحرِ سیاسیات کا ایک ایسا ملاح ایک ایسا ناخدا تھا جو قوم کی گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی کو نکال کر ساحلِ مراد تک لے گیا - جبکہ کشتی ٹوٹی ہوئی تھی -

اس کے پیندے میں سوراخ تھے - اُس کے چپو اور پتوار ٹوٹے ہوئے تھے - بادبان سب پھٹ چکے تھے تیز و تند مخالف ہوائیں چل رہی تھیں - اور ساحل بڑی دور تھا -

اُس نے تمہیں زندگی کو دیکھنے پرکھنے اور برتنے کا ایک منفرد زاویہ نگاہ دیا -

اُس رہبرِ اعظم کی اہمیت و شخصیت کا حدود اربعہ بیان کرنا بڑا مشکل ہے - بحرِ بیکراں کی حد بندی اور اُس کی اتھاہ گہرائیوں کی پیمائش نہیں ہو سکتی - اور نہ آسمان کی بلندیوں کے کناروں کو چھوا جا سکتا -

وہ رہبرِ اعظم تمہاری فکری و تہذیبی تونگری کا مظہر تھا - وہ کتنا عظیم تھا پاکستان اُس کی عظمت کی ایک عظیم دستاویز ہی تو ہے -

اُس کی بصیرت اور نقش گری نے برصغیر کے مسلمانوں میں سیاسی سوجھ بوجھ پیدا کرنے اور اُن کی فکری و نظری سمتوں کا تعین کرنے میں ایک عہد آفریں و عہد ساز کردار انجام دیا -

وہ اپنی قوم کی مخصوص تاریخی، ذہنی، تہذیبی و ثقافتی روایات کا پارکھ، محسوسات کا ترجمان اور زندہ رہنے کی جدوجہد میں ان کے زندہ رہنے کے امکانات کا مبشر تھا -

پاکستان کی تشکیل و تعمیر، اس کی سیاسی کش مکش اور دستوری جدوجہد میں اس کا تخلیقی عمل افتراشِ جمال، قوت و حیات اور پردہ کشائی راز کا عمل ہے - وہ اپنے دور سے الگ بھی تھا - آگے بھی تھا - اُس سے بلند بھی تھا -

وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے ایک چٹان کی طرح اپنے موقف پر ڈٹا مخالفت کی کالی اور سرخ آندھیوں کی یورش میں تقریریں کرتے ہوئے حوادثات کے تھپیڑوں پر قوم کی تقدیر رقم کرتا رہا -

اُس کی فہم و فراست اور افکار و اقدار کو قوم کی فکری و تہذیبی شخصیت و حیثیت

کا نشان اور معیار کہا جا سکتا ہے۔

اُس کی موت، اُس کی زندگی اور اُس کی زندگی کے مبادیات ہمارا قابل فخر وتہذیبی ورثہ ہیں۔ اُس کی شخصیت کا مطالعہ ایک مردہ قوم کے احیاء موتہ کا مطالعہ ہے۔ سیاسی، معاشی اور جغرافیائی ماحول کی ناموافقت کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی ایک چیونٹی سی قوم کے پہاڑ بن جانے کے ارتقا کا مطالعہ ہے۔ اُس کی ذات کا مطالعہ نطشے کے مافوق الانسان Super Man برگساں کے ارتقائے تخلیقی اور ساس بیکراں کائنات کی وسعتوں کا مطالعہ ہے۔

اُس کی شخصیت نگاری اتنی پیچیدہ در پیچیدہ اور مشکل سے مشکل ترین ہے کہ ایک چابکدست شخصیت نگار بھی اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرے گا کہ اُس کے پاس نہ ایسا کوئی قلم ہے نہ روشنائی۔ نہ رنگ اور نہ کینوس۔ جس سے وہ اس کی شخصیت کو اُس کی شخصیت کے فریم میں پینٹ کر سکے۔ تمہارے رنگ رس کو۔ تمہاری دھوپ چھاؤں کو۔ تمہارے منظر و پس منظر کو۔ تمہارے ہر نشیب و فراز کو اگر اُس کی بصیرت نگاہ اور آواز میسر نہ آتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ فکری گہرائی و گیرائی کے اعتبار سے تمہاری سیاسی زندگی اور آزادی کی جدوجہد نہ جانے کب تک تقریباً اندھی، بہری اور گونگی پڑی رہتی۔

ہیں اور تم اُس سے حوالے کے بغیر اپنے آپ کو دریافت نہیں کر سکتے۔ اور نہ صحیح معنوں میں اپنے قریب آ سکتے ہیں۔ اس کے قدموں کے نشاں زندگی کے گہرے اور وسیع شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔

میری تشکیل و تعمیر اور تمہاری آزادی کے آفتاب کی بھرپور روشنی برصغیر میں اُس کی فہم و فراست ہی سے طلوع ہوئی۔

وہ اس عہد کا، اِس زمانے کا بھی مدبر و مفکر ہے اور اُس زمانے کا بھی جو ابھی طلوع نہیں ہوا۔ وہ پاکستان کا ایک ایسا پدم پتی سرمایہ دار ہے۔ سرمایہ کار ہے۔ بلکہ وہ پاکستان کا ایک ایسا عظیم بنک ہے کہ پاکستان اور پاکستانیوں کی ملکی و ملی زندگی کا سارا کاروبار اُسی کے دیئے ہوئے قرض سے چل رہا ہے۔

وہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیائے اسلام میں ایک عظیم انقلاب کا بانی ہے۔ وہ پاکستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب کا نام ہے۔ ہر ایک عہد کی آنکھوں میں اُس کے خواب رہے ہیں۔

وہ پھول بن کر میرے سینے میں مہک رہا ہے۔ میری آنکھوں میں اُس کے رنگوں کی دھنک کھلی ہوئی ہے۔

جاگتے شہر میں سوتے لوگو ——!

تم مجھ سے اتنا گریزپا کیوں ہو۔ کچھ کان لپیٹ کر نیند میں بھاگے جا رہے ہو۔ کچھ نیند میں پڑے اونگھ رہے ہو۔ سنو ۔

اب میں نہیں وہ بطل حریت تم سے مخاطب ہے۔

ساحل، سیپ، سمندر

اُس نے کہا

ہیرا کوئلے میں امتدادِ زمانہ کا ایک ظہور ہے ۔ موتی سیپ میں سمندر کا ایک نظارہ ہے ؎

آنکھ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

میری زندگی کے ساحل پر سیپ بھی ہیں اور موتی بھی۔ ان سے اپنی نئی زندگی کے لئے ایک عالیشان تاج محل بنالو۔ ورنہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ترتیب وقت میں کوئی ایسا وقت بھی نکل آئے کہ تم اس ساحل پر کچھ بنانا چاہو مگر نہ بناسکو۔ تمہاری نئی زندگی تمہاری پرانی بوسیدہ زندگی کی صدائے بازگشت بن کر رہ جائے۔

ہر وہ فکر جسے تم نے اپنے کلام کے ذریعے ظاہر ہونے سے روکا ہے۔ ضروری ہے کہ اپنے عمل سے اُسے ظاہر کرو۔ اور عمل کا یہ تقاضا ہے کہ تم سب اپنے اپنے کام میں لگ جاؤ۔ سیپ، موتی، ساحل اور سمندر تمہارے سامنے موجود ہے۔ بناؤ نا اپنے خوابوں کے تاج محل کو اپنے پورے یقین کے ساتھ۔ تم چاہے جہاں سے زمین کھودلو۔ خزانہ تمہیں ضرور ملے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ زمین کو کامیابی کے یقین کے ساتھ کھودو۔ اور یاد رکھو۔ اپنے سروں پر چمگادڑوں کی طرح منڈلاتے اندھیروں کی سرگوشیاں نہ سنو۔ جو تمہیں بہکانے کے لئے کہتے ہیں۔

"ہمیں نہ چھوڑو۔ ہم ہیں تمہارا ماضی آباد ہے۔!"

ساحل کی سنو۔ وہ کہتا ہے۔

میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میں تمہارا مستقبل ہوں۔!

ایک ایسا مستقبل جس کی ماہئیت و نوعیت جب تم اِسے سمجھنے کی کوشش کروگے خود بخود تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ اور بہت کچھ تمہیں یہ سمندر سمجھائے گا اور تمہاری زبان میں تم سے بات کرے گا۔

یہ میں ہوں — یہ سمندر نہیں جو سانس لے رہا ہے۔ یہ میں ہوں — اس کی سانس میری سانس ہے۔ یہ میں ہوں — اور اس میں اٹھتا ہوا مدوجزر — جوار بھاٹا — لہروں کا انقلاب۔ یہ بھی میں ہوں۔ ایک شئے اپنی شئیت کی وجہ سے ایک شئے ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک شئے ایک شئے نہیں بھی ہوتی۔ وہ بہت کچھ ہوتی ہے۔ اس میں کوئی دوسری شئے بھی ہوتی ہے۔ اور اُس کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ مگر ان کی معنویت دیکھنے والے کی استعداد میں مخفی ہوتی ہے۔ سیبر بین کو آنکھوں سے لگا کر دیکھو۔ ہوتی تو اُس میں کانچ کی رنگارنگ کرچیاں ہیں جو سیبر بین کی ہر جنبش کے ساتھ کبھی پھول بن جاتی ہیں۔ کبھی ستارے۔ کبھی جگنو۔ یعنی جو چیز ناممکن ہوتی ہے ممکن ہو جاتی ہے۔ ورنہ کہاں کانچ کی کرچیاں کہاں پھول۔ ستارے اور جگنو — سیبر بین میں یہ سب کانچ کی کرچیوں کی طلسم کاری ہے۔ اور میں پانی کے چھوٹے چھوٹے ان گنت قطروں کا طلسم ہوں۔ دوسرے لفظوں میں سمندر چھوٹے چھوٹے ان گنت قطروں کے اجتماع کا نام ہے۔ چھوٹے چھوٹے قطرے تنظیم و ترتیب کے ساتھ جب منظم ہو جاتے ہیں۔ مجتمع ہو جاتے ہیں تو ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن جاتے ہیں۔ اور اسی نکتے کو سمجھانے کے لئے اتنی تشبیہوں اور استعاروں کا سہارا لے کر تمہارے مقصد کی ایک بات تمہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اُس نے کہا۔

اجتماع کے معنی ہیں مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا۔ اور ائتلاف کے معنی ہیں مختلف چیزوں کا اس تناسب و ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیئے وہی جگہ اُس کو ملے۔ جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے۔ جس کو آخری جگہ

ملنی چاہیئے وہ آخری جگہ پائے - اور عید، اجتماع و ائتلاف سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، کسی ایک مرکز، ایک سلسلے ایک وجود، ایک طاقت اور ایک فرد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں- اور تمام قومی اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے - جس میں بندھی اور سمٹی ہوئی ہر چیز زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتی ہے. کسی چیز کے کسی گوشے میں کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی - الگ الگ جدا جدا ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی - مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے تخلیق و تکوین اور وجود ہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں - اس کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں تخلیق و تسویہ کہا ہے -

اشتات و انتشار ائتلاف و اجتماع کی ضد ہے - جس کے معنی تفریق اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں - یہ حالت مادیات پر طاری ہوتی ہے تو تکوین کی جگہ تب اہی اور وجود کی جگہ اس پر عدم وجود کا اطلاق ہوتا ہے - اور جب یہ حالت جسم پر طاری ہوتی ہے تو اس کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں سوء عمل سے تعبیر کرتا ہے -

اور پھر یہی چیز جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر مسلط ہوتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ ان کی ترقی تنزل میں، عظمت ذلت میں، آزادی غلامی میں اور حکومت محکومیت میں بدل جایا کرتی ہے -

یہی وجہ ہے قرآن حکیم نے اجتماع و اتحاد کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اللہ کی جانب سے انسانوں کے لئے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے - اور فرمایا کہ تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو -

یہ صرف حکم ہی نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے - اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ انتشار کی زندگی کو بقا و قیام حاصل نہیں ہو سکتا - یہ وہ آگ ہے جس کے بھڑکتے شعلے قومی زندگی کی نشو و نما کو جلا کر خاکستر کا ڈھیر بنا دیتے ہیں - اسی لئے شارع اسلام

نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا اور جماعت سے علیحدگی کو جہالت سے تعبیر کیا۔ اسی بنا پر ہر مسلمان کو ہر حالت میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا۔ ایک صالح جماعت تباہ نہیں ہو سکتی۔ اس پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ قرآن کے نزدیک فرد کوئی شئے نہیں۔ ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور افراد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لئے ہیں کہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو۔ نماز کی جماعت، جمعہ و عیدین کی نماز اور حج بجز اجتماع و اتحاد کے اور کچھ نہیں۔

مسلمانوں کی متحدہ قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضاء۔ ایک عضو میں اگر تکلیف ہو تو سارا جسم اس سے متاثر ہوتا ہے۔ فرمایا جس طرح ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں جڑی ہوئی ہیں آپس میں جڑے رہو۔ قومی ترقی و فلاح کے لئے جماعت کی تشکیل میں پانچ مراتب ضروری ہیں۔ اجتماع۔ ائتلاف۔ اتحاد۔ امتزاج۔ انتظام۔ یہ پانچ جوہر قومی تنظیم کے لئے ضروری ہیں۔ جس قوم نے یہ پانچ مراتب طے کر لئے اس نے عروج و ارتقا اور فلاح و کامرانی کی سب منزلیں طے کر لیں۔ جماعت سے مراد افراد کا ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد ہو اور اتحاد سے مقصود یہ ہے کہ افراد اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ جماعت ایک مرکب وجود ہے۔ افراد اس کے عناصر ہیں۔ کائنات کے ہر حصہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنت ایک خاص نظام پر کارفرما ہے۔ جس کو قانون مرکز یا مرکزیت قومیہ کہتے ہیں۔ کوئی ایک وجود مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور باقی اجسام ایک دائرے کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں۔ اور پورے دائرے کی زندگی اور بقا صرف اس مرکزی وجود کی زندگی و بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر یہ اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے دائرہ قاب قوسین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نظام شمسی کے طلسم ہی کو لیجیے۔ ہر ستارہ اپنے ایک محور و مرکز پر گردش کر رہا ہے۔ اور عالم نباتات میں بھی یہی قانون جذب و کشش کارفرما ہے۔ شاخیں، پھول، پھل ایک

ہی وجود یعنی پودے سے وابستہ ہیں۔ ہر پودا اپنی شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں کے لئے مرکز کی حیثیت واہمیت رکھتا ہے۔ ہر پتہ اور شاخ اپنے مرکز سے جدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔

اور یہی نظم وضبط جسم انسانی میں دیکھنے میں آتا ہے۔ جسم انسانی کے اعضا وجوارح کے کارخانۂ حیات میں دل اشرف الاعضا ہے۔ اور ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ دل ہی تو ہے جو جسم کے ایک ایک خلیہ کو خون پہنچاتا ہے۔ اسی طرح یقینیات واعتقادات میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو ٹھہرایا ہے۔ جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے۔ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کا کوئی مرکز نہ ہو۔ کوئی تعلیم باقی نہیں رہ سکتی۔ جب تک اس کی ایک قائم وجاری جامعہ نہ ہو۔

قرآن حکیم کہتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اور قوت حاکمہ خدا کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے سوا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ سوائے خدا کی ذات کے اقتدار اعلیٰ اور قوت حاکمہ کا دعویٰ کرے۔ حکومت خدا کی ہے اور خدا ہی سب سے بڑا حاکم ہے۔ وہی اولاالامر ہے۔ ہر چیز پر اس کی حکمرانی ہے۔ جو زمین پر اپنی شہنشاہی وجہانبانی کا دعویٰ کرتے ہیں فنا ہو جانے والے ہیں۔

مسلمانو اٹھو! ہمارا ایمان ہے کہ حکومت خدا کی ہے۔ شہنشاہی خدا کی ہے۔ پھر وہ بنیا ہو یا برطانیہ کا سرخ فام انگریز۔ ہم اس کے غلام کیوں رہیں۔ ہمیں آزاد ہو کر اپنا ایک الگ وطن بنانا چاہیئے۔ اور وہ وطن ہمارا پاکستان ہو گا جو ہماری مذہبی، تہذیبی ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کا گہوارہ ہو گا۔ پاکستان کا مطلب ہے۔ لا الہ الا اللہ، ہمیں اس کے حصول کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہو جانا چاہیئے۔ اقوام عالم میں زندگی وموت کی رسہ کشی میں ہمیں زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمارا وطن ہی ہمارا مرکز ہو گا۔ اور ہم اس مرکز سے وابستہ رہتے ہوئے حزب اللہ یعنی اللہ کی جماعت کہلا سکیں گے۔

اس بطل حریت نے یہی کہا تھا۔

تمہیں پاکستان کی اسلامی حیثیت کو ختم نہیں کرنا ہمیشہ برقرار رکھنا ہے۔ تمہیں پیچھے نہیں آگے بڑھنا ہے۔ سونا نہیں بیدار رہنا ہے۔ زندہ قومیں ہمیشہ بیدار رہا کرتی۔

لیکن تم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جو اُس کے مخالف تھے۔ انہوں نے اُس کی بھرپور مخالفت کی۔ لہجے کی پوری شدت کے ساتھ اختلاف کا اظہار کیا۔ لہجے کے پورے زہریلے پن کے ساتھ اُس کی پھبتیاں اڑانے لگے۔ اُس پر ناشائستہ آوازے کسنے لگے۔ اُن کی نفرت نے اُس پر غلط بیانیوں کا پتھراؤ شروع کر دیا۔ اُن کی حقارت اُس کے خلاف مسموم پروپیگنڈا اور موشگافیاں کرنے لگی۔

لیکن عزم و ہمت کی وہ جسیم چٹان اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ بردباری و تحمل کے اُس کوہ پیکر میں ذرا لرزش نہ آئی۔ اور پھر ایسے پرآشوب حالات میں جبکہ اپنے بھی اُس سے بیگانے ہو رہے تھے۔ ہم جلیسوں ہی نے اُس کے راستے میں رکاوٹوں کی خلیجیں حائل کر دی تھیں۔

لیکن وہ ان دشواریوں اور رکاوٹوں پر مسکراتا چلا گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر کامیابی و کامرانی کی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ جادۂ استقلال پر اُس کے قدم ایک لمحہ کے لئے بھی کسی گام پر نہ رُکے کہ نکل پڑے ہیں تو اب دھوپ چھاؤں کیا دیکھیں۔ کود ہی گئے ہیں تو تلاطم و تموج کی یورشوں سے کیا ڈرنا۔ مسلکِ عشق میں سکونِ بحر کا انتظار روا نہیں۔ اُس میں کود جانے کا وقت تو وہ ہوتا ہے جب طوفان اپنی زندگی کی پوری قوتیں صرف کر رہا ہو۔

اُسے پاکستان سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ پاکستان، جو اُس کا منتہائے مقصود تھا۔ پاکستان، جو ابھی معرضِ وجود میں نہ آیا تھا۔ پاکستان، جو اُس وقت سیاسیات عالم کی نظر میں محض ایک تصور و ایک تصویر تھا۔ پاکستان، جس کے قیام کے لئے وہ سنگدلوں کے ہاتھوں تعصب و بغض کے بازار میں سنگریزوں سے بری طرح زخمی ہو رہا تھا۔ جس کو مصلوب کرنے کے لئے مخالفین کندھوں پر صلیبیں اٹھائے پھرتے تھے۔ اور ان کے لئے اُس کا لبِ بھی ایک پیغام تھا۔

"میں کسی کا دشمن نہیں۔ میں سب کا دوست ہوں۔ لیکن میری اُس سے دشمنی

ہوگی جو پاکستان سے دشمنی کرے گا۔ وہ میرا دوست نہ ہوگا جو پاکستان کا دوست نہ ہوگا۔ پاکستان ایک زندہ حقیقت ہے اور حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ جو آرہا ہے اُسے آنا ہی ہوگا۔ وہ آکر ہی رہے گا۔ اُسے کوئی روک نہیں سکتا"۔ بن کے رہے گا پاکستان۔ لے کے رہوں گا پاکستان"۔

اُس نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے قدم قدم پر یہ اعلان کیا۔

"جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مصلوب ہو جاتے ہیں امر ہوتے ہیں۔ اس مہم میں، اس جد وجہد میں، اس معرکہ آرائی میں اگر میں مارا بھی جاؤں گا تو مجھے اپنی موت کا کوئی افسوس نہ ہوگا۔ میں تمہیں اپنا خون معاف کر دوں گا کہ ظالموں سے کبھی خوں بہا نہیں ملتا۔ تمہارا ظلم ہی تمہارا آسیب بن جائے گا جو تمہیں گھلا گھلا کر ہلاک کر دے گا۔ ظالموں اور غاصبوں کے لئے یہ کیا مناسب سزا نہیں"؟

اور یہ اُس کے مخالفوں سے کچھ عجیب نہ تھا۔ اُس پر قاتلانہ حملے بھی کئے گئے۔ اُسے قتل کرنے کے لئے زہر میں خنجر بھی بجھائے گئے۔

یہ اِس ظالم دنیا کا دستور ہے۔ ٹھنڈی ٹھٹھری رات میں کسی مسافر کو پناہ دو۔ کھانا دو۔ کمبل دو۔ اور پھر اُس کے لئے تیار رہو کہ چلے سے واپس جاتے ہوئے وہ اپنے محسن کے سینے میں خنجر گھونپ جائے۔

جو شخص بولنا نہ جانتا ہو۔ تم اُسے بولنا سکھاؤ۔ اور جب وہ پہلی بار بولے تو تمہیں ہی گالی دے۔ جسے لکھنا نہ آتا ہو تم اُسے لکھنا سکھاؤ اور جب وہ لکھنا سیکھ جائے تو سب سے پہلے تمہارے ہی قتل نامے پر دستخط کرے۔

دوستی، مروت، خلوص، دیانت، شرافت وغیرہ وہ اقدار ہیں جو ہمیشہ کچھ افراد کی حد تک بامعنی رہی ہیں۔ ورنہ ان کو سماج کی منافقت نے محض اپنے ضمیر کے جرائم کو چھپانے کے لئے استعمال کیا ہے۔

وہ انسانوں سے مایوس ضرور تھا۔ لیکن انسانیت سے مایوس نہ تھا۔ اس نے اپنے

عزمِ سفر کو ہر دم تازہ دم رکھا۔ منافقت کے جنگل میں اُس کے آس پاس غولِ بیابانی اور عفریتِ جہنم چیختے دہاڑتے رہے۔ اُسے خون سے بھیگے ہوئے اپنے دانت اور پنجے دکھاتے ہوئے۔ غراتے ہوئے۔

"تم جھوٹے ہو۔ تم قائد نہیں کیدِ اعظم ہو۔ خود گمراہ ہو ہمیں گمراہ کرنا چاہتے ہو۔
تم سامراجی قوتوں کے ایجنٹ ہو۔ جاسوس ہو۔ سراغ رساں ہو۔ ایک بہت
بڑے ٹوڈی ہو۔ پٹھو ہو۔ تم غلط آدمی ہو"

لیکن تم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جو بے لوث تھے۔ بے لاگ تھے۔ بیباک تھے۔ کسی کی لگی لپٹی رکھنے والوں میں سے نہیں تھے۔

اُن میں سے ایک آدمی نے کہا۔ جو کہ محقق تھا۔

"تم اگر اُس کو غلط آدمی سمجھتے تو اُس کی غلطیاں ایک عظیم ذہن کی غلطیاں ہیں۔
اور ایک عظیم ذہن کی غلطیاں ایک معمولی ذہن کی صحیح باتوں سے کہیں زیادہ اہم
ہوتی ہیں۔ اگر یہ جھوٹ بول رہا ہے تو جو جھوٹ مُردوں کو جلا دے وہ جھوٹ
نہیں دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے"

دوسرا بولا ــــ جو کہ بالکل غیر جانب دار تھا۔ اور مہذب تھا۔

"یہ کس تہذیب کا لہجہ ہے۔ یہ کس اخلاق کی زبان ہے جو تم بول رہے ہو؟"

تیسرا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔

"بغض ایک بے جان قبر ہے۔ پھر تم میں کون ہے جو یہ قبر بننا پسند
کرے گا۔ اِن لوگوں کو اِس بھلے لوگ کے ساتھ خواہ مخواہ کا بیر ہے۔ بُغض ہے۔
یہ بُغض و عداوت کے پتلے ہیں۔ چلو یہاں سے نکل چلو"

اور اُس انبوہ و ہجوم سے کچھ لوگ نکل کر چلے گئے۔ تو چوتھا شخص بولا۔

"تم لوگوں میں وہ لوگ بھی ہیں۔ جو یہ جان لیتے ہیں بدی کے کتنے نام ہیں۔
بدکاری کی کتنی شکلیں ہیں۔ اور سچائی و نیکی پر کس کس انداز سے وار کیئے
جاتے ہیں"

لوگوں کے ہجوم سے پھر شور وشغب بلند ہوا۔ فضا تھوڑی دیر مکدر رہی اور رفتہ رفتہ سکوت چھانے لگا تو پانچواں شخص بولا۔

" لنگڑے بڑی سوچ بچار کے بعد اِس نکتے کو پا سکے ہیں کہ اُن کے لنگڑے پن ہی میں راستوں کے نشیب وفراز کی فلاح ہے۔ اور جن کی آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں اس پر شکر گزار ہیں کہ چلو چکا چوند سے نجات ملی "

اب ایک معمر شخص ہجوم میں آگے بڑھا۔ اُس کی لاٹھی اُس کے قد کے برابر تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح چالاک مسکراہٹ نہ تھی اُس کے ہونٹوں پر۔ وہ کوئی ذہنی بازی گر معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے جھرّیوں سے بھرے ہوئے چہرے پر سفید بالوں کی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ جبکہ اُس کے لانبے لانبے سفید بال اُس کے چہرے سے اُس کی چھاتی تک برفانی کرٹیڑوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے چہرے میں دو نہیں بے شمار آنکھیں ہیں۔ یہاں تک کہ اُس گدی میں بھی آنکھوں کی کھڑکیاں معلوم ہوتی تھیں۔ اُس نے اچٹتی ہوئی نظر سے اپنے آس پاس اُگے پگڑیوں اور لاٹھیوں کے جنگل کو دیکھا۔ تو ایک دو شُہدے چکن کے کرتے پہنے۔ پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے۔ پان کھائے۔ رنگین ازار بند لٹکائے۔ تیل سے پٹیاں جمائے۔ فقرے کستے اُس کے پاس سے گزر گئے۔ تو ذہنی بازی گر ہجوم سے مخاطب ہوا۔

" شہرِ صلیب کے لوگو! یہ انسان گھات چھوڑو۔ میری سنو میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں "

اچانک اُسے کھانسی اٹھی۔ وہ تھوڑی دیر کھانستا رہا اور پھر اپنے اُلجھے سانسوں کو سلجھاتے ہوئے بولا۔

" میں نے اپنا بچپن دیکھا۔ جوانی دیکھی۔ اور اب اُس کا تیسرا برن بڑھاپا بھی دیکھ رہا ہوں۔ میری عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ کہتے ہیں سانپ سو سال کا ہو جاتا ہے تو جون بدل لیتا ہے۔ مگر میں سانپ نہیں اور نہ سپیرا ہوں۔ میں تو اک بنجارہ ہوں۔ بستی بستی گاؤں گاؤں، بیداری کے گیت گاتا اور لوگوں کو جگاتا چلا جاتا ہوں۔ میں نے زندگی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ عمر نے

مجھے بہت کچھ سمجھایا ہے۔ سکھایا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میری بوڑھی نظر میری سفید پلکوں سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ میں بہت دور تک دیکھ سکتا ہوں۔ بہت دور تک دیکھ رہا ہوں۔ میں تمہیں جو کچھ دکھانا چاہتا ہوں تم اُسے اپنی نہیں میری نظر سے دیکھو۔ میں تمہیں جو کچھ سنانا چاہتا ہوں اپنے نہیں تم اسے میرے کانوں سے سنو۔ تم حقائق کا مشاہدہ خواہ اپنے حواس کے ذریعہ کرو یا بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے آلات استعمال کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں تمام حقائق پائے جاتے ہیں۔ یعنی ہم انہیں بناتے نہیں بلکہ قدرتی طور پر بنے بنائے ہوتے ہیں۔ مشاہدہ کی صورت میں حالات کا تعین خود خدا کرتا ہے۔ لیکن جب ہم خود حالات پیدا کرلیں تو اس صورت میں مشاہدہ تجربہ کہلاتا ہے۔ اور تجربے میں حالات مشاہدے کی نسبت زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ تم اِس شخص کو جھٹلاؤ نہیں تم اپنے تجربے کی کسوٹی پر اسے پرکھو۔ اس کا کھوج لگاؤ۔ اسے بڑے غور سے سنو۔ اسے بڑے غور سے دیکھو۔ پھر شاید تم سے اس کی کوئی بات چھپی نہ رہے گی۔ تم پر بہت کچھ منکشف ہوگا۔ اور تم یہ انکشاف کر سکو گے کہ حقیقت میں یہ کیا ہے۔ پھر اگر یہ جھوٹا ہو تو اِسے چھوڑ دو اور اگر سچا ہو تو اس کا ساتھ دو۔"

یہ سنتے ہی شہر صلیب کے لوگوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ وہ اور زیادہ بھر گئے۔ ایک بیہودے نے اُس پر پانی اچھالا۔ بوڑھا چھینٹم چھینٹ ہوگیا۔ دوسرے نے اُس کی داڑھی پکڑ کر نوچی اور اُس پر مٹھرے کی پوری بوتل انڈیل دی جبکہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہو رہا تھا اور بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔

اب بے شعوروں کا ایک ہجوم تھا جو اُس پر آوازے کسنے لگا تھا۔ اُسے گالیاں بکنے لگا تھا۔ اُس پر قمقمے پھینکے گئے۔ اُس کو پتھر مارے گئے۔ بیچارہ بنجارہ بوڑھا تھا زخمی ہوگیا۔ بیہوش ہوگیا۔ تو شہر صلیب میں اپنی سچائی کا ڈھونڈورا پیٹنے والا۔ حق کا اعلان کرنے والا۔ غلاموں کو آزادی کی خوش خبری دینے والا۔ بے گھروں کو اپنا ایک گھر بنانے کا مشورہ دینے والا۔

زخمی بوڑھے کو ایک ہاتھ سے اوپر اٹھاتے ہوئے اپنے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک تصویر تھی جس پر نقاب پڑا تھا۔

وہ ایک سیدھے اور روشن راستے پر چلا جا رہا تھا اُس کے سر پہ پیڑوں کی ہری ہری شاخیں لہرا رہی تھیں۔ جن میں سے بجھا بجھا چاند اسے جھانک رہا تھا۔ اور ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہوئی اُس کے کانوں کے قریب سے گزر رہی تھیں ؎

گھر ہوا صحرا ہوا گلشن ہوا
ہر جگہ میرا جنوں رسوا ہوا

کہو کیسی کہانی ہے ؟

مگر ابھی تو یہ کہانی شروع ہوئی ہے۔ میری زبانی جو کچھ سُن چکے ہو اُسے تم کہانی کی تمہید سمجھو۔ یہ کہانی بہت لمبی بھی ہے اور مختصر بھی۔

دنیا سُنے تو قصۂ غم ہے بہت طویل
ہاں تم سُنو تو قصۂ غم مختصر بھی ہے

تم ہنکارا دیتے جاؤ۔ میں یہ کہانی بڑے شوق سے تمہیں سناتے جاؤں گا۔

ایک تصوّر ایک تصویر

وہ بوڑھے بنجارے کو اٹھا کرلے آیا۔ اُس کے زخم پر پٹی باندھی۔ اُس نے کہا "مبارک ہیں وہ لوگ۔ جو سچائی کے لئے۔ نیکی کے لئے۔ دوسروں کے لئے زخم کھاتے ہیں۔ وہ اِس کا اجر پاتے ہیں۔ اِس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی۔ تم سچائی کی، نیکی کی، پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہوگے۔ تم اس کے دوست ہو۔ حامی ہو۔ تم نے اس کی حمایت کی ہے۔ پاکستان ہمیشہ تمہیں یاد رکھے گا۔"

یہ سن کر بنجارہ بولا

"اس سے پہلے کہ میں اپنا راستہ لوں۔ تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں بیہوش ہوگیا تم مجھے ہوش میں لائے۔ میں زخمی ہوگیا تم نے میرے زخم پر پٹی باندھی۔ تم انسان دوست ہو۔ تم عظیم ہو۔ اور تمہارا پاکستان بھی عظیم ہوگا۔ تمہاری آواز میں میں نے اُس کے قدموں کی چاپ سُنی ہے۔ وہ قریب آچکا ہے۔ میں بستی بستی گاؤں گاؤں لوگوں کو بیدار کردوں گا۔ ہوشیار کروں گا۔ تمہارا پیغام دوں گا۔ میں اندھیروں اجالوں میں پاکستان کے گیت گاؤں گا۔ میرے گیت اب پاکستان کے گیت ہونگے۔ تم مجھے اپنا پیغام سمجھو۔"

اور بنجارہ چلا گیا۔ وہ دور تک اُس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور پھر ہریالی میں سیدھے صاف ایک راستے پر قدم قدم چلنے لگا۔ زمین پر اُس کے ہر قدم کا نشان بنتا جا رہا تھا۔

نقوشِ پا سے ہمارے اُگے ہیں لالہ و گل
رہِ بہار سے ہم بے نشاں نہیں گزرے

اور اُس کے وہی نقشِ قدم ایک قوم کی تقدیر بن گئے۔ ایک حیات آفریں عہد کی تصویر بن گئے۔

سیدھے صاف راستے پر اُس کے قدموں کی رفتار نہ سُست تھی نہ تیز تھی۔ وہ میانہ روی سے چل رہا تھا۔ اور اُس کی روشن آنکھیں دور سمندروں کا احساس لیئے خوابوں کے اجالے میں تیر رہی تھیں۔

اور پھر ڈوبتے ہوئے سورج کی لہو لہو شفق میں پرندے جب اپنے آشیانوں میں اترنے لگے تو اُسی راستے کے موڑ پر اُس کو کچھ لوگ ملے۔ وہ پہلے ہی بڑے سنجیدہ نظر آرہے تھے اُس کو دیکھ کر اور سنجیدہ ہو گئے۔ ان کا چہرہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگا۔ وہ اپنی ہیئت کذائیہ سے مداری معلوم ہوتے تھے۔ تھیلا یقیناً تھا ان کے کندھے پر لیکن ہاتھ میں ڈگڈگی نہ تھی۔ اور نہ نچانے کے لیئے بندر اور ریچھ ہی تھا ان کے پاس۔ لیکن کچھ ایسے مداری بھی ہوتے ہیں جو قوموں اور انسانوں کو نچاتے ہیں انہیں بندر اور ریچھ بنا کر۔ وہ وہی تھے۔

اُن میں سے ایک نے کہا۔

"محمد علی جناحؒ تم پہلے ہی بڑے ہر دلعزیز تھے۔ لیکن اب تو تمہاری ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ بڑے کیا بچوں کی زبان پر بھی تمہارا نام ہے۔ گھر گھر تمہارے چرچے ہو رہے ہیں۔"

دوسرا بولا۔

"تم کوئی کالا جادو تو نہیں پڑھتے" ؟

تمام عمر جلا میں مگر دیا ہی رہا
تم ایک شب نہ جلے اور ماہتاب ہوئے

تیسرے نے چیں بہ چیں ہوتے ہوئے کہا

"ہمیں مشترکہ ہندوستان پسند ہے۔ ہم ملک کا بٹوارہ نہیں چاہیئے۔ ہم اپنی اپنی جماعت کے لیڈر ہیں۔ رہنما ہیں۔ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ

قدم قدم پر تمہارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کریں گے۔ تمہاری مخالفت کریں گے۔ تمہارے ساتھ لڑیں گے۔ ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے یہ ہمارا متفقہ فیصلہ ہے۔ تمہاری ذات پر ہم جس قدر کیچڑ اچھال سکتے ہیں ضرور اچھالیں گے۔"

اور وہ عزم داستقلال کا پتلا مسکرا دیا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی زیر نقاب تصویر کو اس کی خاموش نگاہوں نے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

الزام کسے دیں کہ تیرے پیار میں ہم پر
جو کچھ بھی رہی حسب روایات رہی ہے

اب ایک اور گستاخ نے کہا۔

"یہ تصویر جسے تم ہر وقت سینے سے لگائے پھرتے ہو۔ ایک چھل ہے۔ فریب ہے۔ تم سمجھتے ہو تم دنیا کو اس سے فریب دے رہے ہو جبکہ تم خود اس کا فریب کھا رہے ہو۔ فریب خوردہ ہو۔

کچھ تم نے بھی فریب محبت دیا مجھے
کچھ ٹھوکریں بھی کھائیں میرے اعتبار نے

فریب تو تم کھا چکے ہو اب تمہارے اعتبار کے ٹھوکریں کھانے کی باری ہے۔ تم کو ایک ملک بنانے کا سودا ہو رہا ہے جبکہ گڑیا گڈے کا کاغذ کا ایک گھر بنانا بڑا مشکل ہے۔ تم اسے بچوں کا کھیل سمجھتے ہو مگر یہ بچوں کا کھیل نہیں۔

ہزار چاند ستاروں کا خون ہوتا ہے
تو ایک صبح اجالوں کی مسکراتی ہے

اس کے بعد جس شخص نے زبان کھولی وہ کوئی مسخرہ معلوم ہوتا تھا۔ آگے آتے ہی اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور اپنی نقلی مونچھیں اتار کر جیب میں ڈال لیں۔ بولا۔

کتنی نادیدہ تمناؤں کی حسرت لے کر
چاند ہر روز اندھیروں سے گزر جاتا ہے

اب اُس نے اپنے سر سے نقلی بال بھی اتار لئے - اُس کی آنکھیں یوں گھومنے لگیں جیسے وہ گھوم نہیں رہیں بلکہ اور گول ہوتی جا رہی ہیں - اور یہ انکشاف کر رہی ہیں کہ ان دو آنکھوں میں دو ہزار آنکھیں چھپی ہوئی ہیں - کھڑکیوں میں کھڑکیاں - بند اور کھلی کھڑکیاں - بدلتے موسم، بدلتا وقت، بدلتی فضا، بدلتا ماحول، بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ جس کھڑکی کو جی چاہا کھول دیا جس کو جی چاہا بند کر دیا -

اور پھر اُس مسخرے کے بولنے سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہی تھی کہ اُس کی ایک زبان میں ان گنت زبانیں اُس کے منہ میں نہیں اُس کے ضمیر کے گولڈ سٹوریج میں پڑی ہوئی ہیں - جیسا موقع دیکھا - جیسا گاہک دیکھا جیسی قیمت دیکھی - جیسا بھاؤ تاؤ دیکھا - جیسی منڈی دیکھی - جتنی مانگ دیکھی، جیسی بات کرنا ہوئی ویسی ہی زبان ضمیر کے گولڈ سٹوریج سے نکال لی - اب اُس مسخرے نے ایک اور تیکھی طنز کی -

سوادِ دل میں لہو کا سراغ بھی نہ ملا
کسے امام بناتے کہاں وضو کرتے

مسخرے نے ایک اور بے ساختہ شیطانی قہقہہ لگایا - اور اپنا مصنوعی چہرہ بھی اُتارتے ہوئے ایک طرف سرک گیا - اب وہ طنزیہ لہجے میں گنگنا رہا تھا -

زیست ہاتھوں میں لئے پھرتی ہے پتھر ہمدم
ہم نے کس شوق سے گھر شیشے کے بنوائے تھے

یہ تیکھی طنز یہ ہنسی عزم و استقلال کے پتلے کو بڑی ناگوار گزری - اُس نے کہا -

"یہ ہنسی تمہارا خبثِ باطن ہے - یہ ہنسی تمہارے ضمیر کے مینکارنے اور غرارنے کی آواز ہے - تمہارے ضمیر کے لڑھکنے کی آواز ہے جو ایک پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں -

ضمیرِ سنگ میں شیشے کی آبرو کیا ہے

اور یاد رکھو - پاکستان شیشے کا گھر نہیں ایک ناقابلِ تسخیر فولادی قلعہ ہوگا - جو کسی کی جارحیت کی یلغار کو یوں منتشر کر دے گا جیسے آندھی تنکوں کو منتشر کر دیتی ہے - اور میں تمہیں خوب

سمجھتا ہوں بہروپیو۔

میرے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر کے صنم
آج بت خانے میں بھگوان بنے بیٹھے ہیں

"تمہارا بہروپ بت خانے کا بھگوان بن کر پاکستان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ سچائی اور صداقت کو دنیا کی کوئی چیز نہیں دبا سکتی ہے اور نہ اُسے رونما ہونے سے روک سکتی ہے۔ اندھیروں کا سمندر طلوع ہوتے ہوتے سورج کو آج تک کبھی نہیں روک سکا۔ اور نہ تاریک سے تاریک ترلات چاند کی چاندنی کو پھیلنے سے روک سکی ہے۔ مگر تم اس راز سے ناواقف ہو اور ناواقف رہو گے۔ کیونکہ تمہارے ذہن کو لالچ و مطامع کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ تم تو خود وہ شمع ہو جسے صبح کا یقین نہیں۔ اور تمہارے عزائم، تمہارے مقاصد وہ بت ہیں جو تخیل کے صنم خانے میں تمہارے افکار کے آذر نے تراشے ہیں۔ ایک نہ ایک دن ان بتوں کو ٹوٹنا ہوگا۔ تم جسے ماضی میں سمجھتے ہو وہ حال میں ہے۔ تم جسے آسمان پر دیکھ رہے ہو وہ زمین پر آچکا ہے۔ تم جسے بیکراں فاصلوں میں تلاش کر رہے ہو وہ بہت قریب ہے۔ عنقریب وہ طلوع ہوگا"

اُس کی آواز میں کچھ ایسی ہیبت و جبروت تھی کہ مصنوعی چہروں والے گھبرا گئے۔ بغلیں جھانکتے ہوئے چلتے بنے۔

اور وہ بستی کے چاندنی چوک میں چلا آیا۔ جہاں خوب گہما گہمی ہو رہی تھی۔ اُس نے تصویر کو چوک کے مینار کی دیوار سے لٹکا دیا۔ اُس کا نقاب سرکا دیا۔ تو وہاں لوگوں کی اتنی بھیڑ لگ گئی کہ کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔

وہ تصویر نہ تو تجریدی آرٹ کا کوئی نمونہ تھی اور نہ رنگوں کی بھول بھلیاں۔ نہ یہ نہ وہ۔ وہ تقلید نہیں تخلیق تھی۔ وہ تصویر ایک محشر خیال تھا۔ کینوس پر رنگوں کا ایک جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ ان گنت رنگ۔ اور ان میں کچھ ایسے رنگ جو رنگ نہیں اُن کا استعارہ

اور تشبیہہ معلوم ہوتے تھے۔ کچھ رنگ ایک شدید احساس اور ذاتی تصور کی ترجمانی کر رہے تھے۔ جن میں رنگوں کے کچھ ایسے دائرے تھے جو آگے چل کر اپنے سے بڑے دائروں میں کہیں سمٹ رہے تھے کہیں پھیل رہے تھے۔ اور پھر ان میں نقطے، دھبے اور لکیریں تھیں۔ جن میں ایک مرکزی نقطہ تھا۔ جس سے رنگوں کی ایک سدیم اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی جا رہی تھی اور رنگ ایک کائناتی تصور (Cosmic Vision) کی ہیئت اختیار کرتے چلے جا رہے تھے۔ فنکار اور مفکر اپنی ذات میں وسعت کائنات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے پھیلاؤ میں کئی درجے تھے میں اس کے ارتقا کی منزلیں تھیں۔ جیسے وہ زندگی کی حدود سے نکل کر زندگی کے وسیع سے وسیع تر پس منظر کی عکاسی کر رہا تھا۔ خوب سے خوب تر کے قریب ہو رہا تھا۔ مادے کی یہ پوری کائنات اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے خود انسان کے اندر ہے۔ نطشے کے الفاظ میں انسان ایک ایسا حیوان ناطق ہے جس نے ہنوز اپنے ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کی۔ وہ کائنات کی لامحدود و نامعلوم قوتوں کے مابین مقید ہے۔ ان کے گھیراؤ میں ہے۔ بالفاظ دیگر لامحدود نامعلوم قوتیں اُس کا گھیراؤ کئے ہوئے ہیں۔ اور انسان ان کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے۔

عالم رنگ و بو کی وسیع و عریض پہنائیوں اور گہرائیوں میں زمانی و مکانی حیثیت سے اُس کی ذات، اس کی ہستی نہایت ہی محدود و مختصر ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک لامحدود قوت و حیات اس کے اندر متحرک و متلاطم ہے۔ جو اُس کو ماحول کی قوتوں کا سامنا کرنے، ان سے مصالحت کرنے، ان کو تسخیر کرنے اور ان سے حریفانہ کشمکش پر مائل کرتی ہیں۔ حیات کی اس بنیادی قوت کی تعبیر کرتے ہوئے ڈارون اس بنیادی قوت Driving Force کو عزم البقا Will to Life قرار دیتا ہے۔

نیٹشے کے نزدیک یہ لامحدود بنیادی قوت اپنی ماہیت و نوعیت کے اعتبار سے محض عزم البقا ہی نہیں بلکہ عزم قوت و اقتدار (Will to power) سے عبارت ہے۔ شاعر مشرق اس قوت کو عزم تسخیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جبکہ اس عزم تسخیر کا ماخذ جوہر انسانی اور اُس کی خودی میں پنہاں و پوشیدہ ہے۔ طبیعات کے موجودہ انکشافات کے مطابق

مادی جوہر (Atom) جو بظاہر اس درجہ صغیر و حقیر ہوتا ہے کہ طاقتور خورد بینوں کی مدد سے بھی انسانی آنکھ اُسے نہیں دیکھ سکتی ۔

اپنی ماہئیت کے اعتبار سے طاقت و توانائی کا ایک ایسا سرچشمہ ہوتا ہے کہ اگر کسی جوہر کی کسی طرح شکست عمل میں لائی جائے اور اُس کی پوشیدہ توانائی کو اظہار و انتشار کا موقع ملے تو ایک حقیر جوہر کا دھماکہ اتنا قیامت خیز ہوگا کہ کرہ ارض کے ایک حصہ کو جلا کر راکھ کر دے گا۔

شاعر مشرق کے نقطہ نظر سے انسانی ہستی کا کچھ ایسا ہی حال ہے۔ خفتہ حالت میں انسانی مونا د (Mona) یا انسانی جوہر بھی ایسا ہی افتادہ پڑا ہوتا ہے۔ جیسے ریگستان میں ریت کے بے شمار ذرے جن کا وجود عدم وجود کے برابر ہوتا ہے۔

لیکن جب کسی انسانی جوہر میں دھماکا پیدا ہوتا ہے اور مخصوص حالات میں اس کے اندر کی بے پناہ توانائی کو نمود کا موقع مل جاتا ہے اور اگر موقع نہ بھی ملے تو وہ توانائی خود موقع پیدا کر لیتی ہے

طاقت کی یہ فطرت ہے۔ یہ کُلیہ ہے کہ اُسے اُس کے مظاہرے سے نہیں روکا جا سکتا۔ وہ ظاہر ہو کر ہی رہتی ہے۔ وہ ایک ایسا آتش فشاں ہے کہ بوجھل پتھر اور چٹانیں چاہے کتنا ہی دباؤ ڈالتے ہوئے اس کے گرجتے چمکتے لاوے کا راستہ روکنے کی کوشش کیوں نہ کریں وہ پھٹ کر ہی رہتا ہے۔ اور دنیا میں ایک تہلکہ مچانے اور تاریخ عالم کا رخ بدل دینے کا باعث ہوتا ہے۔

انسان کی شخصیت کو جوہر انسانی کے اس دھماکے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے کہ انسانی جوہر میں بے پناہ توانائی موجود ہے ۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

انسانی جوہر مشتعل و متلاطم ہو کر بیکراں و بے پایاں ہو جاتا ہے۔

بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

اس نقطہ نظر سے اسلامی فلسفہ حیات وہ طریق عمل ہے جس کی بدولت شخصیت انسانی کو وہ گہرائی و گیرائی حاصل ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی ذات سے پوری کائنات کی طرف پھیلنے لگتا ہے۔ اور انسانی جوہر جو لامتناہی توانائی کا حامل ہے متحرک و متموج ہو جاتا ہے۔ جس طرح چاند کی چمک سمندر میں جوار بھاٹے پیدا کر دیتی ہے۔

اسی طرح اسلامی فلسفہ حیات انسان کے اندر سوئی ہوئی اس کی جبلتوں کو بیدار کر کے اس کو ایک مافوق الانسان (Super Man بنا دیتا ہے۔ مافوق الانسان ملٹی مین Multy Man اور اسلام - دین خدا - وہ ڈھانچہ ہے جس میں مافوق الانسان ڈھلتے ہیں۔ اس کے بس ایک ہی لمس سے انسان مردِ مومن بن جاتا ہے۔ نٹشے کا مافوق الانسان شاعر مشرق کا مرد مومن ہے۔

اسلام کے نزدیک شخصیت انسانی یا خودی Igo قوت ہادیہ یعنی Energygy Directive کی ایک اکائی ہے۔ اور یہ پوری کائنات جوہری اکائیوں کا ایک طلسم۔ جس کا سرچشمہ خدا کی قوت ہادیہ یا قوت آمرہ ہے۔ جو اس کی روح رواں ہے۔ اس کے ہر خلیئے میں جاری و ساری ہے۔

لیکن اس راز سے آگاہ ہونے کے لئے انسان کے لئے خود آگاہی شرط ہے۔ کیونکہ جس انسان نے خود کو سمجھ لیا۔ جوہر خودی کو سمجھ لیا اور خود کو سمجھنے کی لگن انسان میں پیدا کرنے والی قوت عشق ہے۔

جو چاہے کسی تصور سے ہو جائے۔ کسی تصویر سے ہو جائے۔ کسی تفلسف سے ہو جائے یا اس کی تفسیر سے ہو جائے۔ کسی آئیڈیل سے ہو جائے یا کسی عمل سے ہو جائے۔ عشق ہی وہ بنیادی جذبہ ہے۔ جسے ڈارون اور شوپنہار عزم البقا سے موسوم کرتے ہیں۔

عشق اقبال کے نزدیک نٹشے کے عزم قوت کی طرح ایک جذبہ بلند ہے۔ وہ

عظمت و کمال کے حصول کا جذبہ ہے جو خام حالت میں، ناپختگی میں، ادھورے پن میں، نامکمل ہونے کی صورت میں ایک اندھے ارادے Blind Will کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ شوپنہار نے بھی کہا ہے لیکن جب جذبہ عشق میں پختگی و پائداری آجاتی ہے یہ پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ تو ایک عظیم قوت بن جاتا ہے۔ اور فرشتے بھی حیران و ششدر ہو کر سوچنے لگ جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا نہ کامل بن جائے۔

پھر یہ جذبہ بقول حکما و فلاسفہ نظام عالم کو درہم برہم کر کے قانون الٰہی کی روشنی میں عالم انسانیت کی تشکیل جدید کے نصب العین میں اپنا اظہار ڈھونڈھتا ہے۔ اظہارِ قوت یعنی اسلام کا نصب العین انسان اور تکوین کائنات میں پیش از پیش حصہ لے کر خدا کا تقرب حاصل کرتا ہے۔ اور مقرب بن جاتا ہے۔

قلب و روح یا نفس مستغرقہ Appreciative Self ۔انسان کی اصلی یا حقیقی ہستی ہے۔ اور اس کی مادی ہستی صرف اسی روح کا ظاہر و مرئی ہو جانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی مادی ہستی قلب و روح کے بے شمار مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔

حیات انسانی کا صحیح ارتقا یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کی اقلیم قلب تک رسائی حاصل کرے۔ اور قلب کے مقاصد کی تکمیل کے لئے زندہ رہے۔ قلب یا روح کا مقصود قرب الٰہی کا حصول ہے۔ اور یہ ارتقائے ذات توسیع خود کے ذریعہ ممکن ہے۔ جبکہ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے انسان دو متضاد و مختلف قوتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ پہلی قوت روح ہے۔ دوسری قوت مادہ یا فطرت ہے۔ اُس کے شعور کی اعلیٰ سطح کا اقتضا ہے اور دوسری اُس کے بطون سے باہر طبعی دنیا کے تقاضے اور مزاحمتیں۔ ایک اُس کی شخصیت کا اعلیٰ جوہر، Higher Principle ہے جو زماں و مکاں کی حدود سے ماورا ہے۔ دوسرا اُس کی شخصیت کا ادنیٰ جوہر ہے۔ جو زماں و مکاں کی بندشوں کا پابند ہے۔ اور اسے اس کے ساتھ متحارب و متصادم قوتوں سے خائف کرتا رہتا ہے۔ اور اُس کے دل میں اُس کی قوتوں کے بارے میں نفی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اسلام کا نصب العین یہ ہے۔

کہ انسان کو اُس کی فطرت کی اِس زبردست منفی قوت سے نجات دلائی جائے۔ اور اُس کی جگہ اُس کو ایک زبردست اثباتی قوت سے معمور کر دے۔ جسے قوت ایمان۔ قوت توحید اور قوت اسلام بھی کہتے ہیں۔ قرآن حکیم کے نزدیک انسان کے اخلاقی ارتقا کی اعلیٰ ترین منزل وہ ہے جہاں وہ خوف وغم سے مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ مختلف موقعوں پر انسان کو خوف وغم سے آزاد رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

اسلام کے بنیادی اصول "لا الٰہ الا اللہ" میں اسی نصب العین کو پیش نظر رکھا گیا لا الٰہ خوف کی منفی قوت کی بیخ کنی کرنے والا اصول ہے۔ اور الا اللہ توحید یا ایمان کی اثباتی قوت ہے۔ مرد مومن خدا کے خلاف کسی قوت کسی نصب العین کو تسلیم نہیں کرتا اور غیراللہ کے مقابلہ میں لا الٰہ کی شمشیر بے نیام سے مسلح ہوتا ہے۔

ایک صاحب خودی کی حیثیت سے مرد مومن نہ صرف اللہ کے سوا تمام قوتوں کو ناقابلِ تسلیم قرار دیتا ہے بلکہ وہ اللہ کے سوا تمام قدروں اور تمام اصنام کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ جہاں کہیں زندگی غلامی وخوف کی منفی قوتوں میں گھٹ کر رہ گئی ہو اُن سے آزادی اور نجات کا دارومدار اسی امر پر ہے کہ لا الٰہ کا اصول انسان کی رگ وپے میں سرایت کر جائے۔ یہ اصول انسان کی خفیہ طاقتوں کو بیدار کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اور اس کے سوز سے انسانی جوہر میں جوہری توانائی پیدا ہوتی ہے۔ لا الٰہ کی قوت غیراللہ کی قوتوں کو درہم برہم کر کے انسان کو ایک نئی قوت وشخصیت بخشتی ہے۔ اور اس کو ایک نئے سراپے میں ڈھال دیتی ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کا اصول حیات کی سب سے بڑی منفی قوت خوف سے انسان کو آزاد کرتا ہے اور کسی غیراللہ شئے، کسی قدر، کسی نصب العین کو انسان کے لئے قابل تسلیم قرار نہیں دیتا۔

اسلام سے مثالی انسان کے نزدیک غیراللہ کا خوف شرک ہے۔ اور غیراللہ کے مقابلے میں "لا" کی شمشیر سے حملہ آور ہونا اس کا مسلکِ حیات اور عظمت وصداقت کے لئے زندہ رہنا اُس کا وظیفہ حیات ہے خواہ اِس جدوجہد میں اُسے زندگی ہی کیوں نہ قربان کر دینا پڑے۔ وہ غیراللہ کے خوف کو خود زندگی کی قیمت پر بھی روا نہیں رکھتا۔ اور اُس کے مقابلے

ہیں ہر حال ہیں شمشیر بکف ہو کر ٹوٹ پڑنا ہی انسان کامل، مردِ مومن، مردِ کامل کا مسلک ہے۔ جس کا ایک عظیم الشان نمونہ حضرت شبیر کی زندگی ہیں ملتا ہے۔

یہ تصویر اسلامی فلسفہ حیات کی تفسیر تھی۔ "لا الٰہ الا اللہ" کی تفسیر تھی۔ اسلام کے نصب العینی انسان اور اُس کی ایک آزاد اور نصب العینی مملکت کی تصویر تھی — اور مسلمانوں کے اتحاد و ارتباط کی تفسیر بھی۔ یہ تصویر صراط مستقیم کی تصویر تھی۔ وہی صراط مستقیم جس پر حضرت آدم نے قدم رکھا۔ حضرت نوح نے بھی پتھروں کی بارش ہیں اس کا وعظ کیا۔ حضرت ابراہیم نے اس کی نشان دہی کے لئے قربان گاہ بنائی۔ اور حضرت اسمٰعیل نے اس کی اینٹیں چُنیں اور اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا۔ حضرت یوسف نے مصر کے قید خانہ ہیں اس کا اعلان کیا۔ حضرت موسیٰ نے طور سینا پر تجلی ہیں اس صراط مستقیم کو دیکھا۔ اور گلیل کا واعظ جب یروشلم ہیں کوہ زیتون پر چڑھا تو اُس کی نظر اسی راہ پر تھی۔ اور پھر جب خداوند فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو یہی راہ تھی جس کی طرف اُس نے دنیا کو دعوت دی تھی۔

یہ ہے میری راہ ——— تم میری اتباع کرو ——— !!

اُس تصویر ہیں ان گنت رنگ تھے لیکن آپس ہیں اس قدر گھلے ملے تھے کہ بس ایک رنگ نظر آتے تھے اور چاند اُن کی ہم آہنگی کی علامت تھی۔ اور ہم آہنگی اخوت و اتحاد اور تنظیم و ترتیب کی علامت ہے۔ اور اخوت و اتحاد، تنظیم و ترتیب زندہ رہنے کے لئے رزمگاہِ حیات ہیں بہت ضروری ہے۔ یہی وہ اثباتی قوت و جوہر ہے جو کسی فرد، کسی جماعت، کسی گروہ، کسی قوم کے زندہ رہنے کی ضامن ہوتی ہے۔

ربط باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

دنیا ایک رزمگاہ ہے —— !

یہ فلسفہ کسی فلسفی کی فکری و نظری بعید از حقیقت اختراع و ایجاد نہیں بلکہ عین حقیقت و واقعیت ہے کہ کائنات بسیط و بیکراں ہیں ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک مختلف قوتیں برسرِ پیکار رہی ہیں۔

اس رزم گاہ ہیں تنازع البقا Strugle for Existance کا نعیری و تخریبی

عمل جاری ہے۔ تعمیری کم اور تخریبی زیادہ۔ اس کائنات میں زندگی کی بنیاد تھی تو موافقت پر لیکن اس کو تنازع پر قائم کر دیا گیا۔

قوی ضعیف کو نگل جانے پر تلا ہوا ہے۔ ہر بڑی قوت چھوٹی قوت کو اپنے میں سمو لینے پر تلی ہوئی ہے۔ اس ہنگامہ کشت و خون میں فقط وہی زندہ رہ سکتا ہے جو دوسروں کے مقابلے میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بقائے اصلح Survival of the Fittest کا فطری ضابطہ ہے۔ اور اسی ضابطہ کے مطابق دنیا میں زندگی کے لائق ۔۔۔۔۔ انواع کا انتخاب ہو رہا ہے۔ یعنی کمزور کا مٹ جانا اور طاقتور کا باقی رہنا ہی فطری انتخاب Natural Selection ہے۔ اور اس فطری انتخاب میں قوت و حیات کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کے لیے مسلمانوں کے پاس اسلام کی قوت ہے۔ اور اسلام کا اساسی میثاق جس کو شریعت کی زبان میں کلمہ طیبہ کہا جاتا ہے۔ ارتقاء امم کے ہنگامہ فنا و بقا میں ہمیں اپنی حفاظت کے لئے اتحاد و اخوت کا حربہ دیتا ہے۔ اگر یہ حربہ ہمارے ہاتھ میں ہو تو دنیا کی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی یورش و یلغار ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہمارے ہاتھوں میں یہی وہ عصائے موسوی ہے کہ جس کے ہوتے ہوتے ہمیں کسی سامری اور اس کے بنائے ہوئے طلسمی سانپ کا خوف نہیں۔

قرآن حکیم نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ہر انسان کے لئے ایک جامع و اکمل قانون لے کر آیا ہے۔ اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی تعلیم توحید میں نہایت غیور ہے۔ اور یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کو ماننے والے کسی اور کو حکم مانیں مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ وہ اپنے اندر ایک اکمل ترین قانون رکھتی ہے۔

اور اسلام کے سوا ایسا کوئی نظریہ نہ اس سے پہلے کبھی تھا نہ اب ہے جو ضعیف کو قوی اور مظلوم کو ظالم کی تباہ کاریوں سے بچا سکے۔ اور انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کر سکے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جو پوری نوع انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہے اور تمام انسانوں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم سب اصل میں ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہو۔ ایک قوم

کے پاس دوسری قوم کو اپنے مقابلے میں پشت تر سمجھنے کا کوئی جواز موجود نہیں۔

ایک طاقتور ملک کو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں کمزور ملک پر مسلح یا غیر مسلح جارحیت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسلام چونکہ خود کمزور نہیں اس لیے کسی قسم کی کمزوری کو پسند نہیں کرتا۔

اسلام ایک عظیم و جلیل قوت کا نام ہے۔ وہ ہر انسان کو ہر قوم کو کشمکش حیات میں زندہ رہنے اور زندہ رہنے کی صلاحیتیں پیدا کرنے کے گُر اور اسرار و رموز بھی سکھاتا ہے۔ زندگی کے لائق انواع کے انتخاب و ارتقا میں کمزور ہونا یا کمزور رہ جانا اسلام کے نزدیک بھی یقیناً معیوب ہے۔ اسلام اس کمزوری کو کسی طرح پسند نہیں کرتا۔ کسی کیڑے کی طرح زمین پر رینگتے ہوئے زندگی گزارنا اسلام کے نزدیک بھی زندہ رہنے کی ایک کمزور و کم تر علامت ہے۔

لیکن وہ یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ ایک جسیم ہاتھی ایک چیونٹی کو اپنے بوجھل پاؤں تلے کچلتا مسلتا نکل جائے۔ شاہین کی طرح چٹانوں پر بسیرا کرنا اور شاہین ہونے کے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے شہپر پھیلائے سنسناتی آندھیوں پر افلاک کی رفعتوں میں پرواز کرنا اسلام کے ضوابط حیات میں ہے۔

لیکن اسلام شاہین کو اس کا حق ہرگز نہیں دیتا کہ وہ ایک کنجشکِ فرومایہ پر پلٹ جھپٹ کر خون گرمانے کے لئے اُس کا خون پی جائے۔ اسلام کی میزان عدل میں ایسا کوئی اندھا اور بہرہ قانون نہیں۔ وہ زندہ رہنے اور زندہ رہنے کی صلاحیتیں رکھنے کا یقیناً قائل ہے لیکن اس طرح نہیں کہ زندہ رہنے کے لئے دوسروں کو زندہ نہ رہنے دے۔

اسلام کی میزان میں دھونس دھاندلی اور دھمکی ایسا کوئی پاسنگ نہیں۔ گمراہوں کی آنکھیں ہی نہیں ان کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل بھی اندھے ہو جاتے ہیں۔ اسلام گمراہوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے ظہور پذیر ہوا ہے۔ اسلام اندھے کی لاٹھی ہی نہیں بلکہ اُس کی آنکھوں کی بصارت بھی ہے۔ بہرے کی سماعت ہی نہیں بلکہ وہ مقدس آواز بھی ہے جو دن میں پانچ مرتبہ اس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ اور اُسے کبھی بہرہ نہ

ہونے دے گی۔

اسلام وہ حکیم کامل ہے جس کے مطب میں کنجشک فرومایہ کو شاہین اور چیونٹی کو ہاتھی سے بھی جسیم بنا دینے والے کرشمے موجود ہیں۔ اسلام وہ پارس ہے جس چیز سے چھو جاتا ہے اسے سونا بنا دیتا ہے۔ اسلام کسی فطری انتخاب کا تابع نہیں بلکہ وہ جس کا انتخاب کرے وہی فطرت کا انتخاب ہے۔

اسلام صلح و آشتی کا پیامبر ہے۔ مصالحت و موافقت کا حامی ہے۔ جیو اور جینے دو کا نقیب ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ قوموں کے درمیان اتحاد کی کوئی ایسی شکل پیدا ہو جائے کہ دنیا سے جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ مختلف قومیں مل کر ایک مرکزی اقتدار وجود میں لائیں جو قوموں کو تصادم سے بچالے۔ لیکن وہ مرکزی اقتدار سیاست کا سم سم نہ ہو جس میں کمزور قوموں کو مردہ سمجھتے ہوئے اپریشن ٹھیٹر میں ڈال کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ جہاں امن و صلح اور بین الاقوامی انصاف کے سارے دعووں کے باوجود کمزور قوموں کے حقوق پر ڈاکے نہ پڑیں۔ جہاں نسلی تفاخر اور قومی برتری کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ یہ ہے انسانیت کا وہ تصور جو دنیا میں امن قائم کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو دنیا کے تمام انسان ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں اور ان کی ایک برادری ایک عالمی معاشرہ اور ایک عالمی ریاست قائم ہو سکتی ہے۔

اُس تصویر اِسی تصور کی رنگوں میں ترجمانی کی گئی تھی۔ وہ تصویر اِسی تصور کی تصویر تھی۔ لوگوں کی بھیڑ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سب کبھی تصویر کو دیکھ رہے تھے کبھی مثالی انسان کو جبکہ وہ ٹکٹکی لگائے گہری نظروں سے تصویر دیکھنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔

لوگ اب یہ چاہتے تھے کہ وہ کچھ بولے۔ خاموش نہ رہے۔ اُس تصویر کی وضاحت کرے۔ اور اُس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ اُس نے مہر سکوت کو توڑا۔ اُس نے کہا۔

"یہ پاکستان کی تصویر ہے۔ جو اس سے پہلے ایک خواب تھی۔ ایک تصور تھی۔
یہ خواب زعمائے ملت مدت سے دیکھتے چلے آتے ہیں۔ اس خواب کو اِس
تصور کو شاعر مشرق نے اس تصویر میں ڈھالا ہے۔ رنگوں کی زباں سے

اُس کی تفسیر کی ہے ۔ کہ مسلمان ہندوستان میں ایک اقلیت کی زندگی بسر کرنے پر قناعت کرتے کرتے اپنی جداگانہ قومیت اور اپنے جداگانہ ملی وجود کے قیام پر مجبور ہو گئے ہیں ۔ تحفظات، مراعات اور تیقنات طلب کرتے کرتے وہ پاکستان کے داعی اور معمار بننے کی ٹھان چکے ہیں ۔"

اُس نے کہا ۔

"ہندو کانگریس کی ذہنیت وجبلت دیکھ کر شاعر مشرق مغفور کی فراست ایمانی نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا، کفر اور اسلام کا، حق اور باطل کا، جھوٹ اور صداقت کا گزر ایک ساتھ نہیں ہو سکتا ۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے یہی خواب دیکھا تھا اور بے جھجک و برملا اپنے کلام سے اِس تصور میں بیان بھی کر دیا تھا ۔ اپنے معرکہ خیز خطبۂ صدارت میں علامہ اقبال نے ہندوؤں کی ذہنیت، مسلمانوں کی نفسیات، گوشتہ اور موجودہ حالات وکیفیات، فرقہ وارانہ فسادات، انڈین نیشنل کانگرس کی متعصبانہ اور خالص ہندوانہ روش اور رویہ پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد مسلم لیگ کی اسٹیج پر پہلی بار فرمایا تھا کہ جہاں تک میں نے مسلم افکار کا مطالعہ کیا ہے میں اس بنا پر بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اگر یہ اصول فرقہ واری کے مستقل فیصلہ کی اساس قرار دیا جائے کہ ہندی مسلمانوں کو پورا پورا حق ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں اپنی ثقافت وروایات کو برقرار رکھتے ہوئے پورے طور پر آزادانہ ترقی کرنے کے مستحق ہیں تو مسلمان ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنی عزیز ترین متاع بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہیں ۔ مجھے اپنی قوم سے عشق ہے جو کہ میری حیات اور مسلک کا منبع ہے ۔ جس نے مجھے اپنا مذہب، اپنا ادب، اپنا فکر اور اپنا تمدن دے کر میرے وجود کی تشکیل میں حصہ لیا ہے ۔ اور اس طرح اپنے تمام ماضی کا احیاء کر کے زندہ اور مؤثر عوامل سے مجھے میرا موجودہ تصور بخشا ہے ۔

اُس نے کہا ۔

شاعر مشرق نے مجھے اس موضوع پر متعدد اہم اور قابل غور خطوط لکھے - جن میں سے ایک کا اقتباس یہ ہے - انہوں نے مجھے لکھا کہ میرے خیال میں واحد وفاقی ہندوستان کا تصور جو دستور جدید میں پیش کیا گیا ہے بالکل یاویس کُن ہے - مسلم صوبوں کا جداگانہ وفاق ہی وہ واحد صورت ہے جس کے ذریعہ ہم پرامن ہندوستان حاصل کر سکتے ہیں - اور غیر مسلموں کے تسلط سے مسلمانوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں - اس ملک میں شریعت اسلامی کا نفاذ ایک آزاد مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن ہے - کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبہ کا وقت آگیا ہے -

برادران ملت اس طرح انہوں نے وہ تصور وہ تصویر میرے سپرد کر دی کہ میں اس میں زندگی کی سانس پھونکوں - میں اس تصور کو قوت عمل سے زندہ کروں - اور میں کروں گا - شاعر مشرق کی طرح مجھے بھی اپنی قوم سے عشق ہے - میں نے عہد کر لیا ہے کہ تصور کے اس تاج محل کو حقیقت کے سانچے میں ڈھالوں گا - میں پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں ہر قربانی دوں گا -

عزیزان ملت ! متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ملی وجود قائم نہیں رہ سکتا - وہ اپنی تہذیب و تمدن ، رسم و رواج ، معاشرت اور معیشت ، ثقافت اور حضارت کو باقی نہیں رکھ سکتے - میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اگر وہ سو رہے ہیں تو انہیں جھنجھوڑ کر جگاؤں - اگر وہ جاگ رہے ہیں تو انہیں اٹھ کر کھڑے ہو جانے کا مشورہ دوں اور اگر وہ کھڑے ہیں تو انہیں اپنی منزل کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے پر ابھاروں - اب اگر انہوں نے زندہ رہنا ہے تو ایک مستقل بالذات قوم کی حیثیت سے ، ایک زندہ اور توانا ملت کی حیثیت سے ، ایک آزاد اور خود مختار وجود کی حیثیت سے - گو اس راستے میں انہیں بہت سی قربانیاں بھی دینا پڑیں گی - لیکن انہیں قربانی دینے سے نہ گھبرانا چاہیئے - حصول پاکستان کی مہم میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے پاکستان کا پرچم اٹھا کر میں سب سے آگے چلوں گا - میں اپنے اس فیصلہ پر چٹان کی طرح قائم ہو گیا ہوں تم عزم

کی چٹان بن جاؤ۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں تمہارا مطمع نظر کیا ہے۔ جبکہ بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔ برطانیہ کا مقصد ہندوستان پر حکومت کرنا ہے، مسٹر گاندھی اور کانگریس کی خواہش ہے کہ ہندوستان پر اور مسلمانوں پر حکومت کریں۔ میں کہتا ہوں مسلمان نہ برطانیہ کو اپنے آپ پر حکومت کرنے دیں گے نہ مسٹر گاندھی اور کانگریس کو۔ ہم دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہیئے۔"

اُس کی آواز کے خاموش ہوتے ہی انسانوں کے سمندر سے شور و شغب اور تالیاں بجانے کی آوازوں کا ایک جوار بھاٹا اٹھا۔ شور اس قدر بلند تھا کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔

تقریر ختم کر کے اُس نے تصویر کو مینار کی دیوار سے اتار لیا۔ اُس پر نقاب ڈال دیا۔ اُس کو کسی مقدس شے کی طرح سینے سے لگا لیا۔

میں نے برسوں تیری یادوں کا سہارا لے کر
تجھ کو پوجا ہے خیالوں کے صنم خانوں میں

کچھ لوگ اُس پر پھول برسا رہے تھے۔ کچھ اُسے جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ کچھ آگے بڑھ کر اُس کے قدموں کو چھو رہے تھے اور کچھ اُس کے ایک ہاتھ کو بوسا دے رہے تھے۔ اور کچھ لوگ اُس وقت بھی بغض و عناد کی بنا پر خشمناک نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ غصے سے اپنے دانت پیس رہے تھے ۔ اپنے ضمیر کی سولی پر چڑھے ہوئے تھے۔ اور اس کی تحریر و تقریر کو (Fantastic) کہہ رہے تھے۔ مصنوعی کہہ رہے تھے۔

اور پھر اتنے سارے لوگوں میں کچھ Matter of Fect قسم کے لوگ بھی تھے۔ جو کچھ عجیب سے ملگجے رنگوں میں گھُل رہے تھے۔ اور نیلگوں شام کے اندھیرے میں آسمان کے نیچے بہت سے ٹوٹے ہوئے پر تیر رہے تھے۔ جیسے ترچھی ترچھی پھواریں پڑ رہی ہوں۔ کچھ بچے اُس کو گھومتی گھومتی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور وہ نیلگوں شام کے اندھیروں میں پرانے قلعے کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جبکہ لوگوں کا ہجوم بھی اُس کے

پیچھے چل رہا تھا - اور قلعہ کے سامنے جامع مسجد کے بلند مینار پر سے موذن کی آواز سنائی دے رہی تھی -

آؤ نیکی کی طرف آؤ ——— !
آؤ فلاح کی طرف آؤ ——— !

راستے اور رکاوٹیں

پھر تیرے حسن کا چرچا سرِ بازار ہوا
پھر کوئی اہل جنوں دار پہ چڑھ جائے گا

مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت "تنظیم مسلم لیگ" ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ لیکن انڈین نیشنل کانگرس کے سامنے ابھر نہ سکی تھی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت متعدد مسلمان مفکر و مدبر یہاں تک کہ نامور علمائے دین بھی برطانوی سامراج کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے کانگرس کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ اور مسلم لیگ زمانے کی دھول میں دب کے رہ گئی تھی۔ لیکن اب جبکہ اُس مثالی انسان کی آواز نے مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا کر دی تھی اُس نے مسلم لیگ کی تاسیس کی اور اسی کے پرچم تلے حصول پاکستان کا نعرہ بلند کیا۔ تو اُس کے جواب میں انڈین نیشنل کانگرس کے ایوان سے جو آوازیں بلند ہوئیں انہوں نے پاکستان کی تکذیب کرتے ہوئے کہا۔

پاکستان کا مطالبہ ناجائز۔ نامناسب ہے۔ نامعقول ہے!!

اور اس کے ساتھ ہی کانگرس کے حامی لنگر لنگوٹ کس کر مسلم لیگ کے مقابلے میں نکل آئے۔ لیکن مثالی انسان نے ہمت کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جبکہ اُس کے اور اُس کی سیاسی جماعت کے مقابلے میں کانگرس ایسی دیو ہیکر سیاسی جماعت چٹان کی طرح رکاوٹ بن کر اُس کے سامنے ڈٹ گئی تھی۔ کانگرس کو نہ صرف ملک کے چوٹی کے مدبروں اور سیاست دانوں بلکہ کروڑ پتی سرمایہ کاروں اور راجوں مہاراجوں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ اس نے پاکستان اور اُس کے بانی کو ختم کرنے کے لیے جو کچھ اُس سے ہو سکتا تھا کیا۔

یہ مسلم لیگ اور اُس کے پرچم بردار کے لئے بڑا پر آشوب وقت تھا۔ کسے اُمید تھی کہ پاکستان ایسے نامساعد و ناسازگار حالات میں جنم لے سکے گا۔ غیر تو غیر اُس کے اپنے

ہم مذہب اُس کے خلاف نبرد آزما تھے۔ مسلمانوں کی تین چار سیاسی تنظیمیں پاکستان کے خلاف مورچہ قائم کرکے بیٹھ گئی تھیں۔ وہ اکھنڈ بھارت کی داعی تھیں۔ وہ پاکستان اور بانیِ پاکستان کو سرِعام گالیاں دیتے تھے۔ جو اُن کے منہ آتا تھا کہتے تھے۔ دو صوبوں کی وزارتیں بھی مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف تھیں اور اپنی ریشہ دوانیوں سے اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

جتنے آگے بڑھنے کے راستے تھے اُن سے کہیں زیادہ رکاوٹیں تھیں۔ نفرت و حقارت کے وہ کونسے ایسے زہریلے بچھو اور سانپ تھے جو ان راستوں میں نہ چھوڑے گئے تھے۔ زندگی کا وہ کونسا موڑ تھا جہاں خونخوار بھیڑیے اور چیتے اُس کی گھات میں نہ بٹھا دیئے گئے تھے۔ اُسے ہر روز ایسے ہزاروں خط موصول ہوتے تھے جن میں اُس کو قتل کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ لیکن اُس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے نہ ہٹے۔ مایوسی و مخالفت کے اندھیرے جتنے گھنے ہوتے گئے اُس کا عزم اور روشن ہوتا چلا گیا۔

غم کی ایک گھٹا چھٹتی تھی تو دوسری امڈ گھمڈ کر آجاتی تھی۔ ایک حادثہ ابھی گزرنے نہ پاتا تھا کہ دوسرا نمودار ہو جاتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا۔ جبکہ بے چینیوں میں اضافہ نہ ہوتا۔ کوئی رات ایسی نہ ہوتی جو کہ روتے نہ کٹتی۔ کوئی شام ایسی نہ تھی جو اپنے ساتھ اداسیوں کی سوغات نہ لائی ہو۔

اک قیامت ہے کہ ہر شام گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا نہیں نقشہ میری تنہائی کا

کوئی غیر اگر دکھ پہنچائے تو اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا کہ اپنوں کے دکھ دینے سے دکھ ہوتا ہے۔ منصور حلاج دار پر کھچا ہوا تھا۔ لوگ اُسے پتھر مار رہے تھے۔ منصور کا ایک دوست اُدھر سے گزرا تو لوگوں کی دیکھا دیکھی اُس نے پتھر تو نہ مارا منصور کو پھول مار دیا تو اُس نے کہا

"تمہارے اِس پھول نے ان پتھروں سے زیادہ چوٹ لگائی ہے"

وقت کی بات ہے نظر والو
ہم پہ اپنوں نے بہت ظلم کئے

راستے کا وہ کونسا پتھر تھا جو دشمن نہ بنا تھا - وہ کونسی دیوار تھی جو اوپر گر جانے کی دھمکیاں نہ دے رہی تھی - وہ کونسی چھت تھی جو عفریت و آسیب بن کر نہ جھانک رہی تھی - وہ کونسا دروازہ تھا جو کسی آفت کا دہانہ نہ بن گیا تھا -

لیکن اس کے پائے استقلال میں ذرا فرق نہ آیا - اس کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی - وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر رہا تھا - جن کی ذات مبارک قیامت تک اولاد آدم کے لئے اسوۂ حسنہ ہے - جو عالم انسانیت کے لئے فضائل و مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ تھے - صاحب خلق عظیم، خلق القرآن - جو کتاب مرقوم کا ایک ظل مجسم اور اس کے عملی نمونے کی ایک لوح محفوظ تھے - وہ جنہوں نے فرمایا - "میں خانہ نبوت کی آخری اینٹ ہوں" - وہ معلم اخلاق بھی تھے اور مقنن آئین و قانون بھی - ان کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی - وہ صاحب سیف بھی تھے اور صاحب قرآن بھی -

اور یہ وہ تلوار ہے جو اب تک کسی کمزور پر نہیں اٹھی اور نہ آئندہ کبھی اٹھے گی - یہ وہ تلوار ہے جس نے مظلوم انسانوں کا کبھی خون نہیں بہایا بلکہ ان کے خون کا ظالموں سے قصاص لیا ہے - یہ وہ تلوار ہے جو زمین و زندگی کے امن و سلامتی کو برباد اور قوموں کے سکون و راحت کو غارت نہیں کرتی - جو انسانوں کو حلال کرنے کا نہیں حرمت جاں کا درس دیتی ہے - جو انسانوں کے قدرتی حقوق اور ملتوں کی آزادی و خود مختاری کی حفاظت کرتی ہے - یہ الگ الگ عنصروں کو تسویہ و اعتدال کے ساتھ اس طرح ترکیب دیا کرتی ہے کہ اس کی ہر ضرب پر قانون کا عدل اور اخلاق کا رحم دونوں باہم مل جاتے ہیں - اور نظام انسانی کا ایک صحیح و صالح مرکب پیدا ہو جاتا ہے - یہ تلوار زمین و زندگی پر تباہی و بربادی کا پیغام بن کر نہیں، رحمت اور سراسر رحمت بن کر نازل ہوئی ہے - اس کی ہر ضرب شریعت حقہ البیضاء ہے -

تو پھر ایسی صورت میں جبکہ اس کے ہاتھ میں یہی تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھا

وہ مصیبتوں اور آفتوں کے سیلاب سے کیسے خائف ہو سکتا تھا۔ اُس نے پر آشوب راستوں اور رکاوٹوں پر مسکراتے ہوئے کہا۔

" انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اسے اسلام ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے۔ اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں۔ اور تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں۔ اگر دیکھنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجئے کہ ہمارے پاس "سراج منیر" کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے۔ ہم نے جو کچھ لیا ہے۔ جو کچھ سیکھا ہے، اسی روشنی سے لیا اور سیکھا ہے۔ ہمارے عقائد میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی درسگاہ سے حاصل کیا گیا ہو جامعہ اسلامیہ کے علاوہ اور کسی جامعہ سے سیکھا گیا ہو ایک کفر صریح ہے۔

اسلام انسان کے لئے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا ہے اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لئے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی تعلیم توحید میں نہایت غیور ہے۔ اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل نہیں۔

مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی۔ سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دینوی حاکمانہ ہو یا محکومانہ وہ ہر زندگی کے لئے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلام دنیا کا آخری و عالمگیر مذہب نہ ہوتا وہ خدا کی آواز ہے اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقہ درس ہے۔ جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین، حادی بحر و بر اور اسی طرح کے دوسرے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا کہ وہ ایک روشنی ہے اور روشنی جب نکلتی ہے تو تاریکی دُور ہو جاتی ہے خواہ وہ مذہبی گمراہیوں کی ہو خواہ سیاسی۔ بیشک ہمارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور ہر بات کو بیان کرنے والی

کتاب آئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعے سے سلامتی کے راستوں پر ہدایت کرتا ہے۔ اور ہر طرح کی گمراہی و تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا ہے۔ اور صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔

دنیا میں کون سی ایسی کتاب ہے جس نے خود اپنی زبان سے اپنی نسبت ایسے عظیم الشان دعوے کئے ہوں۔ اسلام وہ ہادی ہے کہ سلامتی کی تمام راہوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور اگر مسلمانوں کے سامنے سیاسی اعمال کی بھی کوئی راہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سلامتی ان کو قرآن کریم سے نہ ملے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری سیاسی گمراہیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دست راہنما کو اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا۔ ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔ آخر میں کہہ دیا کہ وہ صراط مستقیم پر لے جانے والی کتاب ہے۔ اور صراط مستقیم کی اصطلاح قرآن کی زبان میں ایسی جامع و مانع ہے کہ ساری دنیا اسی کے اندر ہے۔ تو پھر ساری دنیا خواہ ہمارے خلاف ہی کیوں نہ ہو ساتھیو اس سیدھے راستے پر اور آگے بڑھو۔ مل کر قدم اٹھاؤ۔

ہم نئی زندگی کے مطرب ہیں
زمزمے ولولوں میں ڈھالیں گے
اپنے سازِ طرب کی تانوں سے
تیرہ ماحول کو اجالیں گے
مردہ جسموں فسردہ نبضوں میں
روح پھونکیں گے جان ڈالیں گے
وہ سنو موت کے حصاروں سے
زیست آواز دے رہی ہے ہمیں
توڑ کر ہر طرح کی زنجیریں
ساتھیو آؤ مل کے آگے بڑھیں

اور اُس کے ساتھیوں نے اُس کی آواز پر لبیک کہا۔ مخدوش راستوں کی مہیب رکاوٹوں کے باوجود اُس کے ساتھی، پاکستان کے متوالے و متلاشی، اُس کے ہم قدم اُس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ وہ جُوں جُوں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے ان کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز ہوتی چلی گئی اور اُن کی تعداد بھی حیرت انگیز حد تک بڑھنے لگی۔ جس طرح برسات کے موسم میں ندی نالے ہر رکاوٹ کو روندتے ہوئے اپنے سیلاب میں چاروں طرف سے پھوٹ نکلتے ہیں اور بستیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے اور راستوں اور رکاوٹوں کے ہر حصار کو توڑتے ہوئے اُس دریائے پرجوش سے آگے ملتے جا رہے تھے۔

اس کے باوجود اُس کے دشمن و مخالفین ششدر و حیران تھے وہ اپنی ہٹ نہ چھوڑ رہے تھے۔ اپنے خبث باطن کی دھند کو روشنی کے اُس طوفان سے اجالنے کی پرواہ نہ کر رہے تھے۔ وہ بدستور بپھرے ہوئے تھے، غرّا رہے تھے۔ گرج چمک رہے تھے۔ ان کا ذاتی بغض و عناد نشتر و خنجر بن کر برس رہا ہے۔ اُن کی پھواریں اُن کے چھینٹے زہر میں گھلے ہوئے تھے۔

پاکستان کا وہ مثالی انسان۔ ایک دن شہر اسلام میں مسلم لیگ کے ایک عظیم اجتماع میں عزیزان ملت سے خطاب کر رہا تھا۔ جلسہ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں منعقد تھا۔ جبکہ عین اُسی وقت ایک مسلم مخالف تنظیم دہلی دروازے کے باغ میں مسلمانوں کے اُس اجتماع عظیم کے خلاف دل میں تخریبی و متشدد عزائم لئے جلسہ کر رہی تھی۔

اس جلسہ میں چالیس پچاس خاکی پوش، بیس پچیس سرخپوش اور کچھ اتحادی پارٹی کے کارکن موجود تھے۔ جلسہ میں خاکی پوشوں کے لیڈر نے تقریر کی۔ اپنی تحریک کے آئین پر روشنی ڈالی۔ اور اُس کے بعد آمادہ تخریب و تشدد ان لوگوں کے ساتھ دہلی دروازہ سے اسلامیہ کالج کی طرف مارچ کیا۔ اُس کی تنظیم کے خاکی پوشوں نے سروں پر کفن لپیٹ رکھے تھے۔ ارادہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کے اجلاس میں ہنگامہ کریں۔ دھاوا بول دیں۔

وہ سب اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں پہنچے۔ ایک خاکی پوش نے مبارک مسجد میں اذان دی حالانکہ اذان کا وقت گزر چکا تھا۔ اُس کی اُس تنظیم کے رضاکار اپنے لیڈر کے ہمراہ اپنے سالار کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہو گئے۔ اور اسٹیج پر پہنچ گئے۔

پاکستان کا معمار اعظم اُس وقت تقریر کر رہا تھا۔ اُس نے مخالف تنظیم کے لیڈر سے اسلامی رواداری واخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اور بیٹھ جانے کے لئے کرسی پیش کی۔

اس موقعہ پر جلسہ گاہ میں جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ حاضرین جلسہ نے مخالف تنظیم کے لیڈر سے استدعا کی کہ وہ پرامن طریقے پر بیٹھے رہیں۔ لیکن وہ تو اتحادی پارٹی کے اشارے پر فتنہ وفساد برپا کرنے کا تہیہ کر کے جلسہ گاہ میں آئے تھے۔ بار بار یہ اصرار کرنے لگے کہ وہ تقریر ضرور کریں گے۔ لیکن وہ اس کے مجاز نہ تھے۔ مسلم لیگ کا اجلاس ہو رہا تھا کسی غیر تنظیم کو اور پھر تنظیم بھی وہ جو مخالف ہو، مسلم لیگ کی سٹیج پر تقریر کرنے کی اجازت نہ دی جاسکتی تھی اور نہ اتنا وقت تھا کہ اپنے ضروری مسائل کو چھوڑ کر لوگ ان کی تقریر سننے کو تیار ہو جاتے۔ مخالف تنظیم کے لیڈر کو تقریر کرنے کا موقع نہ ملا۔

جلسہ ختم ہوا تو مخالف تنظیم کے رضا کار دھاندلی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ جس پر لوگوں نے شامیانہ اکھاڑ دیا۔ رضا کار اور ان کے لیڈر شامیانے کے نیچے دب گئے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے طلبا نے ان کو شامیانے کے نیچے سے نکالا اور ان کی خدمت میں عرض کی کہ وہ پرامن طور پر نکل جائیں۔ لیکن ہنگامہ پسند ہنگامہ کرنے سے باز نہ آئے۔ اس پر مسلمانوں کا مشتعل ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ مسلمانوں نے ان کو خوب پیٹا۔ مخالف تنظیم کا لیڈر جان بچانے کے لئے بھاگ نکلا۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ چنانچہ مسلم طلبا پھر آڑے آئے۔ اور انہوں نے مخالف تحریک کے لیڈر کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ لیکن عوام اُس وقت اتنے جوش میں آرہے تھے کہ آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ مشتعل ہجوم دروازہ اور کھڑکیاں توڑ کر کمرے میں جا گھسا۔ مخالف تنظیم کے لیڈر اور اُس کے رضا کاروں کو آگے دھر لیا۔ اور ایسے رُدے لگائے کہ خدا کی پناہ۔ ان کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے۔ کمرے میں ایک جگہ چونے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لوگوں نے وہی چونا ان کے منہ اور نتھنوں میں ٹھونسا۔ مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اور پھر نہ جانے کیا ہو جاتا کہ اچانک پولیس آگئی۔ اور وہ پٹنے والوں کو بچا کر باہر لے گئی۔ جبکہ عوام ہال کے سامنے کھڑے نعرے لگا رہے تھے اور سیاپا کر رہے تھے۔

"غنڈی ٹولی ہائے ہائے"

"ٹوڈی بچہ ہائے ہائے"

پولیس اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی اجازت سے اندر داخل ہوئی تھی - پٹنے والے مظاہرین کے چنگل سے نکل کر چھوٹے سے ایک جلوس کی صورت میں شہر کی طرف روانہ ہوئے تو مظاہرین بدستور ساتھ ساتھ سیاپا کرتے جا رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔

یہ جلوس جب شہر اسلام کے مشہور دروازے بھاٹی دروازے کے باہر پہنچا تو لوگوں نے پھر ان کے لیڈر کو گھیر لیا۔ کپڑے پھاڑے - آوازے کسے - نعرے لگائے۔ سیاپا کیا۔ مطالبہ پاکستان بدن بدن زور پکڑتا جا رہا تھا۔ یہ تحریک رائی سے پہاڑ بنتی جا رہی تھی - اب تو مقتدر علمائے کرام روحانی رہنما ، سجادہ نشین اور صاحبِ جاہ و حشم لوگ بھی اس کی حمایت میں آواز بلند کرنے لگے تھے۔

ایک مقتدر عالم نے فرمایا۔

"مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ جہاد آزادی میں اشتراک عمل اس شرط سے جائز ہے کہ حکم اہل شرک غالب نہ ہو۔ مسلمان مشرکین کے جھنڈے تلے نہ ہوں۔ بلکہ مشرکین اسلامی جھنڈے کے نیچے ہوں۔ اب فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ میں ہے کہ کانگرس میں اس وقت حکم شرک غالب ہے یا حکم اسلام؟"

مولانا موصوف نے پاکستان کے بارے میں فرمایا۔

"تمام ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنانا موجودہ حالت میں کسی طرح ممکن نہیں۔ تو کم از کم ان صوبوں کو جہاں مسلم اکثریت ہے اسلامی سلطنت بنا لینا کہ وہاں اسلامی سلطنت اسلامی اصول پر قائم کی جا سکے لازم اور ضروری ہے۔ اور اس کی نظیر مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت ہے۔ جبکہ مکہ معظمہ میں اسلامی حکومت اور اسلامی نظام قائم نہ ہو سکا۔ تو مدینہ منورہ کو مرکز بنایا گیا۔ پھر اسی مرکز سے اسلام کو ترقی ہوئی۔ اسی طرح کیا عجب ہے کہ پاکستان سے بھی اسلام کو ترقی ہو۔"

ایک اور مفسر و مترجم قرآن ، شارح حدیث نبوی۔ ہر اعتبار سے جامع و مستند شخصیت نے فرمایا۔

"کانگرس کے دائرے میں جہاں ہندو عناصر کے کھلے غلبہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مٹھی بھر مسلمان داخل ہو کر کیا یہ امید کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات میں ان سب کو راہ راست پر لے آئیں گے۔ لیکن مسلم لیگ کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے معاملات میں راہ راست پر چلے گی۔ کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت ہے۔ آج ہندوستان میں مسلم لیگ کلمہ گو مسلمانوں کی جماعت اور غیر مسلم قوموں کی نسبت ہم سے قریب تر ہے اور ہمارے لئے مفید تر ہے۔ اس کے قائدین بھی پہلے کی نسبت ذرا احتیاط سے کام کرنے لگے ہیں"۔

ایک اور مفکر و مدبر ملت نے دیوبند کے ایک عظیم الشان اجتماع میں کہا۔

"میں ایک عرصہ سے عافیت نشین تھا۔ اور میری طویل علالت و خرابی صحت کا اقتضیٰ بھی یہی تھا۔ لیکن آج ملت اسلامیہ ایسی جدوجہد سے دوچار ہے۔ اس کے نتائج و عواقب اس قدر اہم ہیں جو مجھے اس بیماری کی حالت میں بھی سیاست میں کھینچ لائے ہیں۔ تحریک خلافت کے بعد سے میں سیاست سے کنارہ کش ہوں لیکن عرصہ دراز کی کاوشوں اور غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر حصول پاکستان کے لئے میرے خون کی ضرورت ہو تو میں اس راہ میں اپنا خون دینا باعث افتخار سمجھوں گا۔ اور اس سے ہرگز دریغ نہ کروں گا۔ اس ملک ملت اسلامیہ کا وجود و بقا اور مسلمانوں کی باعزت زندگی قیام پاکستان سے وابستہ ہے۔ میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھوں گا اگر اس مقصد کے حصول میں کام آ جاؤں"۔

ایک اور مقتدر و ممتاز سیاست دان نے حصول پاکستان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر جناح ہی ایک ایسے لیڈر ہیں جو مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ صحیح معنوں میں قائد اعظم کہلانے کے حقدار ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش وہی ہے جو انسانیت کے عظیم المرتبت نجات دہندہ حضرت عیسیٰ کی ہے۔ اسی کی برکت ہے کہ وہ مسلمانان ہند کے سیاسی مسیحا ہیں"۔

ایک اور جلیل قدر سیاست دان نے کہا -

"حصولِ اقتدار کے لیے کانگریس نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے - اس کی پالیسی دھمکیوں اور انتہائی چاپلوسیوں سے مرتب ہے - مگر مسلمان کانگرسی ہتھکنڈوں کو خوب سمجھ گئے ہیں - میں برطانوی حکومت کو متنبہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو تسلیم نہ کیا گیا تو اسلامی ہند مکمل طور پر بغاوت کر دے گا۔"

حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں بلند ہونے والی ائمہ فکر کی آوازوں میں روحانی دنیا کے پیشواؤں اور سجادہ نشینوں کی آوازیں بھی شامل تھیں - پیروں، سجادہ نشینوں، صوفیوں اور روحانی پیشواؤں کا ایک اہم اجتماع پشاور میں ہوا - اس جلسہ میں قرارداد منظور ہوئی جس کی جھلکیاں درج ذیل ہیں -

* - اس وقت مسلمانوں کو اتحاد کی ضرورت ہے - ہر مسلمان کو حصولِ پاکستان کے لیے پوری جدوجہد کرنی چاہیئے -
* - حصولِ پاکستان کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا کہ ہر مسلمان مسلم لیگ میں شریک ہو کیونکہ صرف مسلم لیگ ہی ایک ایسی جماعت ہے جو صرف اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور آزادی کے لیے کوشاں ہے -
* - اس وقت ہندوستان میں سب سے زیادہ ضروری اور اہم سب کی توجہ کے قابل یہ مسئلہ ہے کہ مسلم لیگ کی واحد نمائندگی کے دعوے میں ہم پورے اتر جائیں اور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت قائم و برقرار رہ جائے -
* - میں خانقاہوں کے سجادگان سے اپنے جدامجد شیخ الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی خواجہ غریب نواز کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی اپنی گدیوں کو چھوڑ کر اس نازک وقت میں اسلام کی خدمت کے لیے نکل پڑیں - اور مسلم لیگ کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے کمر باندھ کر میدان میں آجائیں -
* - اس وقت مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور پاکستان مسلمانانِ ہند کا بہترین نصب العین ہے -

ایک اور صاحب طریقت بزرگ نے فرمایا۔

* - میں نے اپنی جماعت کے لوگوں کو فتوے دے دیا ہے کہ وہ سب مسلم لیگ کا ساتھ دیں۔
* - صوفیان کرام اور صلحائے عظام کی بہت بڑی اکثریت مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کی حامی ہے۔
* - کانگرس اور اس کی جدوجہد آزادی کا دوسرا نام رام راجیہ ہے۔ برصغیر کے ۱۲ کروڑ مسلمان رام راجیہ میں نہ رہ سکیں گے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ برطانوی سامراج دوسری جنگ عظیم میں اپنے حریف نازی ازم اور فاشزم کو پچھاڑ کر اتنا کمزور اور درماندہ ہو گیا تھا کہ جانکنی کے عالم میں تھا۔ نازیت کے عفریت کو اُس نے اپنے اتحادیوں کی مدد سے ہلاک تو کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی برطانوی امپیریل ازم کی جڑ و بیخ ہل گئی تھی۔ اُس نے ہٹلر اور اُس کی ہٹلریت کے خون آشام کو اپنا خون پلا کر ہمیشہ کی نیند سلا تو دیا تھا لیکن اُس کے اقتدار کے بلڈ بینک میں فالتو خون کی ایک بوند بھی نہ رہی تھی۔ برٹش ایمپائر کے خون میں اتنی کمی ہو گئی تھی کہ اُسے اپنی زندگی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ وہ انیمیا کے مریض کی طرح پیلا زرد ہو رہا تھا۔ اُس نے دوسری جنگ عظیم میں جو زخم کھائے تھے کافی دیر تک اُن کے مندمل نہ ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ جرمنی کے شہ زور دیو کو دبوچ کر اُس نے ختم تو کر دیا تھا لیکن اقتصادی طور پر اُس کا اپنا بھی دیوالہ نکل چکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم ہز رائل میجسٹی کی تابوت میں ایک عبرتناک کیل کی طرح ٹھک گئی تھی۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا تو ضرور تھا لیکن ڈگمگا رہا تھا۔ وہ سانس تو لے رہا تھا لیکن اُس کی ہر سانس سانسے میں آ رہی تھی۔ اس کی حیثیت اُس وقت سیاسیات عالم کی بساط پر اپنے حریف کو مات دینے کے باوجود مات کھائے ہوئے ایک مہرے کی تھی۔

اپنی نوآبادیات خاص کر ہندوستان کو اُن ناسازگار و ناموافق حالات میں اب زیادہ دیر محکوم رکھنا اُس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ حکومت برطانیہ نے ہندوستان کو ان حالات میں آزادی دے دینے کی ٹھان لی جن سے ہندوستان اور اُس میں بسنے والی قومیں دوسری جنگ عظیم کے مہلک اثرات سے بھی زیادہ متاثر ہو رہی تھیں۔ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین

نیشنل کانگرس کی صد سالہ سیاسی سرگرمیوں اور آزادی کے خون ریز مطالبوں نے اس کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ ملک کی دوسری سب سے بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ بھی آزادی کے ساتھ قیامِ پاکستان کا مطالبہ کر رہی تھی اور مسلمان قوم کی اکثریت، سوادِ اعظم اس کے ہلالی پرچم تلے مجتمع ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور کئی سیاسی تنظیمیں اور فرقہ وارانہ جماعتیں اور مذہبی پارٹیاں کسی اندرونی مذہبی و سیاسی انتشار میں مبتلا تھیں اور انتشار پھیلا رہی تھیں۔ ہر طرف سے اس کے کانوں میں پڑتی ہوئی "ہندوستان چھوڑ دو۔ ہندوستان چھوڑ دو" کی بھیانک آوازیں اس کے لیے کابوسی خواب بن گئی تھیں۔

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کو آزاد کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ کانگرس ہندوستان میں صد سالہ برطانوی عہدِ اقتدار کی سخت دشمن تھی برطانوی حکومت اندر سے کانگرس کی طرف دار تھی۔ اور جہاں تک ہندوستان کو آزاد کرنے کا تعلق تھا وہ چاہتی تھی پورے کا پورا ہندوستان کانگرس کے اربابِ بست و کشاد کو سونپ دے لیکن اب جبکہ اس مثالی انسان نے مسلم لیگ کا پرچم بلند کرتے ہوئے ہندوستان کے بٹوارے کا مطالبہ کر دیا تھا اور اس کی آواز میں پوری مسلمان قوم کی آواز شامل تھی۔ انگریز کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان کی باگ ڈور صرف کانگرس کے ہاتھ میں تھما کر چلتا بنے۔ اس کے لیے یہ ناگزیر ہو گیا کہ ہندوستان کی حکومت کانگرس کے کاسۂ سیاست میں ڈال دینے سے پہلے جن جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں وہاں استصوابِ رائے عامہ کرا کر یہ معلوم کیا جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت مشترکہ ہندوستان چاہتی ہے یا پاکستان۔

یہ اعلان پاکستان دشمن سیاسی تنظیموں اور جماعتوں کے لئے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی بات تھی۔ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف بھرپور اعلانیہ اور درپردہ سازشیں شروع کر دیں۔ آزپاکستان کے مثالی انسان نے دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں کی طرح صوبہ سرحد کا بھی دورہ کیا۔ جس کی روداد بیان کرتے ہوئے اس وقت کے اردو روزناموں نے لکھا۔

"آج سرحد کے مسلمانوں نے وہ مناظر دیکھے کہ اسلامی حکومت کا جاہ و جلال

نظر میں پھر گیا۔ پشاور کی قسمت بیدار ہو گئی۔ سرحد کے غیور مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اسلام پر سب کچھ فدا کر ڈالنے کو تیار ہیں۔ سرحد کے مسلمانوں نے اغیار کے تمام کذب وافترا کی دھجیاں اڑا دیں۔ وہ اپنے محبوب قائد کے کس درجہ فدائی ہیں۔

علی الصبح پشاور میں نئی زندگی کے آثار ہر طرف نمایاں ہوتے۔ مسلمان اپنا اپنا بہترین لباس زیب تن کئے۔ اپنے محبوب قائد کے دیدار کے لئے بیتاب نظر آرہے تھے۔ نئے شہر سے پرانے شہر کے آخری سرے تک تمام سڑکیں موسم بہار کے چمن کی طرح نکھری، سجی اور مہکی ہوئی تھیں۔

ایک سو سے زیادہ عظیم الشان دروازے سڑکوں پر لگائے گئے تھے۔ ہر بازار ایک نمائش گاہ معلوم ہوتا تھا۔ بالاخانوں کو قیمتی سامان آرائش سے سجایا گیا تھا۔ سارا شہر دلہن کی طرح آراستہ پیراستہ نظر آرہا تھا۔

ہزاروں کی تعداد میں مسلمان سڑکوں پر باادب دو رویہ کھڑے ہوئے تھے۔ قوم کی کشتی کے ناخدا کے دیدار کرنے کو بے چین تھے۔ بالاخانوں کی چھتوں پر یہ عالم تھا کہ بیشمار مسلمان پھولوں کے ڈھیر لگائے محبوب قائد کی سواری کا انتظار کر رہے تھے۔ جس کی یہ شان تھی کہ آگے آگے شتر سواروں کا رسالہ چلا آرہا تھا۔ اس کے پیچھے گھوڑ سوار تھے۔ پھر موٹروں کی قطاریں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کا طویل سلسلہ جاری تھا۔ اور پھر فرزندان اسلام کے سر بکف نیشنل گارڈ کی پرشکوہ فوج۔ جن کی تعداد دو ہزار سرفروشوں سے زیادہ تھی۔ اور پھر قائداعظم کی سواری تھی۔ جس کے منظر نے مسلمانوں میں ایک عجیب روح پھونک دی تھی۔ یہ جلوس دو میل سے زیادہ لمبا تھا۔ سواری پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ قائداعظم کی خدمت میں تحفے اور نذرانے پیش کئے جا رہے تھے۔

اہالیان پشاور نے کبھی اس قدر لمبا اور پرجلال جلوس نہ دیکھا تھا۔ قائداعظم ایک کھلی کار میں تشریف فرما تھے۔ موٹر آہستہ رفتار سے چل رہی تھی۔ "قائداعظم زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے فضائیں گونج رہی تھیں۔

اس کے بعد رسم پرچم کشائی ہوئی۔ فضا میں ہلالی پرچم لہرایا۔ بندوقوں اور رائفلوں نے فائر کئے گئے۔ اس کے بعد نیشنل گارڈ نے سلامی دی۔ لوگوں نے نعرے لگائے۔

"جھنڈا اونچا رہے ہمارا"۔

"قائداعظم زندہ باد"۔

"پاکستان زندہ باد"

قائداعظم شیروانی اور شلوار میں ملبوس تھے۔ سر پر قراقلی کی ٹوپی تھی۔ اس موقع پر قائداعظم نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"آج رات کو میرے سامنے انسانوں کے اس سمندر نے مجھے باور کرا دیا ہے کہ مسلمانوں میں اب زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ حالات کی نزاکت کا ان کو پورا احساس ہو چکا ہے۔ جو ہندوستان میں اس وقت مسلم قوم کو درپیش ہیں"۔ پچھلی دفعہ میں ۱۹۲۶ء میں پشاور آیا تھا۔ اس وقت میں نے یہاں دس دن قیام کیا تھا۔ پھر نو برس کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں بالکل واضح طور پر اس تبدیلی کو دیکھ رہا ہوں جو اس صوبہ میں اس عرصہ میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کانگرس نے جو جادو کیا تھا وہ ٹوٹ گیا اور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اب آپ کانگرس کے جال سے ہمیشہ کے لئے نکل چکے ہیں۔ اس سے پہلے یہاں لیگ کی کوئی تنظیم نہ تھی لیکن ہم کام کرتے رہے تاآنکہ آج ہندوستان کا ہر مرد، ہر عورت، بچہ اور بوڑھا یہ سمجھتا ہے کہ صرف مسلم لیگ ہی وہ جماعت ہے جو دس کروڑ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ ہمارا کوئی دوست نہیں۔ نہ انگریز ہمارے دوست ہیں اور نہ ہندو۔ ہمیں یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمیں ان دونوں سے جنگ کرنی ہے"۔

یہاں لوگوں نے تالیاں بجائیں اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

قائداعظم نے فرمایا۔

"اگر یہ دونوں قسم کے بنیئے ہمارے خلاف متحد ہو گئے تو بھی ہم ان کی

متحدہ قوت کے خلاف نبرد آزما ہوں گے ۔ انشاء اللہ آخر میں فتح ہماری ہوگی"۔

اور پھر وہ وقت بھی آگیا جبکہ ملک میں مسلم لیگ کے انتخابات ہوئے ۔ ووٹ کے ذریعے سے مسلمانوں سے ان کی رائے لی گئی کہ وہ اکھنڈ ہندوستان چاہتے ہیں یا پاکستان ؟"

اس کا جواب مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کی سو فیصدی کامیابی تھی ۔ جو دنیا کی سیاسی تاریخ میں پہلی بار مسلم لیگ کو حاصل ہوئی تھی ۔

یوم فتح پر قائداعظم نے یہ اعلان کیا ۔

" میں مسلمانان ہند کو اس شاندار فتح پر مبارکباد دیتا ہوں ۔ جو انہوں نے پورے ہندوستان میں سو فیصد مسلم نشستیں حاصل کر کے پائی ہے ۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اکثر مخالف امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئی ہیں ۔ خواہ وہ نام نہاد قوم پرور مسلمان تھے ۔ اس تعجب خیز شکست سے ہمارے مخالفین کو یہ احساس ہو جانا چاہیئے کہ اب وہ مسلمانوں میں انتشار نہ پھیلائیں ۔ جسے ہندو کانگرس پریس اور اس کے غیر محدود اقتصادی وسائل تقویت دے رہے ہیں ۔ یہ مطالبہ پاکستان کے لئے مسلمانان ہندوستان کا صاف فیصلہ ہے اور اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ صرف مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی ذمہ دار نمائندہ جماعت ہے ۔ اور کانگرس سوائے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے مسلمانوں یا ہندوستان کے کسی فرقہ کی نمائندگی نہیں کرتی ۔ ہندو سبھا جو کانگرس کی ایک شاخ تھی ہوا میں بھاپ بن کر اڑ گئی ہے اور یہ بات یقین کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے کہ ہندو سبھا ایک ہی سکہ کا دوسرا رخ تھا ۔ جس کا مقصد نازک مواقع پر مسلم مطالبہ کے خلاف لارڈ سپیکر بننا تھا"

اس شاندار کامیابی پر ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء بروز جمعہ یوم جشن منایا گیا ۔ اس دن جلسے کئے گئے ۔

زلف و مقراض

مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ نے سو فیصدی کامیابی حاصل کی۔ کانگرس کو اس کی امید نہ تھی وہ سہم گئی۔ اس نے اس کامیابی کی توجیہہ یہ کی کہ مرکزی اسمبلی کے رائے دہندگان سرمایہ دار تھے اور مسلم لیگ سرمایہ داروں ہی کی جماعت ہے لہٰذا وہ کامیاب ہو گئے۔ اس کے برعکس صوبائی مجالس آئین ساز کے رائے دہندگان عوام ہوں گے، وہ مسلم لیگ کو ٹھکرا دیں گے۔ اور کانگرس کے دامن دولت سے اپنی قسمت وابستہ کریں گے۔

کانگرس کی ایک مقتدر شخصیت نے کہا۔

"مجالس آئین ساز میں ہم ہر مسلم نشست پر مقابلہ کریں گے۔ اور غیر معمولی کامیابی حاصل کریں گے۔"

اور پھر انہوں نے مسلم لیگ کی حریف مسلم سیاسی جماعتوں سے پر زور اپیل کی کہ وہ منظم ہو کر ایک وجود بن کر مسلم لیگ کا مقابلہ کریں۔

جیسے ہی صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کا زمانہ قریب آیا یہ جماعتیں پوری مستعدی اور سرگرمی سے میدان عمل میں اتر آئیں۔ انہوں نے مسلم لیگ کے راستے میں کانٹے اور پتھر بچھائے۔ چاقوؤں اور خنجروں سے وار کئے۔ کانگرس کے ہوا خواہوں نے کیا کچھ نہ کیا لیکن کامیابی مسلم لیگ ہی کو نصیب ہوئی۔ تمام صوبوں کے نتائج شائع ہوئے تو تمام دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں یا کانگرس کے۔ وہ اکھنڈ ہندوستان چاہتے ہیں یا پاکستان؟

۱۱ر جنوری ۱۹۴۷ء کا دن وہ دن تھا جبکہ مسلمانوں نے ہر شہر، ہر قریہ اور ہر مقام پر پورے جوش و خروش کے ساتھ جشن فتح منایا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اپنی بے نظیر تنظیم، بے نفسی اور اخلاص ملی کا ثبوت دیا۔ ان کے سامنے سیم و زر کی تھیلیاں رکھی گئیں لیکن انہوں نے ٹھکرا دیں۔ ان کے سامنے جاہ و منصب کی رشوت

پیش کی گئی لیکن انہوں نے مسترد کر دی ۔ ان کی غربت و افلاس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو دہشت زدہ اور مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی لیکن تار عنکبوت کی طرح بودی اور کمزور ثابت ہوئی ۔

۲۵ر مارچ ۱۹۴۶ء کو برطانیہ کی کابینہ کا ایک وفد ہندوستان پہنچا ۔ جس میں دور حاضرہ کے بے مثال سیاست داں، مبشر و مبصر، مفکر و نکتہ داں شامل تھے ۔ وفد کا مقصد اس وقت کے برطانیہ کے وزیر اعظم کے الفاظ میں یہ تھا کہ ہندوستان کو آزادی کے حصول میں پوری پوری مدد دی جائے ۔

وفد نے دہلی پہنچتے ہی ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے ارباب بست و کشاد سے گفت و شنید شروع کر دی ۔ ایک عرصہ تک یہ گفتگو دہلی میں ہوتی رہی پھر وفد نے اپنی صوابدید پر شملہ میں ایک سہ پارٹی کانفرنس منعقد کی جس میں مسلم لیگ اور کانگریس کے نمائندے شریک تھے ۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔ ۱۲ر مئی ۱۹۴۶ء کو شملہ کانفرنس کی ناکامی کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا ۔ اس سلسلے میں جو سرکاری کمیونک شائع ہوا اس میں درج تھا کہ سہ پارٹی کانفرنس ختم ہو گئی ۔ لیکن کانفرنس کے خاتمہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ملک معظم کی حکومت نے جو کام شروع کیا تھا وہ ختم ہو گیا ہے ۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ دونوں اہم پارٹیاں ہندوستان کے اتحاد یا تقسیم کے مسئلہ پر کسی متفقہ نتیجے پر پہنچ جائیں لیکن ایسا نہیں ہو سکا ۔ ہم نے طے کیا ہے کہ ہندوستان کی آئندہ آئین کی تشکیل کے انتظامات فوراً کئے جائیں اور عارضی حکومت بھی فوری طور پر قائم کر دی جائے ۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ عوام کے چھوٹے بڑے ہر طبقہ کے ساتھ انصاف ہو مسلم لیگ کے علاوہ سب کی خواہش ہے کہ ہندوستان متحد رہے لیکن ہم نے ہندوستان کی تقسیم کے امکان کی اچھی طرح تحقیق کی ہے ۔ مسلم لیگ کے دعویٰ کے مطابق ایک جداگانہ بالادست پاکستانی ریاست ہونی چاہیئے ۔ جو دو رقبوں پر مشتمل ہو ۔ مسلمانوں کے ان حقیقی خدشات کی طرف سے بھی ہماری آنکھیں بند نہیں کہ ان کا تمدن اور ان کی سیاسی و سماجی زندگی ایک ایسے متحدہ ہندوستان میں مدغم ہو جائے گی جس میں ہندوؤں کی زبردست اکثریت اور غلبہ ہے ۔

اور پھر وہ وقت بھی آ گیا عبوری حکومت کی تشکیل میں مسلم لیگ بھی شامل ہوئی ۔ ۲۰ر ستمبر

۱۹۴۶ء کو کانگریس کی عبوری حکومت چارج لینے والی تھی کہ ملک میں خونیں فرقہ وارانہ فساد کلکتہ سے شروع ہو گئے۔ کسے معلوم تھا کہ تاریخ کا یہ انقلاب خونیں حروف سے لکھا جائے گا۔ مسلم لیگ کی کامیابیوں کو دیکھ کر جو زہر مخالفین کے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کو ہوا دینے میں نکالنا شروع کیا۔ قائدِ اعظم نے ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو اعلان کیا تھا کہ ۱۶ر اگست کو ہندوستان کے طول و عرض میں "یوم راست اقدام" منایا جائے گا اور جب یہ دن منایا گیا تو ایک جلوس نکالا گیا۔ جب یہ جلوس کالج اسٹریٹ پہنچا تو ہندو بلوائیوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ بس پھر بلوہ عام ہو گیا۔ اور فساد کی یہ آگ ایسی بھڑکی کہ سارا شہر پولیس اور ملٹری کے قابو سے باہر ہو گیا۔

سب سے پہلے کلکتہ کا جنوبی حصہ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آیا۔ اور بھڑکتے ہوئے یہ شعلے شہر کے شمالی اور وسطی حصے تک پہنچ گئے۔ تلواروں، برچھیوں، بھالوں، خنجروں، کلہاڑیوں، چاقوؤں، چھریوں، پستولوں، بندوقوں، رائفلوں اور دستی بموں کا بھی آزادانہ استعمال کیا گیا۔ بندوقیں، رائفلیں اور دستی بم زیادہ تر ہندوؤں کے پاس تھے۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ اسلحہ اُن کو کہاں سے دستیاب ہوا۔ ہر گلی ہر بازار میں ہنگامہ پسندوں اور بلوائیوں کی ٹولیاں دیوانہ وار برابر کشت و خون اور قتل و غارت کرتی پھر رہی تھیں۔ زبردست خونریزی تمام اطراف میں جاری رہی۔ پولیس اور ملٹری گولیاں چلاتی تھی۔ اشک آور گیس پھینکتی تھی لیکن بے نتیجہ۔ مکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں اور شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ زخمیوں کی کراہوں اور مرنے والوں کی دلدوز آہوں سے کانوں کے ساتھ دل بھی پھٹے جا رہے تھے۔ شور و غوغا کا سلسلہ گارڈن برج سے لے کر کیدر پور، مٹیا برج، بلگاچی اور لوور سرکلر روڈ تک جاری تھا۔ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

اس ہنگامے میں بلوائیوں نے بچوں اور عورتوں کو بھی معاف نہ کیا۔ عورتوں کی آبرو لوٹی گئی۔ انہیں بری طرح قتل کیا گیا۔ ایک عورت کے ساتھ نہ جانے کتنے بلوائیوں نے منہ کالا کیا۔ عورتوں کی چھاتیاں اور جائے مخصوص تک کاٹی گئی۔ جو بچے کسی طرح بچ گئے تھے تقریباً پاگل ہو چکے تھے۔ ان کے ذہنی اعصاب بالکل مفلوج ہو چکے تھے۔

اگر مسلمانوں کا جلوس پر امن گزرنے دیا جاتا اور اس کا راستہ نہ روکا جاتا تو وہ ہرگز مشتعل نہ ہوتا۔ اِس خونریز ہنگامے کے ذمہ دار بھی شر پسند ہندو تھے۔

اور پھر فساد کی یہ آگ پورے بنگال میں پھیل گئی اور نوا کھالی اور پترا میں تو اس نے اتنی بھیانک اور مہیب شکل اختیار کر لی کہ پوری کی پوری بستیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ راکھ کے ان ڈھیروں ہی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں بھی کوئی گاؤں تھا۔ یہاں بھی انسان بستے تھے جن کا اب کوئی نام و نشان نہ تھا۔

فسادات کی یہ خبریں اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے ملک کے کونے کونے میں پھیل رہی تھیں جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ رہی تھی۔

فرقہ وارانہ فسادات کے بنگال سے جو شعلے اٹھے تھے اب بہار اُن کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ یہاں بھی مردوں کا قتل عام تو ہوا ہی لیکن عورتوں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا گیا اس کی مثال شاید ہی دنیا میں کہیں ملے۔

دوشیزہ لڑکیوں کو بالکل برہنہ کر کے بازاروں میں اُن کے جلوس نکالے گئے۔ ایک ایک لڑکی سے نہ جانے کتنے بلوائیوں نے بُرا بھلا کیا اور پھر ان کی شرمگاہیں نیزوں، برچھیوں اور تلواروں سے چھید کر ہلاک کر دیا گیا۔

عورتوں کے پستان کاٹ کر ہار بنائے گئے اور گلے میں پہنے گئے۔ عورتیں سر بازار فروخت کی گئیں۔ ایک عورت کئی بار فروخت ہوئی اور فروخت ہوتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ عورتوں کو ننگا نچایا گیا۔ عورتوں کے سامنے ان کے دودھ پیتے بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ بھڑکتے شعلوں میں جھونکا گیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچوں کا قیمہ کیا گیا۔

ایک بیٹی کو اُس کے باپ کے سامنے اور ایک بہن کو اُس کے بھائی کی موجودگی میں ایک کے بعد ایک بے شمار غنڈوں اور بلوائیوں نے بے آبرو کیا۔

حالات کی ابتری اور نزاکت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ انسانیت شعلوں اور لاشوں کے ڈھیروں پہ ننگی ناچ رہی تھی۔ مسلمان اقلیت کو من حیث القوم تباہ کیا جا رہا تھا۔

فرقہ وارانہ کشیدگی کی یہ آگ دن بدن پھیلتی جا رہی تھی۔ بہار کے اُن خونیں ہنگاموں جو مسلمان مرد

بچے اور عورتیں ماری گئیں ان کی تعداد آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

بہار کے بعد گڑھ مکتیشر میں مسلمانوں کا ہولناک قتل عام ہوا۔ جہاں ہندو جاٹوں کا ایک بہت بڑا گروہ دوسرے ہندوؤں کی رہنمائی میں گڑھ مکتیشر گاؤں میں داخل ہوگیا اور مسلمانوں کے مکانوں پر ٹوٹ پڑا۔ اور انتہائی سنگدلی اور شقاوت سے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ عورتوں کی آبروریزی کی گئی اور قتل کر دیا گیا۔

صرف ایک سو قدم کے فاصلہ پر پولیس چوکی تھی۔ جہاں کئی درجن مسلح سپاہی موجود تھے مگر پولیس صرف ایک ہوائی فائر کرنے کے بعد اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ گئی۔ بلوائی جب قتل کرتے کرتے تھک گئے تو واپس چلے گئے۔ لیکن رات کو تازہ دم ہو کر پھر آیا اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

اس حادثہ کی اطلاع بڑی سرعت کے ساتھ مضافاتی دیہات و قصبات اور میرٹھ تک پہنچ گئی۔ چنانچہ میرٹھ میں خنجر زنی اور چھرا گھونپنے کی اکا دکا وارداتیں شروع ہوگئیں گڑھ مکتیشر کا میلہ ختم ہونے کے بعد جب یاتری منتشر ہوئے تو دوسرے مقامات پر بھی ہنگامہ آرائی اور فتنہ و فساد کا دور شروع ہوگیا۔

اس سلسلہ کا سب سے دلدوز اور جگر فگار حادثہ ۱۰ نومبر کو جاٹوں کا وہ حملہ تھا جو غازی آباد کے قریب موضع میرن پور کے مسلمانوں پر وارد ہوا۔ تقریباً چالیس مرد، عورتیں اور بچے آن کی آن میں ہلاک کر دیئے گئے۔

یہاں سے فساد آرائی رہتک تک پہنچ گئی۔ بلوائیوں کے ٹڈی دل قافلے مسلم آبادی کا نام و نشان اجاڑ کر واپس چلے گئے اور اپنے پیچھے جلتے ہوئے مکان اور لاشوں کے ڈھیر چھوڑ گئے۔

ہوائیں خون کے آنسو اپنے شوہروں کے قتل پر رو رہی تھیں۔ یتیم لڑکے لڑکیوں کو اپنے مقتول والدین کا غم کھائے جا رہا تھا۔

اُدھر فوج کے ہندوستانی افسروں میں ہندو مسلم تفرقہ بازی زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اور ایسا ہی پولیس کا حال تھا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں سے مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدگی پسندی

کی کئی شکایتیں پیدا ہونے لگی تھیں۔ یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ کانگرس اور لیگ میں متحدہ طور پر کوئی بھی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ دہلی میں یہ بات پورے طور پر متوقع تھی کہ یہ عدم مفاہمت فسادات و خونریزی اور خانہ جنگی تک کی صورت اختیار کرے گی۔ نہ صرف دہلی بلکہ ملک بھر کے مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ بہار میں بیس ہزار سے زیادہ مسلمان قتل ہوئے اور کانگرس نے ایک منظم پروگرام کے مطابق مسلمانوں کا یہ قتل عام کرایا۔

اس دوران میں برطانوی کابینہ کا مشہور فیصلہ ہوا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک ہندوستان بہر حال آزاد کر دیا جائے گا۔

اسی دوران میں ایک غلط خبر مشہور ہوگئی کہ ایک ہندو لڑکے کو کسی مسلمان نے خنجر مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ اس واقعہ نے پورے ریواڑی کو سراسیمہ کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی دھیری میں فساد رونما ہوا۔ یہ بالکل یکطرفہ فساد تھا۔ جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو جی بھر کر ذبح کیا جبکہ شمالی میوات میں بھی فسادات کا آغاز ہوگیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک میو نے لوز پور کے ہندو کی بھینس چرا لی۔ ہندوؤں کی ایک جماعت نے تعاقب کیا۔ بھینس چھین لی لیکن چپقلش کی بنا پڑ گئی۔ میواتیوں نے ایک گوجر دیہات میں آگ لگا دی۔ دوسرے دن ہندوؤں نے بدلہ لیا اور کئی دیہات نذر آتش کر دیئے۔ جو ضلع گوڑ گانواں اور ریاست الور میں واقع تھے۔ یہ غیر متوقع حملہ تھا کیونکہ میواتیوں کو اس کا وہم و خیال ہی نہ تھا کہ ریاست الور کی طرف سے ان پر حملہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۶ مسلمان ہلاک ہو گئے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

اس واقعہ نے دونوں فرقوں میں عداوت پیدا کر دی۔ میواتیوں نے بھی جوش انتقام میں کئی دیہاتوں میں آگ لگا دی۔ ہندوؤں نے بھی ایک گاؤں روناؤں کو جلا ڈالا۔

کشت و خون کا وحشت انگیز سلسلہ جاری رہا۔ اس میں دن بدن شدت آتی چلی گئی۔

موہنی جھیل تحصیل میں دس مسلمان مسافروں کو لوٹ لیا گیا۔ ان کے ساتھ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔

متھرا میں کینل برج بھرت پور روڈ پر چار پناہ گزین مسلمان نہایت بیدردی سے قتل کر دیئے گئے۔

ایک مسلمان خاندان جو ایک پسنجر ٹرین پر سوار تھا جاجم پتی اسٹیشن پر ہلاک کر دیا گیا۔ کنکھیرا میں بھی دو مسلمان خاندانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور چار جوان لڑکیوں کی سرعام آبروریزی کی گئی۔ دوسرے دن ان کی لاشیں ایک گڑھے سے برآمد ہوئیں۔

مدہوری کنڈ فارم کے قریب دس مسلمان عورتوں کی لاشیں ملیں جن کی عصمت دری کر کے ان کے پیٹ چاک کر دیئے گئے تھے۔

جھنڈوالی میں چھ مسلمانوں کے گھر لوٹ لیے گئے۔ چار مسلمان لڑکیوں کو اغوا کیا گیا۔

گنجولی کے قریب آگ کا الاؤ جلا کر بیس مسلمان عورتوں کو آگ کے گرد ننگا نچایا گیا۔ اور ان کی عصمت دری کر کے انکی جائے مخصوص میں جلتی ہوئی لکڑیاں دے دی گئیں۔

بھبینسا اور پرکھم ریلوے اسٹیشن کے درمیان مسلح بلوائیوں نے ریل پر پتھراؤ کر کے ریل کو روکا اور مسلمان جوان لڑکیوں کو اغوا کر لیا گیا۔ برلی میں انور پور کے قریب کئی مسلمان گھروں پر حملہ کیا گیا۔ مرد سارے ہلاک کر دیئے گئے۔ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو بھی موت کی نیند سلا دیا گیا جبکہ جوان لڑکیوں کی عصمت دری کر کے ان کے پستان کاٹ دیئے گئے۔

بھرت پور میں وہ تمام دیہات جلا کر خاک کر دیئے گئے جہاں میو رہتے تھے۔ جبکہ یوپی کے صوبے کوسی سے ملحقہ مقامات میں جو میواتی آباد تھے۔ سب کے سب ہلاک کر دیئے اور ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔

ریاست الور کی مشرقی سرحد پر واقع کئی دیہاتوں پر مسلح ہندو گروہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ ان گروہوں کے ساتھ ریاستی فوج کی دو جیپیں بھی تھیں۔ چھ چھ سال کے چند بچے بچ گئے تھے۔ ان کے پیروں اور سروں پر تلوار کے گھاؤ تھے۔

منڈاور کے قریب ایک موضع کے میواتی باشندے ہندو مت میں داخل ہو گئے۔ اس لئے وہ بچ گئے۔

یہ سن کر الور میں ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا ہندوؤں کے جتھوں نے میواتیوں کی اناج سے بھری ہوئی گاڑیاں لوٹ لیں۔ جوان لڑکیوں کو اغوا کیا۔

ہندوؤں کے ایک مسلح گروہ نے موضع تنکی میں آگ لگا دی۔ اور مہین پور کا گھیراؤ کیا۔

رات کو دو جیپوں اور ایک ٹرک پر ریاستی فوج کے سپاہی آکر اس گروہ سے مل گئے۔ فائرنگ شروع کر دی۔ جوان، بچے، بوڑھے ہلاک کر دیئے۔ جوان عورتوں کی عصمت دری کی۔ ان کے مردوں کے عضو تناسل کاٹ کر ان کے منہ میں دیئے گئے۔ اور اس کے بعد ان سب کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ مسلم اقلیت کے ساتھ ہندوستان کی اکثریت کا جو طرز عمل رہا وہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ کسی اقلیت کو تواتر و تسلسل کے ساتھ شاید ہی اس طرح پامال کرنے اور نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جس طرح قینچی بال کاٹتی ہے مسلمانوں کو نہایت بیدردی سے کہاں کہاں نہ کاٹا گیا۔ تاریخ آزادی کے اس پرآشوب دور میں ایک طرف نشیمن مرتب کئے جا رہے تھے اور دوسری طرف تعظیم برق و شرر ہو رہی تھی۔ ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا اور دوسری طرف غیروں کو چھوڑیئے اپنے ہی لوگ اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر مسلمان کے خون کی ارزانی سے آنکھیں موندھے بیٹھے تھے۔

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاک گریباں کی بات کون کرے

ایک طرف زلف آزادی کو بڑے اہتمام سے سنوارا جا رہا تھا اور دوسری طرف فکری و نظری تعصب ہاتھ میں نفرت و حقارت کی مقراض لئے زلف آزادی کو کاٹے جا رہا تھا۔

قفس سے آشیاں تک

آزادی وہ متاعِ گراں مایہ ہے جس کی خاطر انسان نے کسی قربانی کو بھی زیادہ قیمتی نہیں سمجھا۔ اُس کی حفاظت کے لیے یا اسے کسی قوم سے چھیننے کے لیے اپنا یا کسی کا اس قدر خون بہایا ہے کہ اگر وہ خون مٹی اور پتھروں کو اگلنا پڑ جائے تو ایک ایسا بیکراں سمندر معرضِ وجود میں آئے جس کے سامنے یہ سمندر جو ہم دیکھ رہے ہیں ایک جوہڑ نظر آئے۔

آزادی کے لیے حرب و پیکار کے ایسے ایسے خونیں معرکے اور دہشت ناک لڑائیاں لڑی گئی ہیں کہ دھرتی پر دہشت سے ابھی تک رعشہ طاری ہے۔ انسانوں نے اس کے ایسے ایسے ہیکل اور مجسمے تراشے ہیں کہ اُن کی تشکیل و تعمیر کے لیے انسانی خون اور ہڈیوں کا ایک وافر ذخیرہ فراہم کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور پھر اُن ہیکلوں اور مجسموں کی اتنی عقیدت و ارادت سے والہانہ طور پر پرستش کی ہے کہ ان کے قدموں میں اپنے لہو کے چراغ جلانے میں اپنی کسی چیز کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس نے آزادی کی شان میں قصیدے نہ کہے ہوں۔ اس کی حمد و ستائش کے گیت نہ گائے ہوں۔ اس کے قدموں میں اپنی عقیدت کے پھول نہ چڑھائے ہوں۔ انسان کی ساری تمدنی زندگی حصول و استحکامِ آزادی کی کشمکش کی تاریخ ہے۔

سرورِ دین نبی اکرمؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضورؐ نے دیکھا کہ وہاں کے یہودی روزے سے تھے اور خوشی منا رہے تھے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ آج کے دن بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس دن کی یاد کو قائم رکھا ہے۔ اور اُسے بطور قومی جشن مناتے ہیں۔ اور شکرانہ کا روزہ رکھتے ہیں۔

سرورِ دین نے صحابہؓ سے فرمایا۔

"تم بھی اس دن کا روزہ رکھو کر ان کے جشنِ مسرت میں شرکت کرو۔ اس لئے کہ

کسی قوم کی آزادی صرف اسی قوم کے لیے وجہ شادمانی نہیں اُسے دنیا کے ہر انسان کے لیے باعث مسرت ہونا چاہیئے۔ آزادی ایک فرد کی ہو یا ایک قوم کی۔ ایک انسان کی ہو یا دنیا بھر کے انسانوں کی موجب تشکر و امتنان ہوا کرتی ہے۔"

لیکن دنیا ابھی تک صرف شخصی و قومی آزادی کے تصور تک ہی پہنچ سکی ہے تقسیم ہوتے ہوئے ہندوستان میں بھی آزادی کے مفہوم کو صرف شخصی و قومی آزادی کے تصور تک ہی سمجھا گیا۔ تو اُس کا نتیجہ وہی ہوا جو لازمی طور پر ہونا چاہیئے تھا۔ پورا ہندوستان ایک ایسا ذبح خانہ ایک ایسا مقتل بن گیا جہاں نہایت بیدردی و بے رحمی سے انسانیت کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ملی جلی آبادی کا کوئی شہر، کوئی گاؤں، کوئی بستی ایسی نہ رہی جہاں راہ چلتوں کو چھرا گھونپنے، آگ لگانے، لوٹ مار اور اغوا کرنے کی وارداتیں اپنے پورے عروج پر نہ پہنچ گئیں۔

حکومت برطانیہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ ستمبر ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو آزاد کر دے گی۔ اپنے اقتدار کا بوریہ بستر اٹھا کر سات سمندر پار چلی جائے گی۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ فرقہ پرستی اور قوم پرستی کا جنون اس قدر مشتعل ہو چکا ہے کہ پاگل درندہ بن کر غارت گری پر تُل گیا ہے اور بستیوں کی بستیوں کو چیرنے پھاڑنے لگا ہے تو اُس نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد کر دیا۔ اپنے اس طرز عمل سے فرقہ وارانہ فسادات کی جلتی چتا پر کچھ اس طرح تیل ڈالا کہ اُس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

غلام ہندوستان کو سوراج مل گیا ـــ!

محکوم ہندوستان کو کرانتی مل گئی ـــ!

اور کرانتی کے پجاریوں نے اُس کا سواگت، اُس کا استقبال اس طرح کیا کہ کرانتی ہی کو سُندر کنیا بنا کر سیاست کے چکلے میں بٹھا دیا۔ سوراج کے کوٹھے پر اگربتی کی طرح سُلگا دیا۔ ایک گلدستے کی طرح سجا دیا۔ جہاں سوراجیوں نے اپنی پوری بہیمیت و بربریت کے ساتھ اُس سے زنا بالجبر کیا۔

اندھیرا گیا پر اجالا نہ آیا ۔ !

اور یہ سب کچھ شریمتی سورنا رانی کے دیس میں ہوا۔ شریمتی سروجنی نائیڈو بلبل ہند کے دیس میں ہوا۔ شریمتی وجے لکشمی پنڈت کے دیس میں ہوا۔ عدم تشدد کے دیوتا مہاتما گاندھی جی کے دیس میں عدم تشدد کے حامیوں نے تشدد کی ان گنت بھیانک شکلیں اختیار کرلیں۔ برسوں تک تشدد کا شکار رہنے والوں کو جب خود تشدد کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے تشدد کی ایسی مثالیں قائم کردیں کہ رہتی دنیا تک اُن کی مثال نہ ملے گی۔

مہاکوی سری رابندر ٹیگور کی گیتا بخلی کو ورق ورق کرکے سوراج کی جلتی چتا میں جھونک دیا گیا۔ دھرم کے کورو کشتر میں ادھرمیوں نے بھگوت گیتا کا اپمان کیا۔

رام راجیہ میں ہر شخص راون بن گیا۔ اور رام جی کے اونچے ادرش کا پالن نہ کیا۔ ہزاروں سیتاؤں کو راون اغوا کرکے لئے جا رہے تھے۔ ہندوستان میں مذہبی تعصب کی لنکا دھڑ دھڑ جل رہی تھی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ شعلے ہی شعلے تھے۔ دھواں ہی دھواں تھا۔ جس میں ہزاروں دروپدیوں کا چیر کوروؤں نے تار تار کر دیا تھا۔ آگ اور خون کے مہا یگنا میں بھارت کی بیٹیوں، بھارت کے بیٹوں کا بلیدان ہو رہا تھا۔

اور بندرابن کی کنج گلی سے مرلی منوہر کی بانسری کی کوئی تان سنائی نہ دے رہی تھی کہ دھرم کے کورو کشتر میں ادھرم کی تلواروں سے گھائل ہونے والوں کو شانتی تو ہو جاتی۔ اپنے ہی خون میں ڈوبنے والوں کو سہارا تو مل جاتا۔

ہر طرف شور ہی شور تھا۔ چیخیں ہی چیخیں تھیں۔ ہندوستان کی آزادی اپنے بال نوچتے ہوئے ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔ ہندوستان کی آزادی سینہ پیٹتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔

نردوشش ابلا سیتاؤں کی رکھشا کرنے والے اجودھیا کے دھنش دھاری رام تم کہاں ہو؟

مہابھارت کے یدھ میں نربلوں کو بلوان بنانے والے، گیتا ساگر اپدیش سنانے والے اپدیشک اور سدرشن چکر کا چمتکار دکھانے والے بھگوان تم کدھر ہو؟

وہ کونسا دریا تھا جو لہو لہو نہ ہو رہا تھا۔ گنگا۔ جمنا، گھومتی۔ گھاگرا، نربدا، تاپتی، ستلج بیاس راوی، چناب، جہلم جیتے جیتے لہو کے دھارے بن گئے تھے۔ ہزاروں سوہنیاں اپنی عصمت

کے کچے گھڑوں پر تیرتے ہوئے اپنے ہی خون کے دریاؤں میں ڈوب رہی تھیں۔ ہزاروں ہیروں کو کھیڑے بالکل ننگا کرکے بازاروں اور بستیوں میں ان کا جلوس نکال رہے تھے۔ انہیں تلواروں کی دھار پر نچایا جا رہا تھا۔

انسان کا شعور لاشعور میں گم ہو گیا تھا۔ انسانوں کے ذہن آگ اور خون اچھالتی تاریک رات میں لاشوں کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ ایک تاریکی سے دوسری تاریکی تک۔ ایک لاش سے دوسری لاش تک۔ ہندوستان کی آزادی کی جادو بھری رات خون آشام چمگادڑ کی طرح درہ خیبر سے راس کماری تک اپنے خوفناک پر پھیلائے ہوئے تھی۔

جادو بھری رات ——!

والپرگس رات ——!

جس میں بھوت چھلاوے شعلوں پر ناچتے ہیں اور جادوگرنیاں جادو کے جھاڑو پر سوار ہو کر آندھیوں میں اڑتی پھرتی ہیں۔ جھکڑوں میں منڈلاتی ہیں۔

ہندوستان کی اس والپرگس رات میں آگ کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ خون کے بادل برس رہے تھے۔ تیز و تند ہواؤں میں لاشیں خشک پتوں کی طرح اڑی جا رہی تھیں۔ راولپنڈی سیالکوٹ۔ سرگودھا۔ لائل پور۔ گوجرانوالہ۔ لاہور۔ امرتسر۔ جالندھر۔ فیروزپور۔ نابھہ۔ فرید کوٹ پٹیالہ۔ دہلی۔ گڑگاؤں۔ دہرہ دون۔ سب کے سب آزادی کی والپرگس رات کی پیٹ میں تھے۔

ایسی تاریک راتوں کو غلام ہندوستان کے بیٹے رنڈیوں کے کوٹھوں پر جایا کرتے تھے۔

اب سارے ہندوستان اور پاکستان میں رنڈی کے کوٹھے پر جانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ وہ عورت جو پیسے کے زور سے خریدی جاتی تھی اب تلوار کے زور سے خریدی جا رہی تھی۔ اور اس کے بچوں کی، بھائیوں کی، شوہر کی کسی کو ضرورت نہ تھی۔ وہ بھالوں، سنگینوں، برچھوں، تلواروں اور گولیوں سے چھد کر تڑپ تڑپ کر سو گئے تھے۔

وہ بلونت کور تھی یا بھگوان کور۔ سیتا دیوی یا سرتیا دیوی۔ وہ ثریا بیگم تھی یا ثروت سلطانہ۔ وہ ایک بیٹی تھی۔ ایک بہو تھی۔ ایک بہن تھی۔ ایک بیوی تھی۔ ایک ماں تھی۔ ایک عورت تھی۔ قابل احترام تھی۔ قابل رحم تھی۔ لیکن وہاں تو انسان پتھر بن گئے تھے۔ رحم کا ان سے کیا تعلق تھا۔

یہ سب کچھ پاکستان میں بھی ہو رہا تھا۔ قائداعظم کے دیس میں ۔ داتا گنج بخش ہجویریؒ کے دیس میں۔ سلطان باہوؒ کے دیس میں۔ رتی لعل شہباز قلندرؒ کے دیس میں ۔

عورتوں کے پستان کاٹ کران کے ہار بنائے گئے اور ان کو پہنائے گئے ۔ ادھر بھی اور اُدھر بھی ۔ مندر میں، مسجد میں، گردوارے میں عورتوں کے نیچے مقدس کتابیں رکھ کر ان کی عصمت دری کی گئی ۔

آزادی دو دھاری تلوار بن گئی تھی۔ دونوں طرف لاشوں کے انبار لگاتے ہوئے اور خون کے فوارے اچھالتے ہوئے ایک ایسا قتل عام کر رہی تھی جس کی نظیر شاید ہی دنیا کے کسی ملک کی آزادی کی تاریخ میں مل سکے۔

اِدھر بھی اور اُدھر بھی جو کچھ ہوا نہایت ہی رسوا کن تھا ۔ افسوسناک تھا ۔ باعث شرم تھا ۔ غیر انسانی تھا۔ شرمناک تھا۔ عبرتناک تھا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ جب تک حالات معمول پر نہ آجاتے حکومت برطانیہ ہندوستان کی آزادی کے ایٹم بم کو اس کے دامن میں نہ پھینکتی۔ قتل و غارت کی پوری طرح روک تھام کرتی ۔ انسان گھات میں لگے انسان نما درندوں کے مشتعل ذہنوں کو معمول پر لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ۔ لوگوں کو آزادی کا مطلب اور اس کو استعمال کرنے کا طریقہ بتا دیا جاتا ۔ اس طرح بے شمار بے گناہ انسان موت کے گھاٹ نہ اترتے ۔ خون کی ہولی نہ کھیلی جاتی۔ قدم قدم پر عصمتوں کے کارواں نہ لٹتے۔ لیکن انگریز کو کسی بھی مذہب وملت کے ہندوستانی یا پاکستانی کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی ۔ وہ ایسے لوگوں کو کوئی مراعات ، کوئی تحفظ، کوئی پناہ ، امن و سلامتی کا کوئی پروانہ دینے کو تیار نہ تھا۔ جنہوں نے اُسے ناک چنے چبوا کر ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہندوستان کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا ۔

جنہوں نے انگریز کے ہاتھوں سے سونے کی چڑیا چھین لی تھی ۔ ایسے لوگوں کے ساتھ انگریز کو یقیناً کوئی ہمدردی نہ تھی ۔

انگریز چاہتا تھا کہ ایسی صورت حال میں جبکہ فرقہ پرستی کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی ہے سارا ہندوستان اس کے شعلوں میں جل کر راکھ ہو جائے ۔ اس کی حکمت عملی نے

یہ دیکھتے ہوئے ہی انگریز دشمن عناصر سے جاتے جاتے انتقام لینے کے لئے ان کو وقت مقررہ سے پہلے ہی آزاد کر دیا تھا۔

ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اُس کا ایک حصہ ملک کی سب سے بڑی اکثریت اور دوسرا حصہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو سونپ دیا تھا۔ بٹوارہ ہو گیا۔ تقسیم ہو گئی۔!

ایک ملک جو جغرافیائی حیثیت سے ناقابل تقسیم تھا دو شکلیں اور دو نام لئے دنیا کے جغرافیے میں ابھرا۔

ہندوستان ـــــ سیکولر اسٹیٹ ـ غیر مذہبی ریاست ـ!

پاکستان ـــــ نان سیکولر اسٹیٹ ـــــ مذہبی حکومت ـــــ تھیوکریسی ـ

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کا یوم آزادی ہندوستان اور پاکستان کے لیے ایک جانگداز سانحہ بن گیا۔ ایک روح فرسا المیہ بن گیا۔ ایک ہولناک ٹریجڈی ـ!

آزادی کے آفتاب و ماہتاب کو طلوع ہوتے ہی گرہن لگ گیا۔ ایک طرف خوشی کے شادیانے بج رہے تھے اور آزادی کے ترانے الاپے جا رہے تھے۔ دوسری طرف انسانیت ذبح ہو رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ شور مچا رہی تھی۔

وہ شاخ گل پہ زمزموں کی دُھن تراشتے رہے
نشیمنوں پہ بجلیوں کے کارواں گزر گئے

ہندوستان کے غلاموں کو آزادی ملی لیکن ایسے جیسے بچوں کے ہجوم میں کٹی ہوئی پتنگ آگرتی ہے۔ تو وہ اُس کو پکڑنے کی دُھن میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ پتنگ ثابت نہیں رہتی کاغذ کے پرزے اور بانس کی تیلیاں اُن کے ہاتھوں میں رہ جاتی ہیں۔

اور میں ـــــ ہاں میں ـــــ یعنی میں ـــــ تمہارا پاکستان ـ قائداعظم کا پاکستان ـــــ ۹ کروڑ پاکستانیوں کا پاکستان ـ یہ سوچتا رہا کہ کیا یہ لاکھوں اس لئے مرے کہ یہ لوگ حکومت کریں۔ پاکستان پر ـ ہندوستان پر۔ جبکہ آزادی اور حکومت زمین پر انسان کے لیے خدا کا سب سے بڑا انعام و اکرام ہے۔

اور میں سوچتا رہا کہ تم بھی کبھی سوچو ـ میرے ذہن سے ـ میرے شعور سے۔ میرے

نکتہ نظر سے ۔ تم بھی کبھی سوچو۔ اپنے سر سے ہتھوڑے اور خنجر کا نہیں سوچنے کا کام لو۔

اے کاش تم بھی کبھی سوچو۔ آزادی کیا ہوتی ہے۔ حکومت کسے کہتے ہیں۔ اور مجھے یہ حیرت ہے کہ تم یہ کیوں سوچنے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جبکہ آزادی و حکومت کا صحیفہ تمہارے پاس موجود ہے۔ آزادی و حکومت کے اُس منشورِ اعظم کو دیکھو جو آج سے چودہ سو سال پہلے رحمت عالم بنی اکرم صلعم کی وساطت سے عالمگیر انسانیت کو ملا۔ اور اُس وقت ملا جب مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر جگہ انسان کا بال بال غلامی و محکومی کی مرئی و غیر مرئی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ ان قوموں کے افراد کا بھی جن کی حکومت خود اپنے ہاتھ میں تھی اور ان کے افراد کا بھی جن پر دوسری حکومتیں حکومت کر رہی تھیں۔

متعدد قوموں نے یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے دنیا کو آزادی کا درس دیا۔ لیکن دیکھو کہ ان کی اپنی آزادی کی کیا کیفیت ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے ماں باپ کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے دنیا میں آتا ہے۔ اور اُس کے بعد یہ اُس کے بس میں نہیں ہوتا کہ اس بوجھ کو اپنے کندھے سے اتار سکے۔ کیا اُن انسانوں کو آزاد کہا جا سکتا ہے جن کا دل ہر وقت اس احساس کے بچھو کے کھا رہا ہو کہ ان کی پیٹھ پر گناہوں کا پشتارہ ہے جسے وہ کسی طرح اتار ہی نہیں سکتے۔ کیا اُس کو قلبی آزادی کی خوشی کبھی نصیب ہو سکتی ہے۔ اور پھر ایسے مفکرین بھی آئے جنہوں نے مذہب و عقیدہ کیا خدا تک کو چھوڑ دیا۔ لیکن ان کی ہر تحقیق کا یہ ملخص ضرور ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ اُسے آزاد کہا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر وہ کچھ اور آگے بڑھے تو کہنے لگے کہ انسان کی سینکڑوں نسلوں میں جو عقاید، تصورات، رسوم و مناسک۔ متوارث چلے آ رہے ہیں ہر انسانی بچہ ان کا مرکب و مخلوط ہوتا ہے۔ اور یہ اُس کے بس کی بات نہیں ہوتی کہ ان اثرات سے کنارہ کشی کر سکے۔ اور پھر یہ بھی کہا کہ انسانی بچہ جس ماحول میں سانس لیتا ہے اس کا گرداب اُس کے گہرے اور انمٹ نقوش کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان اپنے ماحول کی ابتدائی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

اور پھر اُن میں سے ہی کچھ ان کی تکذیب کرتے ہوئے کہنے لگے کہ جس چیز کو انسان کا اختیار و ارادہ اور فکر و شعور کہا جا رہا ہے وہ کوئی شے نہیں۔ انسان کی ہر فکر اور ہر ارادہ ایک

ہی قوت کی گرفت میں ہے جس کو نفس لاشعور Un-Conscious Mind
کہا جاتا ہے۔ یہی وہ بھیانک دیو ہے جو اُسے قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ اور سبوتاژ پر
مجبور کرتا ہے۔ اور جسے انسان کا با اختیار شعور Conscious Mind کہا جاتا ہے
بس ایک فریب ہے اور کچھ بھی نہیں۔

تو پھر ان تصورات میں جو کہ بذاتِ خود بڑی بوجھل زنجیریں ہیں کیا کسی بھی انسان کو آزاد کہا جا سکتا ہے۔ کسی قوم، کسی فرقے، کسی گروہ، کسی جماعت کی غلامی تو ایسی غلامی ہے جس کی زنجیریں ایسی غیر محسوس اور محکم ہیں کہ ان کو توڑ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہی وہ تصورات و نظریات ہیں جن کی بدولت مذہب بدنام ہو کر رہ گیا ہے کہنے والوں نے یہاں تک کہا ہے کہ جتنا خونِ انسانی مذہب کے نام پر بہایا گیا ہے اور کسی چیز کے لیے نہیں بہایا گیا۔ اور ان کا یہ کہنا کسی حد تک درست ہے۔ دور نہ جاؤ ہندوستان کی آزادی ہی کو لے لو۔ کیا ایک انسان کو دوسرے نے اس لئے قتل نہ کیا کہ مقتول قاتل کا ہم مذہب نہ تھا۔ ایک گائے کی پوجا کرتا ہے اور دوسرا اُس کو کھا جاتا ہے۔ کیا اِسی نظریہ و تصور نے ایک ہندو کے خون میں یہ سیپٹی سیمیا Septiciemi کر دیا کہ مسلمان کافر ہے۔ ملیچھ ہے مکروہ ہے۔ اِس کو اُس کی اولاد تک کو قتل کر دینا چاہیئے۔ سانپ کا بچہ بھی سانپ ہوتا ہے۔ اور سیپٹی سیمیا وہ عارضہ خون ہے جبکہ جراثیم تمام خون میں پھیل جاتے ہیں۔ اس سیپٹی سیمیا نے ۱۹۴۷ء میں جو تباہی مچائی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ یہ مذہبی جنون ہی تو تھا جس میں لاکھوں مسلمان ہندوؤں کے ہاتھ سے اور ہزاروں ہندو سکھ مسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاک ہو گئے۔ انگریز کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں تو ہندوستان کے غلام مذہبی و اعتقادی زنجیروں کے اسیر ہو گئے۔ جسمانی غلامی کی زنجیروں سے چھوٹے تو ذہنی غلامی کی زنجیریں پہن لیں۔ اور ذہنی غلامی غلامی کی بدترین شکل ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے کہ ہر فرد اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اور انفرادیت کا فطری تقاضا یا بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ہر فرد اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وراثت، ماحول، تعلیم و تربیت، رسوم مناسک کے انسان پر اثرات مرتب ہوتے ہیں لیکن اُس

کے اندر ایک ایسی محکم و مضبوط قوت رکھ دی گئی ہے جو ان تمام اثرات کو مٹا سکتی ہے - اور وہ قوت ہے الوہیاتی - توانائی - روح خداوندی (Divine Energy) اسی کو انسانی خودی، انا اور ذات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے دور آزادی کا انسان محض نظری اعتبار سے ہی نہیں معاشرہ میں عملی اعتبار سے بھی اس قسم کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ جن کے توڑنے کے تصور سے ہی اس کی روح کانپتی تھی - ایک طرف اس کی نظری زنجیریں ٹوٹ رہی تھیں لیکن دوسری طرف وہ اعتقادی زنجیروں کو دوسروں کے گلے میں پھانسی کا پھندا بنا کر ڈالتے ہوئے ان کو ہلاک کر رہا تھا۔

نبی اکرم صلعم نے فرمایا - میں تم سے کوئی لمبا چوڑا وعظ نہیں کہنا چاہتا - صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں - صرف ایک بات - اور وہ ایک بات یہ ہے کہ تم ایک ایک دو دو کر کے خدا کے لیے کھڑے ہو جاؤ - اور پھر سوچو - اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا تو میرا کام بن گیا - پھر تم ان لوگوں کی فریب کاریوں میں مبتلا نہیں رہ سکتے جو لوگ سوچتے نہیں - ان کی گردنوں میں غلامی کی زنجیریں پڑی رہتی ہیں - تمہارے ہر فیصلے اور عمل کے لیے سند اور حجت صرف اللہ کی کتاب ہے - تم اس کا اتباع کرو - اس کے علاوہ کسی اور کا اتباع نہ کرو۔

آزادی اور غلامی سے متعلق عام تصور یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے باشندے خود اپنی حکومت قائم کرتے ہیں تو اسے آزادی کہا جاتا ہے اور اگر اس پر کوئی غیر قوم حکمران ہو تو اسے غلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ آزادی کا یہ مفہوم ہی ناقص ہے یہاں سوال اپنی قوم یا غیر قوم کا نہیں خدا نے ہر فرد کو آزاد پیدا کیا ہے اس لئے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں خواہ وہ اپنی قوم کا فرد ہو یا غیر قوم کا کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ حکومت کے بغیر تو انسان کا نظام تمدن قائم نہیں رہ سکتا - یہ کیسے ممکن ہو گا کہ انسان حکومت کے بغیر رہیں لیکن قرآن کریم نے نظام حکومت کی نفی نہیں کی - نظام حکومت کے طبعی ارتقا کے متعلق جو کچھ قرآن حکیم میں موجود ہے - شاید ہی دنیا کی کسی اور کتاب میں موجود ہو -

حکومت خواہ کسی نوعیت و ماہیت کی ہو مصنوعی و بناوٹی طریقہ سے نہیں بنا کرتی - وہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں کہ بنایا تو اسے مغرب میں جائے اور لا کر جما دیا جائے مشرق میں، اس کی پیدائش

تکوین تو ایک سوسائٹی، ایک گروہ، ایک جماعت، ایک قوم کے اخلاقی، نفسیاتی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر مرتب ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں۔ جن کے فراہم ہونے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ایک حکومت صرف ان حالات کے اقتضا کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی و جماعت میں بہم پہنچ گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکل ان حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس کی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے۔ کیمیاوی اجزا کسی خاصیت کے ہوں اور اُن کی ترتیب سے نتائج کچھ اور ہی برآمد ہوں۔

اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں۔ ان کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشو و نما کے لیے مناسب ہو مگر ارتقائی مراحل سے گزر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی حکومت بن جائے۔

حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اس کی طرف لے جانے والا طرز عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسی ہی تحریک اٹھے۔ اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں۔ اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے۔ اسی طرز کے کارکن تربیت کئے جائیں۔ اسی ڈھنگ کی لیڈر شپ ہو۔ اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضا اُس خاص نظام حکومت کی نوعیت "فطرتاً" کرتی ہے جسے وہ بنانا چاہتی ہے۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہو جاتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی بنا پر کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ تب طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر آتا ہے جس کے لیے ان کے طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہوتی ہے۔ جب پاکستان آگ اور خون کے سمندر سے چاند کی طرح نکل رہا تھا تو اس کی

نوعیت کی وضاحت کی جا رہی تھی کہ یہ اسلامی حکومت ہوگا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرد ایک اصولی حکومت ہے۔

Ideological States یہ اصولی حکومت وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ نا آشنا رہی ہے۔ یہ چیز چونکہ نرالی ہے اور گردوپیش کی تمام دنیا اس کے خلاف چل رہی ہے۔ اس لئے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اس کو اس کے جملہ تضمنات کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔

ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کرکے حکومت کا ایک خالص نظام آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کرکے غیر قومی حکومت بنائیں۔ اور اصولی حکومت کے تخیل کی تو بنیاد ہی یہی ہے کہ اس کے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں صرف انسان ہیں اور اس نے وسیع تر انسانیت Broad Humanism کے لیے اپنا دروازہ کھول رکھا ہے۔

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُس کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصوّر پر قائم ہے۔ اُس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے اور وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت کا حق نہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستورِ حکومت آیا ہو یا وہ اُس شخص کی پیروی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہو۔

اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر ایمان لائیں۔ اور اس کی پیروی کرنے پر تیار رہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائے کہ بحیثیت مجموعی اور پھر ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز

کو جاننے والا ہے۔ جس کے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی۔

خلافت کی ذمہ داری جو اس کو ماننے والوں پر عائد کی گئی ہے اس لیئے نہیں ہے کہ وہ لوگ اپنا حکم چلائیں۔ اوروں کو اپنا غلام بنائیں۔ ان کے سر اپنے آگے جھکوائیں۔ ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محلات تعمیر کریں۔ حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش اور نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں۔ بلکہ یہ بار ان پر اس لیئے ڈالا گیا کہ وہ خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور اس کے نفاذ میں اگر انھوں نے ذرا سی بھی کوتاہی کی۔ اگر انہوں نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی نفس پرستی، تعصب وجانبداری یا بددیانتی کو دخل دیا تو وہ خدا کی عدالت سے سخت سزا پائیں گے۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو حکومت بنتی ہے وہ دنیوی حکومتوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اُس کی ترکیب، اس کا مزاج، اس کی فطرت، کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اس کی انتظامی حکمت عملی، اس کی داخلی وخارجی سیاست، اس کی صلح وجنگ کے معاملات سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کو اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزا اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہوتے ہیں۔ اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو۔ جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں۔ جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں۔ جو ہر حال میں اسی ضابطہ اور اس طرز عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر دیا گیا ہے۔ جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو۔ جو تنگ نظری تعصب سے پاک ہوں۔ جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہوجانے والے نہ ہوں۔ جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں۔ جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ وہ ہر معاملے میں دیانت دار ہوں۔ جو فکر ونظر کے اعتبار سے مسلم ہوں۔ جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار ونظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصول پر مرتب کر سکیں۔ جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے خدانا شناس ائمہ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی وذہنی سیاحت کا سکہ جما دیں۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ یہ

تحریک عملاً اُس غلط نظامِ زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش کی دنیا پر چھایا ہوا ہو۔ اس جدوجہد میں اُس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر سختیاں جھیل کر، قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دیکر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو پرکھنے والا خالص سونا ہی پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں وہ اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں۔ ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، بااصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ اُس میں ضرور انسان کے لئے عدل اور امن ہو گا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہو گی۔ اس تحریک میں کھنچ آئیں گے۔ پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے۔ عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا ہو گا۔ اجتماعی زندگی میں اُس مخصوص نظامِ حکومت کی وہ لگن، وہ دھن پیدا ہو جائے گی۔ پھر جونہی کہ وہ نظام رائج ہو گا اس کو چلانے کے لیے ابتدائی کارکنوں سے لے کر اُس کے اعلیٰ حکام تک اس نظامِ تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے۔

لیکن اُس دورِ ابتلاء و خلفشار میں اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ غیر اسلامی طرز کی ہی سہی ایک دفعہ مسلمانوں کی قومی ریاست قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ اُس کو اسلامی ریاست میں تبدیل کیا جا سکے گا۔

حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر و تبدل واقع نہ ہو کسی تدبیر سے نظامِ حکومت میں کوئی مستقل تغیر و تبدل پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

اور پھر وہ حکومت وہ قومی ریاست جس میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے۔ جن کو اکثریت رائے حاصل ہو اور رائے دہندگان میں اکثریت ان کی ہو جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہ رکھتے ہوں تو اس قومی ریاست و حکومت کو وہ آئیڈیل قسم کے مسلمان

لوگ میسر نہ آسکیں گے جن کی اُسے اپنی ترقی و تعمیر اور تحفظ و بقا کے لیے ضرورت ہوگی۔ اکثریت رائے سے ابھر کر آگے آنے والے لوگ مسلمان تو ہوں گے مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے ان کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہوگی۔ اِن قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کو اقتدار دینے والے لوگ اسی مقام پر کھڑے ہوں گے جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں ہوں گے۔ اور پھر وہ جن کو اقتدار سونپا گیا ہوگا اسلامی حکومت و ریاست میں کوئی اسلامی انقلاب لانے کی بجائے اُس کو روکنے والے جبر و استبداد کے پیکر ہوں گے۔ جن پر اگر ذرا سی بھی نقطہ چینی کی جائے گی تو وہ اپنے نقطہ چینوں کو قید و بند کی سزا نہیں پھانسی اور جلاوطنی کی سزا دیں گے۔ جیتے جی وہ غازی کہلائیں گے اور مرنے کے بعد مردِ مومن کہلاتے ہوئے پوجے جائیں گے اس لیے یہ سمجھنا تو سراسر نہ سمجھنے کے برابر ہوگا اور بالکل غلط ہوگا کہ اس قسم کی قومی حکومت کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لاسکے گی۔

اسلام درحقیقت اس انقلابی تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک معرضِ وجود میں آنے سے یعنی اپنی تکوین سے لے کر اب تک ایک ہی اساس و بنیاد اور ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اور تحریک کے سب سے پہلے عظیم لیڈر آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور آپؐ ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی حیاتِ طیبہ میں اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی ریاست کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس ریاست کی تشکیل، دستور، داخلی و خارجی حکمتِ عملی اور نظامِ مملکت کی نہج تک ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند و معتبر تفصیلات ملتی ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی و سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی و ایرانی امپیریل ازم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی تھا۔ اخلاقی خرابیاں بھی سانس لے رہی تھیں۔ خود آپؐ کے ملک میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے۔ جو کسی عظیم مدبر و مفکر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔

پوری عرب قوم جہالت، بربریت، ذلت وظلمت، اخلاقی پستی، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ عرب کے تمام علاقے دوسری قوموں کے تسلط میں تھے۔ یہودی سرمایہ دار اپنے اپنے علیحدہ گڑھ بنائے بیٹھے تھے۔ اور خود سائیلوک بنے عربوں کو اپنی سود خوری کے جال میں مکھیوں کی طرح پھنسا رکھا تھا۔ آپؐ تشریف لائے تو اپنے ملک کے ان گنت ان پیچیدہ مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ دی۔ بلکہ دعوت اسلام دی۔ کہ لوگو! خدا کے سوا تمام نقلی خداؤں کو چھوڑ دو۔ اور صرف سچے خدا کی بندگی و اطاعت قبول کرو۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ حضور اکرم کی توجہ دوسرے مسائل پر نہ تھی۔ وجہ تو صرف یہ تھی کہ آپؐ کی رہنمائی میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ ان کی اپنی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت ضرور تھی۔ لیکن ثانوی اہمیت کے حامل تھے۔ آگے چل کر آپؐ نے ان کی طرف توجہ فرمائی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کر کے رکھ دیا۔

اسلامی تحریک کے نقطہ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار۔ اور غیر ذمہ دار سمجھنا ہے۔ لیکن اسلامی نظریہ کی رو سے یہ خود اختیاری، یہ مطلقیت و عنانیت، یہ فرض ناشناسی اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان کو آزادی ملتے ہی انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، بے انصافی، بے ایمانی اور آپس کی بے اعتمادی گھس گئی تھی۔ تمام انسانی معاملات پر انفرادی، طبقاتی، قومی اور نسلی خود غرضیاں مسلط ہو گئی تھیں۔ ان کا کوئی رابطہ ایسا نہ رہا تھا جس میں ٹیڑھ نہ آ گئی ہو۔ مخالف و متحارب قوموں نے اپنے اپنے دائرہ اختیار میں جہاں تک بھی ان کا بس چلا پوری خود غرضی کے ساتھ اپنے مطلب کے اصول۔ قاعدے اور خونی قانون بنا لئے۔ اور کسی نے بھی اس کی پرواہ نہ کی کہ دوسروں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ پروا کرنے والی صرف ایک ہی طاقت رہ گئی تھی اور وہ تھی تلوار۔

اور تلوار تو ایک اندھی طاقت کا نام ہے۔ تلوار خون کے دریا بہا سکتی ہے۔ لاشوں کے پہاڑ قائم کر سکتی ہے لیکن اس سے توازن کبھی قائم نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کی

آزادی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے کہیں آگ کے شعلوں میں گر رہی تھی کہیں خون کے دھاروں میں بہتی جا رہی تھی۔ کہیں لاشوں کے انباروں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ وہ خود زخمی تھی۔ دوسروں کو زخمی کر رہی تھی۔

وائسرگس مات کے بھوت چھلاووں نے آزادی کو اپنے جادو سے ذبح خانہ کی حاملہ بکھی بنا دیا تھا وہ جہاں بیٹھ رہی تھی انسانیت کو ہلاک کرنے والے جراثیم جن رہی تھی۔

اس طرح برطانوی سامراج کے پنجرے میں مقید ۴۷ کروڑ پرندے قفس سے آشیاں تک پہنچے۔ زخموں سے چور چور — بال و پر نچے ہوئے — سسکتے اور تڑپتے ہوئے۔!!

نیا افق لہو کی لکیر

ہندوستان کی آزادی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر انہی اندھیروں میں بکھر کر رہ گئی تھی۔ اس کی آزادی کا ڈرامہ پوری کائنات کی کا ڈرامہ تھا۔

بھارت ماتا کو سوراج کا کلوروفارم سونگھا کر سرسٹیفورڈ کرپس ہوسپٹل کے آپریشن تھیٹر میں آپریشن ٹیبل پر ڈال دیا گیا تھا۔ بڑے بڑے چابکدست سرجن۔ بڑے بڑے مشاق جراح ہاتھوں میں جراحت کے اوزار اور منہ میں سگار لیے سرجری کر رہے تھے۔

سر الگ۔ دھڑ الگ۔ ٹانگیں الگ۔ پیٹ چاک کیا تو آنتیں نکال کر الگ کر دیں۔ دل، گردے، جگر، معدہ نکال کر الگ الگ رکھ دیا۔ اس کے باوجود ان کٹے ہوئے اعضا کی فعالیت میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ وہ ریزہ ریزہ نظام جسم سے الگ ہوکر بھی اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ اور پھر سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ دل دو ٹکڑوں میں تقسیم تھا اور دھڑک رہا تھا۔

یہ آپریشن فنِ سرجری، فنِ جراحت کا ایک اعجاز تھا۔ کرشمہ تھا۔ دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھا بھارت ماتا کی یہ تقسیم، یہ بٹوارہ معیاری ناپ تول اور دیانت دارانہ فہمائش و پیمائش کا ایک نرالا نمونہ تھا۔

جبکہ ٹکڑوں میں تقسیم ہر عضو جہاں جہاں پڑا تھا چیخ رہا تھا۔ دیکھو یہ کیا غضب ہے میرے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ جبکہ معدے کو یہ شکایت تھی میرا ایک تہائی حصہ جگر سے پیوست کر دیا گیا ہے۔ اور جگر کو یہ شکوہ تھا کہ آنکھیں چہرے سے نکال کر اس میں لگا دی گئی ہیں۔ دائیں ٹانگ کہتی تھی اس کا پاؤں غائب ہے اور بائیں ٹانگ کا یہ واویلا تھا کہ اس کے پاؤں کی انگلیاں نہیں ہیں۔

"نقشہ ہی بدل گیا" یہ محاورہ اس وقت بڑا بامعنی معلوم ہو رہا تھا۔ ساجھے کی ہنڈیا دوراہے میں پھوٹ رہی تھی۔ کاگا رولی مچی ہوئی تھی۔

تنقیدی شعور جاگ رہے تھے - ایک فقط ایک نقشے پر بہت سی پرکاریں پنسلیں، فیتے - ٹی سکوئریں مصروف عمل تھیں - کچھ بنا رہی تھیں -

آدھے دائرے - پورے دائرے - قوسیں - نیم قوسیں - !

نقطے - دھبے - اور لکیریں —— !

قوس پر قوس - دائرے میں دائرہ —— اور پھر اُس دائرے میں اور بہت سے دائرے - جن میں ایجنٹا اور ابلورا کی پتھر کی اپسرائیں ناچ رہی تھیں - ناٹیہ اور نرتیہ کا سیاسی ناٹک -

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا نہیں عالم تیری انگڑائی کا

انگڑائی جو قتل عام بن جاتی ہے - حسن جو قتل خانہ بن جاتا ہے - ہیجانی دور میں مختلف سمتوں سے سوچا جا رہا تھا —— !

مختلف سمتیں جنہوں نے مختلف لوگوں میں سے کسی کو فلسفی، کسی کو مدبر، کسی کو مفکر، کسی کو شاعر بنا دیا تھا - ہیجانی دور میں ہیجان کے زیر اثر ایسا بھی ہوا کہ مسئلہ تھا تقسیم کا، لیکن کچھ ہیجان زدہ لوگوں نے اُسے مشاعرہ بنا دیا -

سُپر انٹلکچوئل لوگ —— !

مشاعرہ شروع ہوا تو اُس کے ساتھ ہی آوازوں کا ایک اچھا خاصا شور شروع ہو گیا -

" چاند میری طرف آ رہا ہے یا میں چاند کی طرف چلا جا رہا ہوں "

" میں سمجھتا تھا قطرہ دریا بن جاتا ہے یہ غلط تھا - میں سمجھتا تھا شعلہ دھوئیں کی ایک جلا دینے والی شکل ہے یہ بھی غلط نکلا "

" اتارو - اُس لہولہان ننگی عورت کو اتارو - جو تقسیم کی صلیب پر کھچی ہوئی ہے "

" خی تھو خی - کتنا ظالم چونا لگا دیا گلوری میں - زبان کٹ گئی - خی تھو - پچ تھو "

" باتوں کے رسیا - بڑے خوش نصیب ہو تم فقط زبان کٹی تمہاری - ورنہ اس ہیجانی دور میں تو گردنیں کٹ رہی ہیں "

"میرے بھی صنم خانے"۔

"غلط بالکل غلط۔ میرے بھی قتل خانے"۔

"حضور غزل پیش کرتا ہوں۔ اور التجا کرتا ہوں غزل ہو چکنے کے بعد غزل کی تقطیع کی فرمائش نہ ہو۔ اور غزل آج تحت اللفظ میں پڑھوں گا۔ ایسے سخت ہاتھوں سے گلا گھونٹا گیا ہے میرا کہ آواز مشکل سے نکل رہی ہے"۔

حضرات! ایک ضروری اعلان سنیئے۔ یہ مشاعرہ آزادی کی خوشی میں ہو رہا ہے"۔

"تو پھر قتل عام بند کرو۔ مشاعرہ ہونے دو۔ ایک وقت میں دو چیزیں نہیں ہو سکتیں"۔

"حضرات! اب آپ شاعر جیات کا کلام سنیں گے۔

"اور وہ پہلے حضرت کہاں گئے جو غزل کی تقطیع نہ کرنے کی درخواست دے رہے تھے"؟

"وہ داخل دفتر ہو گئے۔ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پیٹ میں چھری کھا کر غزل پڑھنے چلے آئے تھے۔

"آہ۔ بیچارا شہید غزل۔ شہید مشاعرہ۔ شہید تقطیع"۔

"اے میاں ذرا اپنی گاندھی کیپ سر سے اتار کر دینا۔ میں اس میں دو آنسو ٹپکانا چاہتا ہوں"۔

"اے صاحب آپ آنکھوں میں کیا گن رہے ہیں"؟

"مشاعرے میں پڑی لاشیں"۔

"کیوں صاحب عنوان کیا ہے آپ کی غزل کا۔ سرنامہ"؟

"تقسیم"۔

"ایک معرکہ خیز غزل کے لیے بڑا گھٹیا سا عنوان ہے۔ عنوان تو یہ ہونا چاہیئے۔ نیا افق لہو کی لکیر"۔

شور و شغب۔ تالیاں۔ چیخیں۔ یکدم سناٹا۔!!

"یہ آپ نے غزل نہیں مخمس پڑھی ہے اور تقسیم پر کھلی چوٹیں کی ہیں۔"

"بیچارے کے چند شعر بحرِ رمل سے بحرِ رجز میں جا پڑے۔"

"بڑی بے لطفی ہے جی - منہ کا ذائقہ خراب کر دیا اِس مخمس نے۔"

"اور اِدھر ملک کا خانہ خراب کر دیا اس تقسیم نے۔"

"تقسیم نہیں بندر بانٹ کہو۔"

"حقے کی نَڑی نکالو منہ سے - رام رام کرو - میں نے دیکھ لیا ہے تمہاری بغل میں چھری ہے۔"

"سبحان اللہ کیا طرزِ کلام ہے۔"

"غزل تقسیم مقطع سے مطلع تک ایک رنگ ہے۔"

"کیا اچھا کنایہ ہے۔"

"نشست الفاظ ملاحظہ ہو۔"

"لاجواب اشعار — چمکتی تلوار - جس نے بے شمار چلتے پھرتے شعروں کے قافیے "تنگ کر دیئے" "قتل کر دیئے"۔

"اور مقطع تو کسی کوکے سکھ کی کرپان ہے۔"

"ہاں — اور آمد نہیں آورد ہے۔"

الٹی نظر کے الٹے الٹے الجھے الجھے زاویے — !

اندھیری کھائیاں ——— گرم ہوا کے جھونکے - سائے سائے جالے جالے - کتنا عجیب تھا آزادی کی ——— کا ڈرامہ — لہو لہو ایک تمثیل — زندگی اور موت کا ایک کھیل — ایک طربیہ —— ایک حزنیہ —— ایک سازینہ — ایک المیہ - ایک کامیڈی ——— ایک ٹریجڈی —— ایک روپک، جس میں رونا ہی رونا تھا — ایک اوپیرا — ایک غنائیہ — جس کا ہر کردار چیختا چلاتا کپڑوں کی آگ بجھاتا دھواں دھواں ناٹک میں دم توڑ رہا تھا۔

کتنی خوفناک فینٹسی تھی - جس میں دیکھنے والی نظریں پوری توجہ سے دیکھ رہی تھیں —

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی انہوں نے جھروکوں سے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ وقت کا ایک ایک لمحہ ان کے سامنے سے یوں گزر رہا تھا جیسے سڑک پر سے کوئی جنازہ گزر جائے۔ جیسے پھیکے پھیکے مرجھائے مرجھائے رنگ بے رنگ ہو کر تیر تے نکل جائیں۔

اُن کے چاروں طرف دیواریں ہی دیواریں تھیں۔ ٹوٹی ہوئی دیواریں۔ جن پر لہو کے چھینٹے تھے۔ جن پر گولیوں کے نشان تھے۔ جن پر نیزوں اور کلہاڑیوں کے نشان تھے۔ دیواریں جو ابھی تک جل رہی تھیں۔ دیواریں جو دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ کھُلے اور بند دروازے۔ دریچے اور کھڑکیاں۔ جو سرگوشیوں میں کہہ رہی تھیں۔

اب یہاں کوئی نہیں آئے گا ——— !

اور نقشے پر ایک سُرخ لکیر تھی۔ جو سانپ کی طرح رینگتی چلی جا رہی تھی۔

بڑی پراسرار اور ڈراونی لکیر۔

اور میں بھی اُس لکیر پر چل دیا۔ میں جو ایک فرد نہیں۔ میں جو ایک نسل ہوں۔ میں جو ایک قوم ہوں۔ میں جو ایک ملک ہوں۔ میں جو ایک زندگی ہوں۔ ابدی و دائمی۔!

میں اُس لکیر کو ناپنا چاہتا تھا کہ کتنی لمبی ہے۔ کہاں تک جاتی ہے۔ میں اُس کے آر پار دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس کو کن منزلوں، کن مرحلوں کن فاصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مجھے کچھ معلوم نہ تھا یہ چلتی ہوئی سرخ لکیر کہاں رکے گی۔ نہ جانے میں کہاں رکوں گا۔ اُس وقت رِم جھم ہو رہی تھی۔ میں نے ابھی پہلا قدم اٹھایا تھا کہ میرے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا۔ میں نے اُسے کھینچ کر وہاں اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

اجالے میں اندھیرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ سفیدی میں سیاہی گھُل رہی تھی۔ میں اپنے آپ سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ اور میرے قریب سے گزرتی ہوئی ہوائیں مجھے ہنکارا دے رہی تھیں جیسے میں سرگوشیوں میں کوئی کہانی کہہ رہا تھا۔ سرخ لکیر پر میں نے ایک ٹنڈ منڈ پیڑ دیکھا۔ جو اپنی زبان میں کہہ رہا تھا۔

"میں آج بھی اُس کا منتظر ہوں۔ میں کل بھی اُس کا منتظر رہوں گا"

وہ کس کا منتظر تھا۔ یہ میں اُس سے معلوم نہ کر سکا۔ میں رواروی میں تھا۔ تھوڑی دُور چل کر میں نے ایک دیوار دیکھی۔ جس پر میرے نام کے ساتھ گندی گالی لکھی ہوئی تھی۔ اور گندی گالی کی بڑی ہی گندی تصویر بنائی گئی تھی۔

مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں عجیب سے مٹیلے رنگوں میں گھُل رہا ہوں۔ میں نے دیوار سے کہا۔

"اس میں تمہارا کچھ قصور نہیں۔ قصور تو اُن لوگوں کا ہے جو بذات خود ایک گندی گالی ہیں۔ چلتے پھرتے پیپ آلودہ ناسور۔"

میں آگے بڑھا۔ اندھیرے کے پہاڑ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور سرخ لکیر کے دونوں طرف گھنی خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جن میں میں نے لانبے لانبے بالوں والے انسانوں کی بھٹکی ہوئی وہ پرچھائیاں دیکھیں۔ جن کے جسم مکڑیوں کے جالوں سے اٹے تھے۔ معلوم نہیں وہ اندھیروں میں کیا دیکھ رہے تھے۔ کیا ڈھونڈ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پرچھائیاں دھندلکوں میں شکاری کتوں کی طرح کسی چیز کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ ان کے چہروں میں آنکھیں ایسی تھیں جیسے کالے سوراخ ـــــ!

اور پھر میں نے انہی جھاڑیوں میں ایک شخص دیکھا۔ وہ زخمی تھا۔ کراہ رہا تھا۔ اُس نے انسانیت کے دکھ اوڑھ رکھے تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اُس نے کہا۔

"انسانیت کے چیتھڑوں کا سوداگر۔ میں ظالموں کی تلواروں سے گھائل ہونے والوں کی مرہم پٹی کرنے گھر سے نکلا تھا۔ ایک ظالم نے مجھے بھی گھائل کر دیا۔ میرا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ میں مر رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"تمہاری موت پھول کی موت ہوگی۔ چاند کی موت ہوگی۔"

اور اس کی آنکھوں میں صبح کی سپیدی جاگ اٹھی۔ اُس نے اپنے اُن احساسات

کو چند حروف والفاظ میں ڈھال دیا جو اُس کے قلب و جگر میں سُلگتے ہوئے انگارے بن چکے تھے۔ اُس نے اپنے آخری لمحوں میں اپنی اُن نواؤں کو حروف و الفاظ میں سمونے کی کوشش کی تھی جو جذبات کی دنیا میں آہ و فریاد کے سوا کچھ نہ تھیں۔

اُس نے اپنے اُن چند حروف والفاظ میں دورِ قتل و غارت کے روز و شب کے ان جنون انگیز لمحوں کا اختصار سے ذکر کیا تھا جن میں کٹی ہوئی گردنوں کی مہیب چیخیں رونما ہونے والے واقعات کو ترتیب دینے میں مصروف تھیں۔

بس ایک نقطہ تھا جس پر پرکاریں گھومے جا رہی تھیں۔ اور مختلف اشکال رونما ہو رہی تھیں۔

ایک ذرہ — ایک تنکا — ایک قطرہ — ایک پتہ — ایک کانٹا — ایک چھوٹی سی خواہش — ایک ذرا سا وہم۔ بڑے سے بڑے واقعات اور بڑے سے بڑے نتائج برآمد کر سکتا ہے۔ سرِ راہ ایک معمولی واقعہ کے بطن سے اکثر خوفناک واقعات اور خون ریز انقلابات پیدا ہوتے ہیں۔ سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ تاجداروں کے تاج چھن جاتے ہیں۔ تخت الٹ جاتے ہیں —

کسی چولہے یا تندور سے ایک چنگاری اڑتی ہے۔ جھونکے اُس کے ساتھ کھیلتے ہوئے خشک گھاس تک لے جاتے ہیں۔ چنگاری کو گھاس میں چھوڑ دیتے ہیں۔ گھاس کو آگ لگ جاتی ہے۔ شعلے اٹھنے لگتے ہیں — اور پھر جہاں تک خشک گھاس پھیلی ہوتی ہے بھڑکتے شعلے پھیل جاتے ہیں۔ تو شعلے پہلے ایک درخت کو لپیٹ میں لیتے ہیں۔ اُس کے بعد دوسرے درختوں سے لپٹ جاتے ہیں۔ تو دیکھتے ہی دیکھتے سارے جنگل کو آگ لگ جاتی ہے۔ گھونسلے جلتے ہیں۔ پرندے جلتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس جنگل کے جانور اور زمین بھی جل جاتی ہے۔

اسباب و نتائج کا یہ سلسلہ کس قدر خوفناک اور کس قدر خیال انگیز ہے۔ ان اسباب و نتائج سے مورخوں کی تاریخ کے ہزاروں صفحات بھر جاتے ہیں۔ ان صفحات کا آغاز ایک ذرا سا نقطہ ہوتا ہے۔ انسانیت کے چیتھڑوں کا سوداگر مر گیا۔ اور انسانیت کے جو دکھ اُس نے اوڑھے ہوئے تھے وہی اُس کا کفن بنے۔ میں نے اُس نقطے ہی میں اُسے دفنا دیا جس پر

پرکار گھوم رہی تھی۔

میں آگے بڑھا۔ میں اُس وقت نہایت شدت سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ دھرتی کے پھول مرجھا گئے۔ آسمان کے تارے ٹوٹ گئے۔ اب انسانوں کے لیے اس دنیا میں روشنی اور خوبصورتی کا کوئی تصور باقی نہ رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر طرف موت اور اداسی کے دروازے کھل گئے ہوں۔ جیسے ہر چیز موت کا بھیانک رمزیہ خواب بن گئی ہو۔ جیسے اُس اندھیرے میں کوئی بھی اپنے ماضی کے کسی نشان کو نہ پہچان رہا ہو۔ جیسے آزادی کے مینار کی دیواروں میں درد کی اینٹیں چنی جا رہی ہوں اور ہر دیوار پر زہریلے سانپ بچھو رینگ رہے ہوں۔ جیسے وقت ٹھہر گیا ہو اور اُس کا ایک ایک لمحہ رک رک کر بوجھل قدموں سے وقت کی گزرگاہ پر نہیں میرے دل کے ویران شاہراہ پر سے گزر رہا ہو۔

میں اور آگے بڑھا۔ تو مجھے اپنی سانسوں سے گرم گرم ہتھوڑوں کی چوٹوں کی آواز آنے لگی۔ مجھے اپنی آنکھوں سے نیزے نکلتے محسوس ہوئے۔

کچھ ایسی علامتیں جو روحِ انسانی کی فریادوں کا سرنامہ بن جاتی ہیں۔

میں اُس وقت کسی وقتی اشتعال اور جذباتی اُبال میں مبتلا نہ تھا۔ میرے دکھ کی تہیں ذاتی بھی تھیں۔ تاریخی بھی اور انسانی بھی۔ میرے فکر و خیال میں جوش و جذبہ کا کوئی انتشار نہ تھا۔ بلکہ وحدت فکر اور تدبر کا تسلسل موجود تھا۔ جبکہ یہاں پہنچ کر سرخ لکیر مشرق سے مغرب کی طرف گھوم گئی تھی۔ اور اُس سے کئی راستے نکل رہے تھے۔ لیکن میں نے اُس لکیر کو نہ چھوڑا۔ تو تھوڑی دور جا کر میں نے کچھ ایسے انسانوں کو دیکھا جن کے چہروں پر عجیب سی آسیبی کیفیت طاری تھی اور وہ گڑھوں میں چھپے ہوئے تھے۔ گڑھوں میں سڑی گلی لاشیں تھیں۔ وہ لاشوں پر بیٹھے تھے۔

اور میں جوں جوں اُس سرخ لکیر پر آگے بڑھتا گیا۔ مجھے لاشیں ہی لاشیں نظر آنے لگیں۔ مردوں کی لاشیں۔ عورتوں کی لاشیں۔ بچوں کی لاشیں۔ بوڑھوں کی لاشیں۔ سڑی گلی لاشیں۔ ننگی لاشیں۔ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی لاشیں۔ جن کو کتے کھا رہے تھے۔ گیدڑ کھا رہے تھے۔

کوے اور چیلیں نوچ نوچ کھا رہی تھیں۔ گدھ کھا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے لاشوں کے کھیت اُگے ہوئے ہیں۔ کنوئیں میں لاشیں پڑی بساند چھوڑ رہی تھیں۔ ندی نالوں میں لاشیں بہتی جا رہی تھیں۔ ان گنت لاشیں۔ لاشوں کے ڈھیروں کے ڈھیر۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ کونسی لاش کس کی ہے۔

ہر طرف سناٹا ہی سناٹا۔ جلے ہوئے شہر۔ جلے ہوئے گاؤں۔ جلی ہوئی بستیاں۔

اور کئی بستیاں۔ کئی گاؤں ایسے بھی تھے جن کی صرف راکھ کے ڈھیروں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں بھی ایک گاؤں تھا۔ یہاں بھی ایک بستی تھی —!!

یہاں بھی کبھی انسان بستے تھے —!

یہاں بھی کبھی زندگی کی چہل پہل موجود تھی جواب نہیں تھی —!

اچانک ہوا تیز تیز چلنے لگی۔ تو سرخ لکیر سے سرخ بگولے اٹھنے لگے۔ ہر بگولا ہندوستان کا ایک نقشہ تھا۔ جیسے ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بگولوں میں بٹ گیا ہو۔ ہر بگولے میں ایک ناٹک ہو رہا تھا۔ بگولے مہیب سایوں کی طرح میرے قریب سے گزرنے لگے اور ان سایوں کا کوئی نام نہ تھا۔

اب ہر طرف ایک قیامت خیز شور سنائی دینے لگا تھا۔ دردناک چیخوں کے طوفان سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں ایک بگولے میں گھس گیا۔ اور بڑے غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر طرف ریلوے لائنوں کا جال سا بچھا تھا۔ میلوں پھیلی ہوئی ریلوے لائنیں۔ اور ساسٹیشن۔ کسی اسٹیشن میں سکرات موت کا سناٹا تھا۔ انسان کیا چیونٹی بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ کسی اسٹیشن میں بڑی بھیڑ ہو رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہزاروں لوگ کبوتروں مکوڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔

گرینڈ ٹرنک ایکسپریس — فرانٹیر آف پشاور — پنجاب میل۔ دکن کوئین۔ سب ٹرینیں بیس گھنٹے بائیس گھنٹے لیٹ آ رہی تھیں۔ کہیں سگنل گرے ہوئے تھے۔ کہیں سگنل اٹھے ہوئے تھے۔ کہیں سگنل ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کی سبز اور سرخ بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

میں ایک اسٹیشن پر رکی ہوئی ایک ٹرین کی طرف بڑھا۔ اُس کے ہر ڈبے میں جھانک کر دیکھا۔

تمام ٹرین خالی پڑی تھی - ایک کوپے کی اوپر کی جالی پر ایک ٹوٹی ہوئی ٹوکری رکھی تھی - اس کے سوا کسی قسم کا سامان نہ تھا - کوئی جاندار، کوئی آدمی اس ڈبے میں موجود نہ تھا - فرش پر، نشستوں پر، لکڑی کی دیواروں پر خون کے دھبے ہی دھبے تھے - گوشت کے لوتھڑے تھے - ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن کے درمیان اس ٹرین پر حملہ ہوا تھا -

میں نے ایک اور ٹرین کو دیکھا - جو مناسب رفتار سے چلی جا رہی تھی - اور کھچا کھچ بھری ہوئی تھی - کسی کوپے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی - سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ ہر ڈبے کی چھت پر بیٹھی ہوئی تھیں باہر پائدان کے لوہے کے ڈنڈوں سے لٹک رہی تھیں - گٹھڑیاں، صندوق صندوقچیاں، کنستر، بستر - مختصر مختصر سامان - اس ٹرین کو روکنے کے لیے لائن پر پتھر رکھ دیئے گئے تھے - ٹرین پتھروں کے قریب پہنچ کر رک گئی - تو لائن کے دونوں طرف اگی ہوئی قدآور جھاڑیوں سے بلوائی نکل آئے - وہ سب مسلح تھے - انہوں نے بھری ہوئی آوازوں میں نعرے لگا کر ٹرین کے مسافروں پر دہشت طاری کی اور پھر ان پر دھاوا بول دیا - قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا - جوان عورتیں اغوا ہونے لگیں - خون سے بھرے ہوئے ایک ایک ہاتھ میں دو دو چار چار نازک کلائیاں تھیں جوان لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جانے لگا - میں نے آنکھیں بند کر کے ایک جھرجھری لی اور دوسرے بگولے میں اتر گیا - تو مجھے ہر طرف آگ ہی آگ نظر آئی - شور ہی شور سنائی دیا - بپھری ہوئی آوازیں - گرجتی کڑکتی آوازیں -

ست سری اکال

اللہ اکبر

ہر ہر مہا دیو - بندے ماترم - !!!

برچھے، نیزے، کرپانیں اور تلواریں چمک رہی تھیں - راشٹریہ سیوک سنگھ - مہا سبھائی - جن سنگھی - مختلف مذہبی تنظیمیں - دہشت پسند - شر پسند - تخریب کار - جن کی اپنی رگیں، نبضیں، اعصاب، خون کی گردشیں فرقہ وارانہ تعصب سے متاثر تھیں مکانوں دکانوں کو آگ لگائی جا رہی تھی جگہ جگہ بموں کے دھماکے ہو رہے تھے - چاروں طرف پتھر برس رہے تھے - ہندو پتھر - مسلمان پتھر - سکھ پتھر - بت پرستوں کے پتھر - خدا پرستوں

کے پتھر۔ تیزاب کی پچکاریاں چل رہی تھیں۔ لہو کے فوارے اچھل رہے تھے۔ سوڈے کی بوتلوں کی بارش ہو رہی تھی۔

گھر لوٹے جا رہے تھے۔ عصمتیں لوٹی جا رہی تھیں۔ زخمی اور گھائل سکھ سفر کر رہے تھے۔ زخمی اور گھائل مسلمان سفر کر رہے تھے۔ گھائل اور زخمی ہندو سفر کر رہے تھے۔ میلوں کا سفر، ہزاروں کا سفر۔ سفر جس میں بھوک تھی۔ پیاس تھی۔ موت تھی۔ آگ ہی آگ تھی۔ خون ہی خون تھا۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں نے بارہ لاکھ کی جیپ اور لاریاں خریدی تھیں۔ ان سب کو بھارت ماتا کی آزادی کا سرسام ہو رہا تھا۔

میں تیسرے بگولے میں اتر گیا۔ نئے قاتل۔ نئے مقتول۔ ایک اسپیشل ٹرین کا ایک ڈربہ صرف عورتوں کے کٹے ہوئے پستانوں سے بھرا تھا۔ دوسری اسپیشل ٹرین میں جو پہلی ٹرین کی مخالف سمت سے آ رہی تھی کے ایک کوپے میں صرف گردنیں ہی گردنیں کٹی پڑی تھیں۔ ایک ٹرین شرنارتھیوں کی۔ دوسری ٹرین مہاجروں کی۔

اور میں سر پکڑ کر سوچنے لگا۔ کیا یہ وہی انسان ہے جو ارتقا کی سیڑھی کی اتنی منزلیں طے کر کے یہاں پہنچا ہے؟

ایک جگہ فوج کے چار سپاہی سنگینیں تانے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے پندرہ بیس مادر زاد ننگی لڑکیاں چلی جا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ خشک تھے۔ ان کے بال الجھے ہوئے تھے۔ ان کے ننگے پیر جھلس چکے تھے۔ سامنے ایک مندر تھا۔ جس کے سامنے مالسری کا پیڑ تھا۔ جس کے نیچے ایک پر جبروت شخصیت کا انسان کھڑا تھا۔

اتنے میں دو پرچھائیاں اس کے قریب سے گزریں۔

"یہ کون ہے؟" ایک پرچھائی نے دوسری سے پوچھا۔

یہ ارسطو ہے"۔ دوسری پرچھائی نے جواب دیا۔

اور میں چونک گیا۔ ارسطو — محسن انسانیت۔ جس نے انسانیت کی عظمت کے لیے زہر پی لیا۔ ارسطو — جس نے حوا کی مادر زاد ننگی بیٹیوں کو دیکھ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

لیکن ایک لڑکی ذرا تیز نکلی۔ پلٹ کر اس نے ارسطو سے کہا۔

آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھالے۔ دیکھ ہمیں غور سے دیکھ ہمیں سینکڑوں بھیڑیوں نے چیرا پھاڑا۔ سینکڑوں گدھوں نے ہماری بوٹیاں نوچیں۔ ہمیں سینکڑوں مردوں نے خراب کیا۔ آتو بھی خراب کرلے۔"

کورو کشیتر میں سری کرشن نے ارجن کو عمل کا اپدیش دیا۔

شریمد بھگوت گیتا کے دسویں ادھیائے میں بھگوان نے کہا۔ میری ذات ہر شے کی خلاق ہے۔ میں ہر شے میں ہوں۔ ہر شے مجھ میں ہے۔ جن کو اس بات کا علم و عرفان ہے میری ہی ذات سے دھیان لگاتے ہیں۔ وہ میری ہی خواہش کرتے ہیں۔ مجھے ہی پریم کرتے ہیں۔ اور میں پریم کی لیلا ہوں۔ میں پریم کا ساگر ہوں۔ جو میری ذات میں قطرہ بن کر سما جاتے ہیں میں ان کو بدھی کا یوگ گیان دیتا ہوں۔

لاکھوں شرن آرتھی اسی کورو کشیتر کے میدان میں جمع تھے۔ جیسے زمین پر چیونٹیاں، حشرات الارض۔ رینگنے اور کلبلانے والی مخلوق۔ ہیضہ۔ ڈھیریا۔ پیچش۔ نمونیا، بیماریاں۔ موت، ہزاروں انسانوں کا ایک سیلاب تھا جو سینکڑوں میل سے مختلف دھاروں میں بہتا چلا آیا تھا۔ اور یہاں اُس کا بند سا باندھ دیا گیا تھا۔

راستے بھر یہ انسان دن کو چلتے رہے۔ لٹتے رہے۔ راتوں کو ٹھہرتے رہے لٹتے رہے۔ ان کے بچے ذبح کئے گئے۔ ان کے جوان مارے گئے۔ ان کی عورتیں چھینی گئیں۔ پھر انہوں نے سرحد پار کرکے۔ لہو کی لکیر سے آگے نکل کر انتقامی ردعمل سے انتقامی رویہ اختیار کرلیا۔

اب یہ دن کو چلتے رہے لوٹتے رہے۔ چھاپے مارتے رہے۔ راتوں کو ٹھہرتے رہے۔ لوٹتے رہے۔ چھاپے مارتے رہے۔ بچوں کو ذبح کرتے رہے۔ جوانوں کو مارتے رہے۔ عورتوں کو پکڑتے رہے۔ جس طرح ٹڈی دل آکے ہزاروں میل تک کھیتوں کو صفا چٹ کر دیتا ہے انہوں نے ہندوستان و پاکستان کی انسانیت، اخلاق اور تہذیب کو ختم کر دیا۔ یہ سب کچھ ہندوستان اور پاکستان کے نام پر ہوا۔

مجھے بدنام کیا گیا۔ میری تذلیل کی گئی۔ میرا مذاق اڑایا گیا۔ مجھے غلط سمجھا گیا۔ میرے وجود میں آنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس برصغیر میں قیامت آجائے۔ میں قتل عام نہیں ایک پرامن مطالبہ

تھا - ایک اٹل حقیقت تھا - ایک نظریہ تھا - ایک نصب العین تھا - میں ایک تقاضا تھا - میں وقت کی آواز تھا - میں اس وقت بھی ایک مملکت ایک ملت ایک امت تھا اور آج بھی ہوں -

لفظ مملکت جس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے قرآن و احادیث میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے امت اور ملت کے الفاظ ملتے ہیں لیکن اس ہیجانی دور میں اور اب بھی غیر اسلامی ائمہ فکر نے میرے متعلق جو نظریے پیش کئے وہ اسلامی نظریے سے کوئی بنیادی مماثلت نہیں رکھتے -

اس کی اصلی وجہ وہ صریح فرق ہے جو ایک غیر اسلامی معاشرے اور ایک اسلامی معاشرے کے افراد کے ذہن میں پایا جاتا ہے - کیونکہ معاشرے کا تصور مملکت معاشرہ کے افراد کے ذہن اجتماعی کا ہی پرتو ہوا کرتا ہے - یہ تصورات حیات ہی ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل کرتے ہیں - اور شعبوں کے مطابق انفرادی سیرت و کردار اور پھر اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورت اختیار کرتے ہیں - اور انہی پر تمدن کی پوری عمارت بلند ہوتی ہے -

اس میں شک نہیں کہ مملکت ایک فطری خواہش کی تکمیل کی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان انسان اپنی فطری ضروریات کی تکمیل کی خاطر انفرادی طور پر فطرت کے خزانوں کی تلاش میں تگ و دو کرنے کی بجائے اپنے ہم جنسوں کو ڈھونڈنے لگا - اور ان کے اتحاد و تعاونِ عمل سے ایک خاندان کی بنیاد پڑی - اور جب ایسے کئی خاندان آباد ہو گئے اور ان کے مابین تعلقات میں ذرا پیچیدگی پیدا ہونے لگی - تو انسان کے عمل ارتقا کا میدان وسیع تر ہونے لگا - یہاں تک کہ ان چند خاندانوں یا معاشرے میں رہنے والے افراد کے تعلقات کا ایک مستقل نظام خود بخود وجود میں آ گیا - لیکن اس ارتقا کے دوران معاشرے کے تمام افراد کے ذہنوں میں نہ تو عدل و انصاف کا اس قدر واضح تصور موجود تھا اور نہ ان کے تمام افعال احساسِ عدل کے اس طرح تابع ہوتے تھے - کہ امور اجتماعی کی تکمیل کے سلسلے میں ان کے درمیان نزاعات نہ برپا ہوں -

اس وجہ سے مختلف خارجی اثرات کے زیر اثر افراد کے نفس اجتماعی میں رفتہ رفتہ سیاسی شعور پیدا ہونے لگا - اور ان حالات کے دفعیہ کے لیے وہ سیاسی ادارات کے قیام کی ضرورت محسوس کرنے لگا اور بعض معاشری امور کی تنظیم اور ان کی تکمیل سے خود بخود ایک سیاسی نظام

وجود میں آنے لگا۔

ارتقا کے اس درجہ کو پہنچے ہوئے جن سیاسی معاشروں کی تاریخ نشان دہی کر سکتی ہے ان میں سے ایک قدیم زمانے کی یونانی مملکت ہے جس کے پاس مملکت کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ یہ آپ اپنی غایت ہے۔ شاید باہمی نزاعات اور بدنظمی کے شدید تجربہ کے بعد مملکت کا قیام ان کو جن فوائد کا حامل نظر آیا اس کے تحت ذہن اجتماعی میں مملکت کی اس قدر مبالغہ آمیز حد تک عزت پیدا ہو گئی لیکن فرد کی اہمیت کو نظرانداز کر دیا گیا۔ اس کی حیثیت مملکت کے مقابلہ میں محض ایک جز کی تھی جس کو ضرورت کے وقت آسانی سے نظرانداز کیا جا سکتا تھا۔ فرد کی ہستی صرف اُس وقت تک ضروری اور قابل قدر سمجھی جاتی تھی جس حد تک وہ مملکت کے کام آ سکتی تھی۔

لیکن اس نظریے کے مبالغہ آمیز اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہ ہونے کی بنا پر خود اسی سیاسی معاشرے کے مفکرین یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ مملکت کی کوئی صحیح غایت معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ افلاطون نے ایک آئینی حکومت پر رائے زنی کرتے ہوئے اُس کے قیام کی وجہ یہ بتائی ہے کہ افراد کی ضروریات کی تکمیل کی جائے کیونکہ ہر فرد اپنی لامتناہی احتیاجات کی تکمیل کے لیے دوسرے کا محتاج ہے۔

افلاطون کا یہ نظریہ اس دور کے مروجہ نظریے سے بالکل متضاد ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ قدیم یونانی نظریہ اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے مفکرین کو دوسری مخالف سمت کی حد تک بڑھے جانے کی دعوت دیتا تھا۔ چنانچہ افلاطون کی اِس تفریط کو خود اُس کے شاگرد ارسطو نے محسوس کیا۔ اور اپنے دماغ کو ماحول کے مضر اثرات سے بچا کر غور و تامل کے بعد اپنا یہ نظریہ پیش کیا کہ مملکت کا قیام ایک فطری تقاضے کی تکمیل ہے۔ اس کی ابتدا تو واقعی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے ہوئی لیکن اس کو جاری رکھنے کا عمل ترقی کرنے اور اچھی زندگی بسر کرنے کی خواہش کا نتیجہ ہے۔ مملکت فطری تخلیق ہے۔ اور انسان ایک سیاسی حیوان ہے۔

ارسطو کے اس نظریے کو ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی اور لوگوں نے اس میں اتنی صداقت محسوس کی کہ صدیوں تک کسی نے اس کی تردید کرنے یا اس میں کچھ اضافہ کرنے کی جرات نہ کی۔

سترھویں صدی عیسوی میں اس کا ردعمل شروع ہوا۔ اور الفتھوسیس نے معاہدہ

عمرانی پیش کیا۔ ہابز، لاک اور روسو نے معاہدہ معاشری کے نظریے کا ارتقا مکمل کیا۔ اس نظریے کا بنیادی تصور یہ ہے کہ مملکت کے قیام کا مقصد انسان کو حالتِ فطری کی ناقابل برداشت کیفیت سے نجات دینا اور امن و خوشحالی مہیا کرنا ہے۔ حالت فطری سے مطلب ان کے ہاں انسانی زندگی کا وہ دور ہے جب انسان مملکت کی تمام بندشوں سے بے گناہ تھا۔ اس حالت کے متعلق ان تینوں مفکرین کی رائے الگ الگ ہے۔ لیکن آخر کار سب اس امر پر متفق ہو جاتے ہیں کہ حالت بالکل ناقابل برداشت ہوگئی تھی اور اس سے چھٹکارا پانے کی خواہش مملکت کے قیام کی وجہ بنی۔

سترھویں صدی میں یورپی ممالک کی سیاسی و ذہنی حالت کے پیش نظر لوگ اس نظریہ میں بڑی دلچسپی لینے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو وہ شہرت حاصل ہوئی کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر تک ہر مفکر کسی نہ کسی طرح اس نظریہ کا پیرو نظر آتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے بعد البتہ اس تصور کو غلط ٹھہرایا گیا اور مختلف نظریے بنتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ نظریہ کہ مملکت کے قیام کی غایت محض افراد کی خوشحالی ہے مقبول عام ہوگیا۔

گویا اس حد پر پہنچ کر مملکت کی غایت کے متعلق جو نظریہ بنتا ہے وہ قدیم یونانی نظریے کے بالکل برعکس ہو جاتا ہے۔ ان دونوں نظریوں کی تشکیل کے درمیان کے زمانے میں ان دونوں نظریوں کے بین بین ممکنہ شکل کے نظریے بھی وجود میں آئے۔ لیکن اس کے باوجود مجھ کو ان تمام نظریوں اور اسلام کے پیش کردہ نظریہ و نظام میں کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ اور اس کی وجہ تصورات حیات کا بنیادی فرق ہے۔

اسلامی تصور حیات کے اور جتنے بھی تصورات ملتے ہیں انہیں خود انسانی غور و فکر نے نامکمل قرار دیا ہے کہ یہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط نہیں۔ مسیحی تصور اپنی رہبانیت اور روحانی و دینی اقتدار کی تقسیم کی وجہ سے سخت ناکام ثابت ہوا۔ اور اس کے پیرووں نے اپنی دنیوی ترقی کی خاطر یہ مناسب سمجھا کہ اسے کلیسا و صلیب تک ہی محدود کر دے۔ ہندوستان میں بھی مختلف تصورات حیات مثلاً جین مت، بدھ مت وغیرہ اسی وجہ سے نامکمل ثابت ہوئے۔ لیکن اسلام کا تصور حیات انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے یہاں روحانیت اور سیاست کی بے معنی تقسیم نہیں ہے۔

اسلام کے اس کامیاب تصور حیات کو عملی جامہ پہنانا ہی اسلامی مملکت کے قیام کی غرض وغایت ہے جس کی تشریح قرآن واحادیث میں جا بجا نظر آتی ہے۔

سورۂ آل عمران میں ایک جگہ فرمایا۔

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔!!

ایک دوسری جگہ سورۃ الانعام میں فرمایا۔

وہ ہے اللہ وہی تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی اللہ نہیں۔ وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ پس تم اس کی عبادت کرو۔ وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔!!

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ مملکت اسلامیہ کے قیام کی بڑی غایت وغرض خدا کی عبادت ہے۔ لیکن یہاں امر کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم وہی نہیں جو دیگر مذاہب میں لیا جاتا ہے۔ کہ دنیا سے دامن کش ہو کر آبادی سے دور انسانی قوانین کو بھلا کر خدا کی یاد کی جائے۔ اسلام کے تصور عبادت میں وہ گیرائی وگہرائی موجود ہے جس سے وہ سارے مقاصد حاصل ہوتے ہیں جو کسی مملکت کے قیام سے وابستہ کئے جا سکتے ہیں۔

اسلام میں عبادت کی جو وسیع تنظیم ہے اس سے قطع نظر صرف نماز کی ہی اہمیت پر غور کریں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس طرح انسانی ذہن میں اجتماعی زندگی کے اصول و قواعد مرتب کرتی ہے۔ اور ایک عالمگیر قومیت کے نظریہ کو کس طرح پروان چڑھاتی ہے۔

قیام مملکت کی غایت کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر زمین پر حکومت عطا کریں گے تو یہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم کریں گے۔ اور بدی سے روکیں گے۔

اس غایت مملکت کی تکمیل سے ایک مکمل نظام اخلاق کے ساتھ ساتھ ایک مستقل نظام سیاست اپنی تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ خود بخود مرتب ہو جاتا ہے جس میں نہ صرف اپنے ہی افراد کے لیے قرآن کے نظام زندگی پر عمل پیرا ہونے کے لیے وسائل مہیا کئے گئے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا دینے کی بھی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی یہ

ذمہ داری ایک عالمگیر قومیت اور انسانی برادری کی تحریک ہے۔ اور اس کی اتنی اہمیت ہے کہ راہ میں حائل ہونے والی مشکلات کے خلاف جہاد کا حکم آیا ہے۔

اس غایت مملکت کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام ہر غیر اسلامی تصور حیات کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ اور اُس کا اس معاشرے سے کوئی تعلق نہ ہوگا جو برائے نام اسلامی معاشرہ تو ہو لیکن جس میں اسلامی روح باقی نہ ہو۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں کانگرس نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے ترانے الاپتے ہوئے مسلمانوں کے سامنے جس مشترکہ ہندوستان اور جس طرز حکومت و مملکت کا ریزولیوشن پیش کیا تھا اُس میں اسلامی تصور حیات بالکل مفقود تھا۔ اور اگر تھا تو وہ اپنی صحیح شکل میں موجود نہ تھا اُس کے خدوخال غیر اسلامی تھے۔ اور جس معاشرے میں مشترکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے آزادی کا سانس لینا تھا اُس میں اسلامی روح نہ تھی۔ اور وہ مملکت جو ہندوستان میں بسنے والی قوموں نے متفقہ طور پر تشکیل دینی تھی وہ لادینی تھی اس لیے غیر اسلامی تھی۔ ایسی صورت میں اور ایسے حالات میں میں وجود میں آیا۔ میں ۱۰ کروڑ انسانوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔ ایک قوم کا فیصلہ تھا۔ ایک نصب العین کا فیصلہ تھا۔ لیکن مجھے بدنام کرنے کے لیے۔ زمانہ بھر کی برائیاں مجھ سے وابستہ کرنے کے لیے۔ ابتدا ہی میں میرا گلا گھونٹ کر ختم کر دینے کے لیے فتنہ و فساد کی ایک قیامت اٹھا دی گئی۔ مجھے سرخ بگولوں اور سرخ آندھیوں کی زد میں رکھ دیا گیا۔ وہ کونسی کڑکتی بجلیاں تھیں جو میرے آشیانے پر نہ گرائی گئیں۔ وہ کونسے طوفان تھے جن کا رخ میری طرف نہ موڑا گیا۔ وہ کونسے زلزلے تھے جو مجھے گرا کر پاش پاش کر دینے کے لیے میری طرف نہ دھکیلے گئے۔ وہ کونسی زنجیریں تھیں جو مجھے نہ پہنائی گئیں۔ وہ کونسے دھچکے تھے جو مجھے نہ لگائے گئے۔ نئے افق پر جب میں نے پہلا قدم رکھا تو زخموں سے چور چور تھا۔ میرے چاروں طرف کالے بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں کوند رہی تھیں۔ کسے امید تھی کہ میں زندہ رہ سکوں گا لیکن اٹل حقیقتیں کبھی مرا نہیں کرتیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ میں زندہ ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ اغیار نے مجھے تو نئے افق کی پہلی سیڑھی پر ہی ہمیشہ کی نیند سلا دینے کی بڑی کوشش کی تھی۔ میرے ساتھ مسلمانوں کو بھی برِاعظم ہندوستان سے ملیا میٹ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

ہندوستان کی تقسیم کا سوال۔ حد بندی کا سوال میری قومی زندگی میں ایک بڑا ہی اہم اور نازک سوال تھا۔ اس کو حل کرنے کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت تھی کہ میرے نقشے، میرے حدود اربعے کی ایک انچ زمین بھی میرے ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

ہندوستان کی کرنے کے لیے مقراض انصاف سر ریڈ کلف کے ہاتھ میں تھی۔ وہی ہندوستان کی آزادی کی اچکن کی کتر بیونت کر رہے تھے۔

برٹش پارلیمنٹ نے سر ریڈ کلف کو تقسیم ہند کے کامل اختیار دے کر بھیجا تھا۔ ۷ اگست کی شام کو جب پاکستان و ہندوستان کی حدود کا اعلان ہوا تو غیر مسلموں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور مسلمان رو رہے تھے۔ اور میں سکتے میں آ گیا تھا۔

بنگال میں مرشد آباد کا ضلع جہاں مسلمان ۵۵ فیصد تھے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ جب سر ریڈ کلف ہندوستان کے نقشے میں جھانک رہے تھے۔ انہوں نے ترنگی گاگل آنکھوں پر لگائی ہوئی تھی۔

انہوں نے مقراض چلائی اور دیناج پور کا آدھے سے زیادہ حصہ بھی ہندوستان کو دے دیا۔ ضلع ندیا بھی آدھے سے زیادہ ترنگے جھنڈے کے سائے میں چلا گیا۔ سلہٹ کا ضلع بھی آدھے سے زیادہ ہندوستان کو تفویض کر دیا۔

گورداسپور کا ضلع مسلم اکثریت کا ضلع ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔

تحصیل فیروزپور جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور تحصیل اجنالہ جہاں نوے فیصد مسلمان تھے ہندوستان کو عطا کر دی گئیں۔

اسی طرح ضلع جالندھر اور ضلع ہوشیارپور کی کئی تحصیلیں مسلم اکثریت کی تھیں وہ بھی ہندوؤں کو بطور پرِ غمال عنایت کر دیں۔

فیروزپور کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے منٹگمری اور بہاولپور کے لاکھوں ایکڑ رقبہ کو سیراب کرنے والی نہروں کی کنجی ہندوستان کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ جبکہ گورداسپور سے محروم ہو جانے سے کشمیر کا پورا علاقہ ہندوستان کے لیے کھل گیا۔ پٹیالہ، نابھہ، فریدکوٹ، جنید اور کپورتھلہ کی سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کی لاکھوں کنواریوں کی عصمت دری نہ ہوتی مشرقی پنجاب

کا علاقہ ہرگز ہرگز مسلمانوں سے خالی نہ ہوتا - وہاں کی مسجدیں ویران نہ ہوتیں - وہاں کی خانقاہیں، وہاں کے مزارات، وہاں کی عبادت گاہیں ہندو سکھ درندوں کی سفاکیوں کا نشانہ بنتے -

تقسیم کے نتیجے میں تین چوتھائی کے قریب فوجی طاقت ہندوستان کے حصے میں آئی تھی - اسّی فیصد سے زیادہ رقبے پر اُس کا قبضہ تھا - اور پھر مسلمانوں کو جو کچھ ملا تھا وہ بھی ابھی ہندوستان کے قبضے میں تھا اور تقسیم مکمل نہ ہوئی تھی -

ہندوستان نے سوچا کہ اُسے تو پاکستان سے صرف ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کو نکالنا ہے اور ان کو اپنی سرزمین میں بسانے کے لیے اس کے پاس سولہ لاکھ مربع میل زمین موجود ہے - جہاں ۳۷ کروڑ انسان بستے ہیں - لیکن پاکستان اول تو دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے - ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں - اور پھر ان دونوں کا رقبہ ملا کر بھی ۳ ½ لاکھ مربع میل سے زیادہ نہیں - جہاں صرف ۷ کروڑ انسان بستے ہیں - لیکن انتقال آبادی کی رو سے ساڑھے چار کروڑ انسانوں کو پاکستان کے مختصر سے رقبے میں کھپانا ہوگا -

انتقال آبادی کو ہندوستان نے اپنی مفسدہ پردازی اور فتنہ انگیزی کی تکمیل کا ایک بہت بڑا ذریعہ سمجھا - اس نے خیال کیا کہ انتقال آبادی کے نام پر پورے ہندوستان کے چار ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل کر اس نوزائیدہ مملکت کو تباہ کر دیا جائے - پورے ہندوستان میں مسلم کشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی -

مجھے اور برصغیر کے مسلمانوں کو صفحۂ دنیا سے مٹانے کے لیے ہندوؤں اور سکھوں نے جو تنظیمیں قائم کی تھیں وہ مندرجہ ذیل ہیں -

(۱) آل انڈیا سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن -

(۲) شہیدی جتھہ ——— اس میں سکھ ممبر اکال تخت گوردوارہ امرتسر کے سامنے کھڑے ہو کر خودکشی کے حلف نامے پر دستخط کرتے تھے اور اپنی جان کو بیچ دیتے تھے -

(۳) اکالی پارٹی -

(۴) اکالی سینا

(۵) اکالی فوج

(۶) اکالی ہائی کمانڈ

(۷) آل انڈیا ہندو مہا سبھا

(۸) آریہ سماج

(۹) بیوپار منڈل

(۱۰) آریہ پرتی ندھی سبھا

(۱۱) آریہ دیر دل

(۱۲) دیوان ـــــ سکھوں کا مذہبی اجتماع

(۱۳) ڈوگرا راجپوت ـــــ ہندوؤں کی ایک ذات جو جموں سٹیٹ اور کانگڑہ میں رہتی ہے۔

(۱۴) ڈرلی جتھہ

(۱۵) گیانی دیر سنگھ جتھا

(۱۶) ہندو نیشنل گارڈ

(۱۷) آزاد ہند فوج (آئی۔ این۔ اے)

(۱۸) ہندو نیشنل گارڈ

(۱۹) نہنگ جتھا

(۲۰) پنتھک پرتی ندھی بورڈ

(۲۱) راشٹریہ سیوک سنگھ

(۲۲) شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی

(۲۳) شرومنی اکالی دل

(۲۴) سنگھ سبھا

(۲۵) راشٹریہ سویم سیوک سنگھ۔

۳؍ مارچ ۱۹۴۷ء کو سکھوں کی پنتھک پارٹی کا جلسہ پنجاب اسمبلی کی عمارت میں منعقد ہوا۔ اس کے ختم ہونے پر ایک ممتاز سکھ لیڈر نے باہر نکل کر نیام سے تلوار نکالی اور سب سے پہلے

پاکستان مردہ باد کا نعرہ لگایا۔ اور اُس کے بعد شام کو ہندو سکھوں کا جو جلسہ عام ہوا اُس میں کھلے طور پر کہا گیا کہ ہم مسلمانوں کو پنجاب سے نکال کر دم لیں گے۔

اس جلسے کے دوسرے روز جو جلوس نکالے گئے اس میں منجملہ دوسرے نعروں کے ایک نعرہ یہ بھی تھا۔

"جو مانگے گا پاکستان ـــــ اُس کو دیں گے قبرستان"

اسی اثنا میں گوردواروں اور مندروں میں بم اور آتشیں اسلحہ بنانے کی چھوٹی فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ اس مقصد کے لیے پچاس لاکھ کا فنڈ جمع کیا گیا۔

۱۶ اگست ۱۹۴۷ء سے اکتوبر کے پہلے ہفتے تک دو ماہ میں کل ۷۹ حملے ہوئے۔ ان میں پچیس ۲۵ ٹرینوں پر مسلمانوں نے حملے کیے۔ اور غیر مسلموں نے ۵۴ حملے۔ ان حملوں میں جو ہتھیار استعمال کیے گئے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

بم۔ تلواریں۔ رائفلیں۔ بندوقیں۔ نیزے۔ بلم۔ کرپانیں۔ بھالے۔ لاٹھیاں۔ خود بخود پھٹنے والے بم۔ ٹامی گنیں۔ سٹین گنیں۔ چھرے۔ کلہاڑے۔ پستول۔

حملہ آور تنظیمیں یہ تھیں۔

راشٹریہ سیوک سنگھ۔ سکھ سابق فوجی۔ اکالی پارٹی۔ پٹیالہ کی فوجی۔ ہندو جاٹ ملٹری۔ پولیس جبکہ مسلمانوں کی طرف سے حملہ آور صرف ہجوم تھا یا دو ایک جگہ پٹھانوں کا گروہ تھا۔

پناہ گزینوں کی ٹرینوں پر جو حملے ہوئے ان کا شکار ہونے والے مسلمانوں کے متعلق چند موٹے موٹے اعداد و شمار یہ ہیں۔

۵ ستمبر کو کھوجی والا کپور تھلہ میں ٹرین پر حملہ کر کے ۶ ہزار سات سو مسلمان موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ اس ٹرین کو پٹڑی سے اتار لیا گیا تھا۔ موقع پر ریاست کے چیف منسٹر اور کنور صاحب موجود تھے مگر صرف تماشا دیکھتے رہے۔

۱۹ ستمبر کو دوراہہ ریلوے اسٹیشن پٹیالہ پر ۸ ہزار مسلمانوں کو ہلاک کیا گیا ۲ ہزار عورتوں کو اغوا کیا گیا۔

۲۱ ستمبر کو بیاس اور امرتسر کے درمیان ۱۱۵ مسلمان شہید کیے گئے۔

۱۰ ستمبر کو کپورتھلہ ریلوے اسٹیشن پر ۲ ہزار مسلمانوں نے جان سے ہاتھ دھوئے۔

۲۳ ستمبر کو لدھیانہ میں چار سو مسلمان شہید ہوئے۔ اور دوسرے دن شہید ہونے والوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔

۲۴ ستمبر کو جیتی والا ریلوے اسٹیشن پر دو ہزار مسلمان جاں بحق ہوئے۔ واگہ۔ قصور سرحد پر ۱۳ ستمبر سے ۲۱ نومبر ۱۹۴۷ء تک جو حملے ہوئے ان کی کل تعداد ۲۸ ہے۔ جن میں آتشیں اسلحہ۔ برین گنیں، سٹین گنیں اور رائفلیں استعمال ہوئیں۔ اور ہر حملہ مسلح سکھ جتھوں نے کیا۔ بعض دفعہ ان کے ساتھ پولیس اور فوج کے سپاہی بھی ہوتے تھے۔ قتل وغارت کے علاوہ مسلمان دیہاتوں سے چرتے ہوئے مویشی لے جائے گئے۔ دیہات جلائے گئے۔ فصلیں لوٹی اور جلائی گئیں۔

سیالکوٹ اور جموں سرحد پر انہی تاریخوں میں ۶۳ حملے کیے گئے۔ ہجوم کے ساتھ فوج اور پولیس کے سپاہی بھی شامل تھے۔

مشرقی پنجاب کے حملوں میں ہندو پولیس اور فوج نے کھلم کھلا شرکت کی۔

۲۸ جولائی ۴۷ء اکتوبر ۴۷ء کے پہلے ہفتے تک ایک سو سات مقامات پر حملے ہوئے۔ جن میں پٹیالہ کی فوج اور پولیس کے سپاہی تھے۔

۸ ستمبر ۴۷ء کو سلطان پور کپورتھلہ میں مسلمانوں کے پیدل قافلے پر حملہ ہوا جس میں سولہ سو مسلمان شہید ہوئے۔ اس حملے میں غیر مسلم ملٹری سکورٹ نے جو قافلے کی حفاظت کے لیے ساتھ تھا سکھ ہجوم کی کھلم کھلا مدد کی۔ حملہ آوروں میں کپورتھلہ فوج بھی شامل تھی۔

کاکنڈ یارا امرتسر میں ۲۸ جولائی کو سکھوں اور پولیس نے حملہ کیا ۹۲ مسلمان مارے گئے۔

سرکاری ذرائع سے حاصل کی ہوئی مصدقہ اطلاعات کی رو سے ان دو ماہ میں ۳۵ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ لیکن اصل حقیقت کون جانتا ہے۔

موضع آزادوال تھانہ کھتو ننگل میں جب مسلمان حملے کی شکایت لے کر تھانے گئے تو سکھ تھانیدار نے پندرہ آدمیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

موضع بھوجیاں امرتسر میں اکتوبر کے مہینے میں جو حملہ ہوا اس میں قریباً ایک ہزار مسلمان مارے گئے۔ آٹھ ہزار سکھوں نے جن میں فوجی کافی تعداد میں تھے حملہ کیا۔

گلی ساہترا دہلی ۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جو حملہ ہوا اُس میں ڈوگرا اور سکھ فوجی شریک تھے۔ چار ہزار مسلمان مارے گئے۔

۱۹۴۷ء میں ۴ مارچ سے ۱۲ جولائی تک پولیس نے جو اسلحہ اور گولہ بارود دستیاب کیا اس کے خاص اعداد حسب ذیل ہیں۔

(مسلمانوں کے قبضے سے)

پستول اور ریوالور ۲۳ - بندوقیں اور رائفلیں ۵ - کارتوس 1100

(غیر مسلموں کے قبضے سے)

۱۳۰ بندوقیں کارتوس چھ ہزار صرف امرتسر سے۔ کاہنا کاچھا سے پستول ،، ۔ رائفلیں اور بندوقین ۹۴ - جھنگ گھیانہ سے ۲۰۰ بندوقیں اور رائفلیں جگراؤں ریفیوجی کیمپ میں ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جو حملہ ہوا اس میں ایک ہزار سکھ شامل تھے۔ جن میں ملٹری گارڈ کے ملازم بھی شریک تھے۔ ۶۰۰ مسلمان شہید ہوئے۔

موضع شیخوپورہ کپورتھلہ پر ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو حملہ ہوا۔ چھ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ چار ہزار سکھوں نے حملہ کیا۔

موضع برنالہ ریاست پٹیالہ ۲۸ اگست ۱۹۴۷ء میں چار ہزار مسلمان شہید اور ہزارہا زخمی ہوئے۔ سکھ اس حملے کے سرغنہ تھے۔

کوٹ محمد خاں اور سرہالی تھانہ امرتسر ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مسلمانوں کے پیدل قافلے پر حملہ ہوا۔ تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

گھرندا تھانہ ہوشیارپور میں ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو سولہ سو مسلمان سکھ فوج اور ہندو سکھ غنڈوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

سبزی منڈی دہلی ۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو تین ہزار مسلمان سکھوں اور انڈین ملٹری کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

بازار بکروانہ امرتسر میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پانچ سو مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ حملہ آوروں میں سکھ پیش پیش تھے ہاڑان کی سرداری ایس آئی بی سب ڈویژن کر رہا تھا۔

ہوشیار نگر امرتسر میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پانچ ہزار مسلمان شہید کیے گئے یہاں مقامی تھانیدار نے علانیہ سکھوں کو اس مقصد کے لیے منظم کیا تھا۔ اپنی کمزوری کو چھپانا کوئی ہنر نہیں۔ اس لیے تمہیں کھلے دل کے ساتھ یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرنی چاہیئے کہ پچھلی ایک صدی میں مسلمانوں کی سیاست عوام کی عملی سیاست کبھی نہ بنی۔ ابتدا میں اوپر کے طبقہ کے کچھ لوگ اٹھے۔ اور انہوں نے اپنے عشرت کدوں میں چند افراد کی جماعت بنا کر عوام کا نام استعمال کیا۔ لیکن اپنے عوام میں ٹھوس احساس پیدا کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کبھی نہ کی گئی۔ اس کے بعد زمانے کی تیز رفتاری سے مجبور ہو کر تمہارے قدم کچھ آگے بڑھے اور تم میں کھلبلی مچی۔ لیکن اس کا دائرہ بھی صرف تقریروں اور بیانوں تک محدود رہا۔ ہندو اس میدان میں مسلمانوں سے بازی لے گئے۔ تم نے باتیں زیادہ کیں۔ ہندوؤں نے حرکت زیادہ کی۔ تم باتیں کرتے رہے وہ عمل کرتے رہے۔ تمہاری تحریک نے ۱۹۳۷ء کے بعد ایک نئی کروٹ ضرور بدلی لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ تم صرف گفتار کے غازی بنے رہے۔ کردار کے مرد میدان بننے کی کوشش برائے نام کی۔ تمہارے لیڈروں نے اپنی تقریروں میں چنگیز و ہلاکو کا نام تو لیا لیکن کوئی عملی پروگرام اپنے عوام کے سامنے پیش نہ کر سکے، جب سے تمہاری سیاست نے اس ملک میں ہوش سنبھالا ہے اُس نے بہت کم مخلص سچے اور نڈر لیڈر پیدا کیے ہیں۔ ابن الوقت، موقع شناس، گندم نما جو فروش ضمیر فروش، ملک فروش، ملت فروش تمہاری سیاست نے زیادہ پیدا کیے ہیں اور پھر تمہیں سیاست کا بہت کم شعور ہے۔ تم نے آج تک سیاست کا مذاق اڑایا ہے۔ تمہیں مخلص و محسن قیادت و سیادت اب تک بہت کم نصیب ہوئی ہے۔ جبکہ تم اتنے عاقبت نااندیش اور عقل کے اندھے ہو کہ اپنے مخلص و محسن قائدوں ہی کو ذلیل کرتے رہے ہو۔ ان کو قتل کرتے رہے ہو۔ تم نے ان کی قدر ہی نہیں کی البتہ اتنا ضرور کیا ہے کہ خود ہی ان کو قتل کر کے انکی قبروں پر مقبرے بنائے ہیں اور ان کی مجاوری شروع کر دی ہے۔ اُن کے نام پر چندے اکھٹے کر کے گلچھرے اڑائے ہیں۔ ان کی چراغیوں سے اپنی ہوس کے بجھے ہوئے چراغ جلائے ہیں۔ ان کے سالانہ عرس مناکر تم زمین سے عرش تک کی سیر کر آئے ہو۔ اور تم شاید یہی کچھ کر سکتے ہو۔

حکومت کسی عوامی تحریک کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ عوامی تحریک کو حکومت کا نتیجہ قرار دینا بہت

بڑی سیاسی غلطی ہے۔ تم کو یہ محسوس کرنا چاہیئے تھا کہ آزادی کا تاج ہم انگریز سے نہیں ہندو سے چھین رہے ہیں۔ وہ آسانی کے ساتھ یہ تاج تمہارے سپرد نہیں کرے گا۔ مگر تم نے سمجھا کہ صرف قلم کی طاقت سے سب کچھ ہو جائے گا عملی سرگرمی کی کوئی ضرورت نہیں۔

میرے دشمن۔ تمہارے دشمن۔ مجھے تباہ کرنے کے لیے۔ تمہیں تباہ کرنے کے لیے جماعتوں پر جماعتیں بناتے چلے گئے۔ زیرزمین تمہاری ہلاکت کی سازشوں کے دام ہمرنگ زمین بچھاتے رہے۔ اور تم مرغ بازی، بٹیر بازی، رنڈی بازی، دغا بازی میں لگے رہے۔ وہ کونسی بازی تھی جو تم نے نہ لگائی ہو۔ اور یہ تمہیں یاد ہی نہ رہا کہ ترتیب وقت میں ایک ایسا پرآشوب وقت ترتیب پا رہا ہے کہ تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے جان کی بازی لگانا پڑے گی۔ تم رنڈی بازی میں لگے رہے اور میرے دشمن، تمہارے دشمن ایسے خونی منصوبے بناتے رہے جن کو عملی جامہ پہناتے ہوئے وہ میری اور تمہاری ہزاروں بہو بیٹیوں اور بہنوں کو رنڈیاں بنا کر بھرے بازاروں میں ان کی عصمت دری کریں۔ ایک کو ایک نہیں ایک ہزار درندے چیریں پھاڑیں۔ ان کو چکلوں میں بٹھا دیں۔ وہ بیچاریاں مصیبت کی ماریاں بھیڑ بکریوں کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر میں زناکاری کی منڈیوں میں بکتی چلی جائیں۔

تمہارے پیروں تلے جوالا مکھی پھٹنے کے لیے گرجتے چمکتے چلے گئے لیکن تمہیں اپنی دھواں دھار تقریروں کے شور اور دھند لکے میں نہ تو ان جوالا مکھیوں کی گونج گرج سنائی دی۔ اور نہ ان کے شعلوں کی چمک نظر آئی۔ تم آنے والے حالات کا پہلے سے اندازہ نہ کر کے ان کی پیش بندی نہ کر سکے۔ ہر مورچے کے لیے تم نے صحیح رضا کار کا انتخاب نہ کیا۔

اور پھر جب وہ جوالا مکھی پھٹے تو تم دھماکوں سے مٹی کے ڈھیلوں کی طرح اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔ اور انتہائی گھبراہٹ و سراسیمگی میں سوچنے لگے۔

اب کیا کریں؟ اب کدھر جائیں؟ اب کسے پکاریں؟

تمہارے پاس قومی رضا کاروں کی کوئی ایسی تنظیم نہ تھی جو شہیدی جتھے اور اکالی دل کی نوعیت کی ہوتی۔ آزاد ہند فوج کی قسم کی تنظیموں کا مقابلہ کر سکتی۔ یا سکھ ریاستوں کے گٹھ جوڑ کو توڑ کر ریزہ ریزہ کرنے کے لیے میدان میں اتر سکتی۔ ہیں یہ سب کچھ نہایت تحمل و بردباری

سے دیکھتا چلا گیا۔ سرخ آندھیوں کے تھپیڑے کھاتا۔ سرخ بگولوں کی یورشوں سے الجھتا ٹکراتا چلتی ہوئی سرخ لکیر پر چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ آخر وہ سرخ لکیر نئے افق کے کنارے کے قریب رک گئی۔ میں بھی رک گیا۔ اور پھر نہ جانے یہ میرا احساس تھا یا حقیقت تھی کہ میرے نزدیک وقت بھی ایک رُکی ہوئی گھڑی کی طرح تھا۔

میں نے آسمان پر پھیلے ہوئے شام کے رنگوں کو نظر بھر کر دیکھا۔ پہلی کا منور چاند آسمان کے ایک گوشے میں لٹک رہا تھا۔ جبکہ نئے افق پر ایک پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ میرا پرچم تھا۔ تمہارا پرچم تھا جو دھیرے دھیرے بہتی ہوئی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ میں ڈگمگاتا ہوا آگے بڑھا۔ تم بھی زخمی تھے میں بھی زخمی تھا۔ جو زخم تم کو لگائے گئے تھے مجھے لگائے گئے تھے۔ جو خون تمہارے جسم سے بہا تھا میرے جسم سے بہا تھا۔ تم میری زندگی ہو۔ جسم ہو۔ روح ہو۔ میں تمہاری زندگی ہوں۔ جسم ہوں۔ روح ہوں۔

اتنے میں کچھ اور لوگ میرے ساتھ آن ملے۔ جو کئی منزلوں کئی میلوں سے اپنی لاش کو اپنے اندر چھپائے چلے آرہے تھے۔

وہ مجھ سے ہچکیوں میں کہنے لگے۔ سسکیوں میں کہنے لگے۔ تمہاری لٹی پٹی اولاد کے درماندہ قافلے چلے آتے ہیں۔ تمہارے بیٹے۔ تمہاری بیٹیاں۔ زندہ ہیں لیکن ان میں زندگی کی کوئی علامت نہیں ہے۔ وہ چل رہے ہیں مگر چل نہیں سکتے۔ گرتے پڑتے وہ بڑی مشکل سے اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ دکھاؤ انہیں نشان منزل دکھاؤ۔ وہ ایسے گھور اندھیروں میں سے رینگتے آرہے ہیں کہ اجالے میں بھی آکر شاید کچھ نہ دیکھ سکیں۔ وہ منزل کے قریب آکر کہیں بھٹک نہ جائیں۔ اُن کے خضر راہ بنو۔ اُن کی رہنمائی کرو۔ آوازیں دو انہیں آوازیں دو۔ پکارو انہیں اپنی زبان سے پکارو۔ بلاؤ اُنہیں اپنی طرف بلاؤ۔ تمہاری آواز اس وقت ان کے لیے زندگی کی آواز ہوگی۔ منزل کی آواز ہوگی۔ امن اور سلامتی کی آواز ہوگی۔

میں آگے بڑھا — پرچم کو ہاتھ میں لئے اور دل کے پورے خلوص اور اپنے ضمیر کی پوری صداقت کے ساتھ ان کو آوازیں دینے لگا۔ میں نئے افق پر کھڑا ہو گیا اور ادھر اندھیروں میں دور دور تک جھانکنے لگا۔ اور اوپر آسمان کے سارے ستارے مجھے جھانک رہے تھے۔ میری آنکھوں میں اس وقت عقاب کا تجسس تھا۔ میرے اعضا میں چیتے کی سی چستی تھی

میری رگ و پے میں خون نہیں بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ میں نے شمار آنکھوں میں منتقل ہو کر تمہارے آس پاس خون آشام اندھیروں میں تیرنے لگا۔

اس طرح میں نئے افق پر نمودار ہوا —— !!

طلوع پاکستان —— !!

تیز ہوا اور تنکے

نہیں گلوں کے تبسم میں یہ خبر نہ رہی
بہار آگ لگا دے گی آشیانے میں

تم ایسے بے ترتیب ہو رہے تھے کہ تمہاری زندگی کے تنکوں کو سمیٹنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا ——— !

تم کارواں در کارواں بکھرے ہوئے تھے۔ جتنے گاؤں اتنے قافلے۔ واہگہ کے اُس پار کے ہر شہر ہر بستی سے واہگہ کی طرف آنے والے ہر راستے ہر سڑک پر پگڈنڈی پر رینگتی ہوئی انسانی لکیریں اور لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں۔ جن پر چیلوں، کووں اور گدھوں کے غول در غول منڈلا رہے تھے۔ قطار اندر قطار۔ انباروں کے انبار۔ بے گور و کفن لاشیں۔ خاک و خون میں لتھڑی لاشیں۔ ننگی لاشیں۔ چیتھڑوں اور پھوسڑوں میں لپٹی لاشیں۔ لاشیں جو پہچانی نہ جاتی تھیں۔ لاشیں جو گنی نہ جا سکتی تھیں۔ جن کا ہر نقش فریادی تھا۔ جن کے ہر زخم میں کئی زخم تھے۔ خدا کے ٹوٹے پھوٹے کھلونے۔ خدا کے فالتو بندے ——— !

یعنی تم ——— جن پر خدا کی اتنی وسیع و عریض زمین نہایت تنگ و تاریک ہو گئی تھی۔ اتنی تنگ کہ اُس نے تم پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اتنی تاریک کہ چاروں طرف بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں بھی تمہیں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

اس لئے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا کہ تم اُس وقت اپنی آنکھوں سے نہیں اپنے خوف کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور خوف انسان کو حواس باختہ کر دیتا ہے۔ اُس وقت تمہاری قوت باصرہ ہی نہیں قوت سامعہ بھی خوف سے متاثر تھی۔ جو مدہم سے مدہم اور باریک سے باریک آواز کو بھی کانوں میں ایک ذہن پاش دھماکہ اور دل ہلا دینے والی گونج گرج بنا کر تم پر سناٹا طاری کر رہی تھی۔

سناٹا جو جبلت مرگ کی علامت ہے۔ گویا اس وقت تم پر جبلتِ مرگ طاری تھی۔ جبکہ تمہارے چاروں طرف شور ہی شور تھا۔ بپھری آوازیں تھیں۔ دھاڑیں اور پھنکاریں تھیں۔
تم آگ کی آندھیوں کی لپیٹ میں تھے۔ تمہیں موت کے جھکڑوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جو تمہیں سوکھے پتوں اور تنکوں کی طرح اڑائے لئے جا رہے تھے۔ تمہارے اوپر نیچے دائیں بائیں آگ ہی آگ تھی۔ خون ہی خون تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جس میں خونخوار درندوں کے پنجے اور ہیبت ناک چنگل تمہاری طرف ہر سمت سے بڑھ رہے تھے۔
تم سے تمہارے گھر چھیننے کے لیے۔ تم سے تمہارا مال و متاع چھیننے کے لیے۔ تم سے تمہاری مائیں بہنیں، بہو بیٹیاں چھیننے کے لیے۔ تم سے زندگی چھیننے کے لیے۔ اور تم بے بس تھے۔ بیکس تھے۔ نہتے تھے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

Between the Devil and the Deep Sea

ایسے پرآشوب حالات میں جبکہ تمہارا ہر قدم موت کی طرف اٹھ رہا تھا۔ تمہارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اور اگر کچھ تھا تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ تم نے اپنے آپ کو اس خطرہ کے لیے پہلے سے مسلح نہ کیا ہوا تھا اور یہ تمہاری غفلت و تساہل کی ایک بدترین مثال تھی۔ حادثات و اتفاقات کے انجانے حملوں سے انسان کو ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیئے۔
دشمنوں کے غیر متوقع حملوں اور منظم دھاوں نے تمہیں ہی نہیں اُس وقت تمہاری سیاست کو بھی بوکھلا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی تمہاری کچھ سیاسی بوکھلاہٹیں بھی تمہاری تباہی و بربادی کا سامان بن گئی تھیں۔
یہ تو سوچا گیا تھا کہ پاکستان کے مسلمان پاکستان میں ہوں گے اور محفوظ ہوں گے۔ محفوظ ہوں گے اور مضبوط ہوں گے۔ لیکن یہ نہ سوچا گیا تھا کہ لہو کی لکیر اور آگ کی دیوار درمیان میں حائل ہو جانے کی صورت میں جو مسلمان ہندوستان میں ہوں گے پاکستان اور اسلام کی دشمن ایک بہت بڑی اکثریت کے رحم و کرم پر ہونگے۔ وہ اکثریت کے تباہ کن دباؤ سے یا تو ملحد و مرتد ہو جائیں گے یا مفرور اور یا پھر مقتول۔ ہندوستان میں پاکستان اور اسلام دشمن عناصر نے اپنے خبث باطن کا ایک مزید مسموم مظاہرہ کرتے ہوئے اگر پاکستان کی نوزائیدہ حکومت کو ہلاک

کرنے کے لیے اُسے ان گنت مہاجروں کی آبادکاری کے مسئلے کی ہلاکت ہول میں ٹھونس دیا تو کیا ہو گا؟

یہ نہ سوچا گیا تھا اور یہ بھی نہ سوچا گیا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو مزید الجھنوں میں الجھانے کے لیے مہا سبھائی اور سیوک سنگی ذہنیتوں نے اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی وسیع پیمانے پر نسل کشی (Genocide) اور قتل عام (Masacre) شروع کر کے انہیں پاکستان کی طرف ہانکنا اور دھکیلنا شروع کر دیا تو مبتلائے عذاب مسلمانوں کو کیا تحفظ دیا جاسکے گا۔ اس وقت کے بے شمار پریشان کن مسائل سے دوچار اور بوکھلائی ہوئی تمہاری سیاست کی مجبوری سے دشمن نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ اور ہر طرف سے تم پر موت کے دروازے کھول دیئے۔ من حیث القوم مسلمانوں کا یہ ایک ایسا المیہ تھا جسے بھارت کی جارحیت کا نقطۂ عروج کہا جاسکتا ہے۔

تم سنگسار ہو رہے تھے۔ مصلوب ہو رہے تھے۔ ذبح ہو رہے تھے۔ زندہ جلائے جا رہے تھے۔!

جہاں تمہاری اک عمر کٹی تھی اُسی قلمرو میں شناخت کے لیے ہر شاہراہ تمہیں روک رہی تھی۔ ہر اک نگاہ کا نیزہ تمہارے راستے کی رکاوٹ بن گیا تھا۔ ہر آنکھ شکاری کتے کی طرح تمہاری خوشبو سونگھتے ہوئے تمہارا سراغ لگا رہی تھی۔ تمہارا تعاقب کر رہی تھی۔

ہر آواز کے انداز میں تمہارے لیے دھمکی تھی۔ دھونس تھی۔ دھاندلی تھی۔ ایک چیلنج تھا۔ کفر ہر گوشے سے اسلام کو للکار رہا تھا۔ باطل حق پر اپنی تمام تر طاغوتی قوتوں کے ساتھ حملہ آور تھا۔ لادینیت اپنے تمام وسائل تخریب و تباہی بروئے کار لاتے ہوئے دین حقہ پر یورش و یلغار کر رہی تھی۔ اعلائے کلمۃ الحق کو ایک سیاسی جرم سمجھا جا رہا تھا۔ دین الہیہ اور حکومت الہیہ کی تبلیغ و اشاعت کی پاداش میں زبانیں کاٹی جا رہی تھیں۔

متنازعہ فیہ امور کو افہام و تفہیم سے طے کرنے کے سب دروازے بند و مسدود ہو چکے تھے۔ عالمی ضمیر جھنجھوڑے جانے کے باوجود خواب غفلت سے بیدار نہ ہو رہا تھا۔ صلح و آشتی

کی ہر تحریک کو کچلا جا رہا تھا - امن و امان کے پرچموں کو پھاڑ کر فتنہ و فساد کی آگ میں جلایا جا رہا تھا - جب تحفظ انسانیت کا منشور آنکھوں کے ہوتے ہوئے اندھا، کانوں کے ہوتے ہوئے بہرہ اور زبان کے ہوتے ہوئے گونگا ہو چکا تھا - جب تم اپنی عزت و ناموس کے دامن کو درندوں کے پنجوں سے تار تار ہونے سے بچانے کے لیے اپنی بہو بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کرتے ہوئے خود بھی اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاک کر رہے تھے - خودکشی حرام ہے لیکن ایسے حالات میں حلال ہے - ایک قابل تحسین فعل ہے - اس طرح تم نے اُس معزز روح کی تذلیل نہ کی جو تمہارے جسم میں تھی -

تم ان اندھیروں میں نہایت تیزی سے کم ہوتے جا رہے تھے - تم بھوکے تھے - پیاسے تھے - تمہارے راستے میں آنے والے کنووں، تالابوں اور جوہڑوں میں زہر ملا دیا گیا تھا - کہ تم کیا تمہارے معصوم بچے بھی پیاس سے پپڑیائے ہوئے ہونٹوں پر پانی کی ایک بوند تک نہ ٹپکا سکیں - تمہاری آواز میں درد و کرب کی پرچھائیاں تھیں - ایسی صورت میں بھی پیاس سے تنگ آ کر وہ پانی پیئے بغیر بہت سے ہلاک ہو گئے -

تم زخموں سے چُور چُور تھے - تمہارے چہرے کی ہر شکن اور دھول سے اٹے ہوئے سر کا ہر بال ایک دردناک کہانی تھی - تمہاری ٹانگیں چلتے چلتے پتھرا گئی تھیں - تمہارے پاؤں سوج گئے تھے - ان میں آبلے پڑ گئے تھے - ان راستوں کا ہر کانٹا تمہارے ہی پاؤں کا انتظار کر رہا تھا - تم اس قدر تھک چکے تھے کہ تمہارے لئے ایک قدم اٹھانا ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کرنا تھا - اور فاصلے تھے کہ صدیوں پر پھیل گئے تھے - اتنے کٹھن مرحلے تھے کہ کٹنے میں نہ آ رہے تھے - تمہاری منزل تھی کہ لاشوں کے سمندر میں اُس کا کوئی نشان دکھائی نہ دے رہا تھا -

کہیں تم رینگ رہے تھے - کہیں حشرات الارض کی طرح کلبلا رہے تھے - کہیں بے تحاشا بھاگے جا رہے تھے - گزرتے وقت کی پرچھائیاں، چھل پائیاں، بھوت چھلاوے تمہارے چاروں طرف شعلوں اور لاشوں پر ایک خونیں ناچ ناچ رہے تھے - تمہاری دعائیں نہ گردشوں کو گرفتار کر سکتی تھیں اور نہ تقدیر پر کمندیں ڈال سکتی تھیں اور تمہارا ۲۶ ہزار مہاجروں کا وہ قافلہ تو مجھے بھولتا ہی نہیں اور کبھی نہ بھولے گا - برسات کا موسم تھا - ایک طوفانی رات تھی -

آسمان پر کالے کالے بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک چمک کر کڑک رہی تھی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا۔

اور تمہارا چھبیس ہزار انسانوں کا قافلہ دریائے بیاس کے کنارے رکا پڑا تھا۔ تمہارے سروں پر نہ کوئی سائبان تھا نہ چھت تھی۔ بادلوں کا سارا پانی تم پر یوں برس رہا تھا جیسے اینٹوں اور پتھروں پر برستا ہے۔ تم بھیگ رہے تھے۔ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ بہت سے بچوں اور بڑوں کو نمونیا ہو گیا۔ کسی قسم کی طبی امداد اور علاج نہ ہو سکنے کی وجہ سے بہت سے مر گئے۔ قافلے میں ڈیریا، ہیضہ اور پیچش کی وبائیں بھی پھیل رہی تھیں۔ بہت سے لوگ ان عفریتوں کا نوالہ بن رہے تھے۔ ایک دست ایک قے آئی اور چلتے بنے۔ ان وباؤں کے جراثیم بھی تمہارے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔

اور پھر اچانک ۵ ہزار اکالیوں کے مسلح جتھے نے ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہوئے ۲۶ ہزار مہاجروں کے قافلے پر حملہ بول دیا۔

آگے تمہارے طغیانی میں اپنے کناروں سے باہر بہتے ہوئے دریائے بیاس کی ہلاکت خیز لہریں تھیں اور پیچھے تمہارے ۵ ہزار مسلح اکالیوں کا جتھا جو نعرے لگاتا ہوا نہایت سرعت سے تمہارے قریب آتا جا رہا تھا۔ تم میں سے بہت کم ایسے تھے جو حملہ آوروں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے جو ہتھیار بھی ان کے پاس تھا لے کر ڈٹ گئے اور بری طرح مارے گئے۔ کچھ ادھر ادھر جان بچا کر بھاگے لیکن بجلیوں کی طرح چمکتی تلواروں اور بھالوں نے انہیں بھاگنے کی مہلت ہی نہ دی۔ وہیں کھیت رہے اور ۲۶ ہزار انسانوں کے قافلے میں سے باقی جو بچے دریائے بیاس کے بپھرے ہوئے پانیوں میں کود گئے۔ تیز رو پانیوں کی سطح پر تیرتے ہوئے ۲۶ ہزار بلبلے۔ کچھ وہیں پانیوں میں چکرا کر نیچے گہرائیوں میں چلے گئے۔ کچھ تھوڑی دور جا کر ڈوب گئے اور کچھ کافی دور تک دندناتے شور مچاتے پانیوں کے تھپیڑے کھاتے دکھائی دیتے رہے۔

میں نئے افق پر کھڑا اندھیرے میں بہت دور تک یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ تمہاری ہلاکت پر لہو کے آنسو بہا رہا تھا۔ لوہے کا ایک ہاتھ میرے دل کی دھڑکنوں کو ٹٹول رہا تھا۔

میں تمہارے کس کس لٹے پٹے قافلے کا ذکر کروں۔ تمہارے کس کس درماندہ کارواں کی خونچکاں داستانیں سناؤں - آگ کی آندھیوں کی تیز و تند ہواؤں میں اڑتے تمہارے اجڑے آشیانوں کے تنکوں کی سکتہ طاری کر دینے والی کہانیاں سناؤں -

باور کرو —!

مجھے تمہاری مظلومیت اور مرگ مفاجات کی قسم میں نے تمہیں اپنے دل کے پورے خلوص اور اپنی روح کی پوری صداقت کے ساتھ پکارا - تمہارے ناموں کو اپنی پوری محبت کے ساتھ چوما - تمہیں بلند آواز میں کہا -

شہیدان ملت ! تمہارا خون رائیگاں نہ جائے گا - زندہ قومیں اپنی آزادی کی زکوٰۃ دیا کرتی ہیں - قوموں کی تاریخ میں ایسے ایسے موڑ بھی آ جایا کرتے ہیں جبکہ انہیں آگ اور خون سے کھیلنا پڑتا ہے - زندہ قومیں خون کی یہ ہولی کھیلنے سے گھبرایا نہیں کرتیں کہ خون صد ہزار انجم سے سحر پیدا ہوتی ہے -

خون کی ندیاں جری قوموں کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہیں روک سکتیں - اور نہ آگ کی دیواریں ان کے راستے میں حائل ہو سکتی ہیں - میں نے تمہیں استقامت و استقلال کا درس دیتے ہوئے کہا - خون کا یہ سیلاب اگر تیز و تند ہوتا جا رہا ہے تو کچھ پرواہ نہیں - آگ کی یہ دیواریں اور بلند ہوتی جا رہیں تو بیشک ہو جائیں ظلم و استبداد کے اندھیرے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں تو ہو جانے دو یہ اس اجالے کو نہیں گہنا سکتے جو نئے افق سے طلوع ہو چکا ہے -

تمہاری یہ قربانیاں وقت کے دھندلکوں میں دفن ہو کر دنیا کے ذہن سے محو نہ ہو سکیں گی - اس کالی رات میں اپنے لہو سے جو چراغ جلا رہے ہو بجھنے نہ پائیں گے - ان کی روشنی میں آنے والے وقت کا وقائع نگار تمہاری آزادی کی تاریخ کا ایک ایک لفظ آگ اور خون سے لکھے گا -

ذرا غور تو کرو - فخر آدمیت و بشریت اس مبارک و مقدس ہستی نے اکلی والے آقا نے نہ صرف اپنی امت بلکہ پوری انسانیت کے لیے کیسے کیسے دکھ اٹھائے - کیسی کیسی مصیبتیں جھیلیں - طائف کے بازاروں میں حضورؐ پر سنگ باری کی گئی - آپ زخمی ہوئے - جنگ احد میں آپؐ کے دو دانت شہید ہو گئے - لیکن جادہ استقلال پر آپؐ کے قدم مبارک ذرا نہ ڈگمگائے - وہ ہر حال

ہیں خدا سے خوش تھے اور خدا ان سے خوش تھا۔

اور دیکھو! قرآن کریم فرماتا ہے - !

جب خوف وہراس کے حالات پیدا ہو جائیں - واقعات نہایت خطرناک نظر آئیں تو اس امر کا احساس کرنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے بمصیبتوں سے گھبرا نہ جاؤ ان کا مقابلہ کرو اور صبر کرو۔ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور وہ ذوق یقیں پیدا کرو جس نے حضرت موسیٰ کے لیے رود نیل میں راستہ بنا دیا تھا۔ وہ عشق پیدا کرو دل میں کہ جب کبھی تم آتش کدہ نمرود میں گرائے جاؤ تو وہ گلزار بن جائے۔ ذوق یقیں اور عشق میں قوتیں پنہاں ہیں جن کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔

یاد رکھو قرآن کریم کی رو سے ہمارے سارے دردوں کی دوا حق تعالیٰ سے عشق ہے۔ اس کے رسول مقبولؐ سے عشق ہے۔ درد والم اور خوف وہراس کے وقت اپنا رخ اخلاص وخلوص کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف پھیر دو۔ وہی تمہاری مدد کرے گا۔ وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ وہی سب کا نگہبان ہے۔ مددگار ہے - ہر چیز پر اُس کی حکمرانی ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

لیکن اس وقت تم پر اتنا خوف طاری تھا۔ اور تم اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ میری آواز کا تم پر کچھ اثر نہ ہوا - تنکے تیز ہواؤں میں اڑتے ہی چلے گئے۔

تم اُس وقت زندہ نہیں مردہ تھے - جبلتِ موت نے تم سے زندہ ہونے کا احساس چھین لیا تھا — !

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی زندگی ہی میں مر جاتے ہیں۔ نہ ان کی قبریں بنتی ہیں۔ نہ اُن کے کتبوں پر اُن کے نام لکھے جاتے ہیں۔ تم اُس وقت زندہ قبروں کے سوا کچھ بھی نہ تھے۔ جو بھاگی جا رہی تھیں - لیکن یہ دنیا تو زندہ لوگوں کی دنیا ہے۔

جس وقت تم نئے افق کے کنارے پر پہنچے تم بالکل ان تنکوں کی طرح تھے جن کو تیز و تند ہوائیں نہ جانے کہاں کہاں سے اٹھا کر نہ جانے کہاں کہاں پھینک دیتی ہیں۔

یوں نئے افق سے تمہارا تعارف ہوا — !

آبلہ پا لوگ

مجروح قافلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ زخمی عورتیں، مرد، بچے۔ کسی کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ کسی کا ایک بازو کٹا ہوا تھا۔ کسی کا پاؤں نہیں تھا۔ کسی کے کان اور ناک بھی کاٹ دی گئی تھی۔ کوئی سر سے لے کر پاؤں تک زخموں سے چُور چُور تھا۔ بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ زندہ تھا مگر زندہ نہیں تھا۔ کئی عورتوں کی چھاتیاں تلواروں اور کرپانوں کا نشانہ بنی تھیں۔ کسی کا ایک پستان کٹا ہوا تھا۔ کسی کے دونوں۔ دودھ کے چشموں سے لہو اُبل رہا تھا۔

انسان کہاں تک وحشی ہو سکتا ہے؟

انسان کہاں تک درندہ بن سکتا ہے؟

اس کا اندازہ واہگہ کی سرحد پار کر کے اِدھر آنے والے مجروحین کو دیکھ کر کیا جا سکتا تھا۔ انسان پر انسان کے ظلم و استبداد کی یہ زندہ مثالیں تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انسان پتھر اور دھات کے زمانے کی طرف لوٹ گیا ہے۔ وحشت و بربریت کی کیا کیا، کیسی کیسی اور کتنی بھیانک و ہولناک شکلیں ہو سکتی ہیں اپنے اپنے زخموں کی چادروں میں لپٹی ان زندہ لاشوں کی شکلوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔

سرحد پر رضا کاروں کی ایک دو تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ رضا کار زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے انہیں مختلف ہسپتالوں میں پہنچانے کا کام کرتے اور اُن مُردوں کو بھی دفناتے جو سرحد پار کرتے ہی اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔

زخمیوں کے ہسپتالوں میں پہنچتے ہی وہاں لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ لوگ زخمیوں کی مزاج پُرسی کو آنے جانے لگے تھے۔ ان میں درد دل رکھنے والے لوگ بھی تھے جو زخمی اور بیمار لاوارث لڑکے لڑکیوں کو اپنے سائے میں لینا چاہتے تھے۔ اپنی اولاد بنانا چاہتے تھے۔ لیکن ان میں مجرم ضمیر لوگ بھی تھے جو بردہ فروش تھے۔ بچوں کو اغوا کرنے والے تھے۔

اُن کی بن آئی تھی۔ اب اُن کو بچوں کو اغوا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لڑکے لڑکیاں مفت ہی مل رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بے اولاد ظاہر کر کے ہسپتال سے لاوارث بچے لے جا رہے تھے۔ بیچنے کے لیے۔ فروخت کرنے کے لیے۔ انسان نما درندوں نے ملت کے دل کے ٹکڑوں کا بیوپار کیا۔ یتیموں کو بیچا۔

اور پھر ان ننگ انسانیت لوگوں میں بدنام بازار کے بھڑوے اور حرافہ طوائفیں بھی تھیں جو شریف زادیوں کے لبادے اوڑھ کر کم سن لڑکیاں، بالغ لڑکیاں اپنے چباروں کی زینت بنانے کے لیے لے گئیں۔ اس طرح انہوں نے ملت کی بیٹیوں کو، پاکستان کی بیٹیوں کو اسلام کی بیٹیوں کو طوائفیں بنا کر اپنے چباروں میں بٹھایا۔ ان کی کمائی کھائی۔

اک قیامت سی بپا تھی۔!

سرحد پار کرنے والے مہاجرین کے قافلوں کو والٹن ریفیوجی کیمپ میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اور پھر وہاں سے ان کو ٹرینوں اور لاریوں کے ذریعے مختلف شہروں میں منتقل کر دیا جاتا۔

ایسا ہی ایک کیمپ منٹو پارک جو اب جناح پارک کہلاتی ہے میں تھا۔ بالکل وہاں جہاں اب مینار پاکستان ایستادہ ہے۔ لٹے پٹے بھوکے پیاسے بیمار انسانوں کا ایک سمندر کھلے آسمان کے نیچے پڑا تھا۔ دھوپ، بارش آندھی سے بچنے کے لیے نہ توان کے سر پر سائبان تھے اور نہ گھاس پھوس کے جھونپڑے۔ البتہ ان کے لیے پانی کا ذخیرہ فراہم کرنے کے لیے جا بجا مٹی کے مٹکے رکھ دیئے گئے تھے۔ سارا دن وہ چلچلاتی دھوپ میں پڑے رہتے۔ ان کے سروں پر کووں، چیلوں اور گدھوں کے غول منڈلاتے رہتے۔ انہی ایام میں بارشیں بھی ہوئیں۔ وہ جہاں تھے وہیں پڑے بارشوں میں بھیگتے رہے۔ آسمان سے چھاجوں برستے پانی سے بچنے کے لیے ان پناہ گزینوں کو پناہ کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔

موسم بدل رہا تھا۔ دن کو گرمی پڑتی تھی رات کو جاڑا۔ شہر کے مخیر لوگ رضائیاں، کمبل گرم کپڑے وغیرہ ان کو پہنچاتے رہے۔ ان کی روٹی پانی کا مسئلہ کسی حد تک حل کرنے کے لیے دیگیں پکا کر وہاں لاتے رہے۔ اس کیمپ میں بھی موت کا بازار گرم تھا۔ یہاں بھی لوگ ہیضے سے مرنے لگے۔ ڈھیروں سے مرنے لگے۔ انہیں غسل دینے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور نہ انہیں کفنانے

کے لیے تہی دست لوگوں کے پاس ان کے کفن کے لیے پیسے تھے جو مرتا گیا انہی کپڑوں میں دفن ہوتا گیا ۔ اور ان کی قبریں بھی اتنی گہری نہ کھودی جاتیں تھیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کتے رات کے وقت قبریں کھود کر لاشیں نکال کر ان کو چیرتے پھاڑتے اور ان کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے ۔ اور یہ قبریں اسی منٹو پارک کے اس کنارے پر تھیں جہاں یادگار پاکستان کی تعمیر سے پہلے گندا نالہ بہتا تھا ۔ یہیں مہاجروں کی عارضی بستی تھی اور یہیں ان کا قبرستان ۔ لاش زیادہ دور تک اٹھا کر نہ لے جانا پڑتی تھی ۔

روشنیوں کا شہر زندگی سے بیزار تھکے ہوئے انسانوں کے لیے بہرے، گونگے اور اندھے انسانوں کی دنیا سے زیادہ نہ تھا ۔

والٹن کیمپ میں ایک کہرام مچا تھا ۔ مہاجرین کے قافلے تھے کہ برابر چلے آرہے تھے ۔ جگہ تھوڑی تھی انسان زیادہ تھے ۔ بھوک پیاس اور اپنے دکھوں سے حشرات الارض کی طرح کلبلا رہے تھے ۔

اس کیمپ میں بھی ہیضہ، ڈیریا، پیچش، ملیریا ایسی وبائیں پھوٹ نکلی تھیں ۔ باوجود طبی امداد ملنے کے سینکڑوں لوگ روز مر رہے تھے ۔ مخیر اور درد دل رکھنے والے لوگ یہاں بھی پناہ گزینوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لاتے تھے ۔ ان میں کپڑے تقسیم کرتے تھے ۔ ان کی دلجوئی کرتے تھے ۔ ان کی اشک شوئی کرتے تھے ۔ ان کی دردناک کہانیاں سن کر ان کے ساتھ روتے تھے ۔

کل رات برستی ہوئی ساون کی گھٹا بھی
اور ہم بھی تیری یاد میں دل کھول کے روئے

وہ دردناک کہانیاں ۔ وہ لہولہو داستانیں ۔ وہ خونچکاں حکایتیں مجھے ابھی تک یاد ہیں ۔ ہمیشہ یاد رہیں گی ۔ وہ کہانیاں کسی طور بھلائی نہیں جا سکتیں ۔ تمہارے جسموں کے زخم کل بھی میرے دل پر ہرے تھے ۔ آج بھی ہرے ہیں ۔ کل بھی ہرے ہوں گے ۔

تم نے اس آزادی کی بہت زیادہ قیمت ادا کی ہے ۔ تم نے اس آزادی کو اپنی ہزاروں کنواریوں کی عصمت لٹا کر خریدا ہے ۔ اپنے لاکھوں بھائیوں کے خون کے دریاؤں میں تیر کر اس کو حاصل کیا ہے ۔ اپنے عزیزوں کی لاشوں کے میدانوں میں رینگتے ہوئے اس آزادی کے دروازے تک پہنچے ہو ۔ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی کہ تاریخ کے ترازو میں کسی ملک کسی قوم کی آزادی اس

طرح تُلی ہو۔

تم بھول چکے ہو تو بیشک بھول جاؤ۔ میں نہیں بھلا سکتا۔ ان آبلہ پا لوگوں کو بھلانا میرے لئے بڑا مشکل ہے جن کے پاس جسم کے زخموں اور پاؤں کے آبلوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ جو اپنے گھروں سے یوں اٹھ آئے تھے جیسے دل سے آہ اٹھتی ہے۔ جو اپنوں سے یوں بچھڑ گئے تھے۔ بکھر گئے تھے جیسے آندھی سے تنکے۔

جب میں ان مظالم کا تصور کرتا ہوں۔ جو ہندوؤں نے سکھوں کو اپنا آلہ کار بنا کر ان پر توڑے۔ تو میں عجیب اذیت ناک احساس سے دوچار ہو جاتا ہوں۔ جیسے ان آبلہ پا خستہ جاں لوگوں پر نہیں مجھ پر وہ ظلم ٹوٹے تھے۔ کبھی میں اپنے آپ کو نیزوں کی نوک پر دیکھتا ہوں۔ کبھی اپنے آپ کو تلواروں اور کرپانوں کے نیچے تڑپتے پاتا ہوں۔ کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں جلتی ہوئی لاشوں کے سمندر میں ایک ایک لاش سے لپٹ کر رو رہا ہوں۔ اور آبلہ پا لوگوں کے قافلے میرے اوپر سے گزرتے ہوئے سنسان راستوں پر تنکوں کی طرح اڑے چلے جا رہے ہیں۔

تمہارے احساس کے نزدیک شاید یہ صدیوں کی بات ہو لیکن میرے احساس میں یہ کل کی بات ہے کہ جو آبلہ پا پہلے آ گئے تھے وہ بعد میں آنے والوں کے انتظار میں ہزاروں کی تعداد میں واہگہ بارڈر پر کھڑے رہتے تھے۔ کسی کا باپ، کسی کی ماں، کسی کی بیوی، کسی کے بہن بھائی اور بیٹی بیٹے واہگہ پار کی بے کراں پنہائیوں اور اندھیری کھائیوں میں کھو گئے تھے۔ اور یہ انتظار اکثر موہوم ثابت ہوتا۔ بہت کم تھے جو اپنے عزیزوں کو پا لینے میں کامیاب ہوتے۔ بعض کو اپنے پیاروں کے ہولناک وحسرت ناک انجام کی خبر ملتی۔ اور بعض آبلہ پا تو ایسے تھے جو واہگہ کی سرخ لکیر پر حسرت و یاس کے سنگ میل بنے واہگہ کے اس پار کی بیکراں پنہائیوں اور اندھیری کھائیوں میں ٹکٹکی لگائے بس دیکھے جا رہے تھے۔ کہ تھر تھرانی کالی رات ذرا تو سمٹ جائے۔ کچھ تو روشنی ہو۔ کچھ دکھائی تو دے بیکراں پنہائیوں میں۔

اپنوں کو کھو کر زندہ رہنا مرنے سے کہیں مشکل ہے۔ اب وہ آبلہ پا زندگی کی انہی مشکل منزلوں سے گزر رہے تھے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کے کانوں میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

وہ سب مہاجر کیمپوں میں پڑے تھے۔ اور موت اسی رفتار سے ان کا تعاقب کر رہی تھی۔

کیمپوں میں وبائیں پھوٹ پڑی تھیں۔ ہیضہ، ڈیریا، پیچش، ملیریا، ٹائیفائڈ۔ سینکڑوں لوگ روز مر رہے تھے۔ اتنی لاشوں کو ہر روز غسل دینا اور کفن دینا بھی ایک مسئلہ تھا۔

مجھے بے شمار مسائل میں الجھا دیا گیا تھا۔ الجھنوں سے الجھنیں نکلتی چلی آ رہی تھیں۔ میری معیشت پر سات کروڑ روپے کا بوجھ پڑ گیا تھا۔ ایک ایسے ملک کے لیے جو ابھی اپنے پاؤں پر سنبھلا بھی نہ تھا یہ بھی ایک ضرب کاری تھی کہ وہ ان لٹے پٹے قافلوں کے بیچے دب کر ہی کچلا جائے۔ لیکن ایسے پُر آشوب وقت میں میرے نیک خو، نیک دل، نیک نیت، بامرد اور استقلال کے پتلے بیٹے بیٹیوں نے میرا ساتھ دیا۔ میرے ساتھ انہوں نے بھی رات کی نیند اور دن کا آرام اپنے لیے حرام کر لیا۔ انہوں نے اپنے آبلہ پا بھائیوں کے آبلوں پر اپنے آنسوؤں کی شبنم کے پھاہے رکھے۔ ان کی ہر طرح دلجوئی و اشک شوئی کی۔ وہ ان کی دردناک کہانیاں سنتے ہوئے ان کے ساتھ مل کے روئے۔ کڑکتے جاڑوں میں اُن کے لیے رضائیاں، کمبل، توشک، گدیلے، تکیے، سوئیٹر مفلر، موزے، کوٹ، چسٹر اور کھانے پینے کی چیزیں فراہم کر کے ان کو پہنچاتے رہے۔ ان میں ادویات تقسیم کیں۔ ایک ماں کو اُس کا بچھڑا ہوا بیٹا، ایک بہن کو اُس کا بھائی اور ایک بھائی کو اس کی بہن یاد نہ آنے دی۔ انہوں نے ان کے درد بانٹے۔ اُن کے درد کے کانٹے اُن کی زندگی کے دامن سے نکال کر اپنے سینوں میں چبھو لیے۔

ہر روز کئی لوگ پلاؤ زردے اور قورمے کی دیگیں پکوا کر لے آتے تھے۔ ٹرک کے ٹرک روٹیوں سے بھر کر لے آتے تھے۔ انہیں کھلاتے تھے۔ لیکن ان میں وہ ننگ پاکستان، ننگ دین، ننگ قوم اور ننگ انسانیت لوگ بھی تھے جو مہاجرین کی خدمت کی آڑ میں اپنی ہی قوم کی بہو بیٹیاں کا شکار کرنے آتے تھے۔ ان کے دکھوں کی داستان چھیڑ کر اداکاری کرتے۔ روتے، آہیں بھرتے، سینہ پیٹتے لیکن اُن کی ہولناک نظریں مہاجر لڑکیوں کی بوٹی بوٹی کو یوں ٹٹولتیں جیسے قصاب بھیڑ بکریوں کو ٹٹولتا ہے۔

اُن میں کچھ ایسے گناہ گار بھی تھے۔ جنہوں نے کیمپ میں روز آتے جاتے ہوئے کئی معصوم لاوارث لڑکیوں کو اُن کے لواحقین سے ملا دینے کا جھانسہ دیا۔ انہیں اپنی رفیقہ حیات بنا لینے کی جھوٹی قسمیں کھائیں۔ انہیں کیمپوں سے لے اڑے۔ پہلے انہیں خود خراب کیا اور پھر یا تو انہیں

ٹھیکلے اور کٹم خانے میں بٹھا دیا یا ایک آوارہ جھونکے کی طرح ہر چیز کو چھوتے پھرنے کے لیے سنسان اجنبی راستوں کے بھنور میں چھوڑ دیا۔

ان کیمپوں میں بردہ فروشی بھی ہوئی۔ لڑکیاں اغوا بھی ہوئیں۔ زنا بالجبر اور عصمت دری کی وارداتیں بھی ہوئیں۔ ننگی بھوکی لاوارث ولاچار عورتوں کو کیمپ کے پاکستان دشمن، مجرم ضمیر اور درندہ صفت رضاکاروں نے ایک روٹی کے عوض، ایک رضائی کے عوض، ایک کپڑے کے عوض، مٹھی بھر آٹے اور چاول کے عوض، ایک کٹوری دال کے عوض خراب کیا۔ ان کو منتظم بنایا گیا تھا ان لوگوں کی نگہداشت کا کام سونپا گیا تھا۔ لیکن اُن میں سے بعض نے اس منصب سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد نہ تھا۔ ان کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا۔ انہوں نے قوم پرستی کو چھوڑ دیا۔ ہوس پرستی پر اُتر آئے اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ یہ مجرم ضمیر انسان نما درندے رضاکار اسی لئے بنے تھے کہ اس افراتفری اور ہلچل سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن ان میں وہ رضاکار بھی تھے۔ وہ خدائی خدمت گار بھی تھے جنہوں نے کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی تن، من، دھن سے انسانیت کی بے مثال خدمت کی۔ آڑے وقت میں اپنے بھائیوں کے کام آئے۔ آبلہ پا لوگوں کے کانٹے انہوں نے اپنی پلکوں سے نکالے۔ ان کے سامنے ایک نصب العین تھا۔ ایک لگن تھی۔ ایک مقدس جذبہ تھا۔ وہ صراط مستقیم پر چلتے ہوئے اس آزمائش گاہ میں آئے تھے اور بدستور صراطِ مستقیم پر گامزن رہے۔ ان کے پائے استقلال میں ذرا سی لغزش نہ آئی۔ مرحبا ملک و قوم کے سچے خدمتگارو اور غمخوارو ——— !

میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں ہر کیمپ میں ہر جگہ موجود تھیں۔ اسلام کی وہ ہزاروں بیٹیاں۔ پاکستان کی بیٹیاں جو ہزاروں درندوں کا شکار ہوتے ہوئے ارض موعود میں آئی تھیں اب اپنے بھائیوں کی درندگی کا شکار ہو رہی تھیں۔

یہ دھرتی ان کے لیے جنت و فردوس کی سرزمین تھی اور یہاں کا ہر مسلمان ان کو اپنا بھائی اپنا باپ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن ان بھائیوں اور باپوں میں کئی لوگ ہولناک شکاری نکلے۔

رنگ اڑ جائے گا شگوفوں کا
اعتبارِ صبا کا نام نہ لو

آہ پاکستان کی وہ بیٹیاں - اسلام کی وہ بیٹیاں جن کی چوڑیاں پیاروں کی جدائی میں لد رہی تھیں - جن کی زندگی بیوہ کی کلائی کی طرح ننگی تھی - انسانوں کا چہرہ لگائے شیطانوں سے جھجکتے اور سمٹتے ہوئے ، اپنے آپ کو یوں دیکھ رہی تھیں - جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہوں -

چلو اے بلبلو اس گلستان سے

یہاں صیاد مالی ہو گئے ہیں

جب انہوں نے واہگہ کی سرحد پہ پہنچ کر ہلالی پرچم دیکھا تھا تو سب کچھ کھو کر آنے کے باوجود ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی - انہوں نے خدا سے اُس پرچم کی سربلندی کی دعائیں مانگیں - سجدے کئے - اور گڑگڑا کر روتے ہوئے کہا -

خدا تجھے ہمیشہ بلند رکھے ہلالی پرچم - خدا تجھے ہمیشہ سلامت رکھے ارض پاک - ہم اپنا سب کچھ تم پر قربان کر آئے ہیں - اگر تجھے اپنی سلامتی کے لیے یہ جو کچھ بچ رہا ہے . ہمارے پاس اس کی بھی ضرورت ہے تو ابھی حاضر ہے —!!

آبلہ پا لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کانٹے واہگہ کے اُس پار ہی چھوڑ آئے ہیں - لیکن اس پار آ کر انہیں اُن کانٹوں سے زیادہ نوکیلے اور زہریلے کانٹوں کا سامنا کرنا پڑا - جن سانپوں کے ڈنک پر ڈنک کھاتے ہوئے وہ یہاں پہنچے تھے ان سے کہیں زیادہ موذی سانپ انہیں ہر راستے پر موڑ پر پھنکارتے لہراتے ادھر بھی نظر آئے -

اُن مجرم ضمیر لوگوں کے جرائم کو میں کبھی معاف نہیں کر سکتا - اسلام کبھی معاف نہیں کر سکتا . انسانیت کبھی معاف نہیں کر سکتی - وہ تعزیرات پاکستان میں ، تعزیرات اسلام میں ، تعزیرات انسانیت میں سنگین مجرم ہیں - انہوں نے بڑے سنگین جرائم کئے ہیں وہ ماخوذ و مطلوب ہیں - مفرور ہیں - لیکن وہ کب تک مفرور رہیں گے - ایک نہ ایک دن اُن کو پکڑے ہی جانا ہے اور سزا پانا ہے - مکافات عمل سے وہ بچ نہیں سکتے اور نہ کوئی ان کو بچا سکتا ہے -

آبلہ پا لوگوں کی یہ اجڑی ہوئی دنیا بھی بڑی ہی دردناک اور بڑی ہی معنی خیز تھی - کچھ لوگ تو ایسے تھے جیسے پتھر میں ڈھل گئے ہوں - نہ منہ سے بولتے تھے نہ سر سے کھیلتے تھے - ٹکٹکی لگائے آسمان کو تکے جاتے تھے - اور اچانک رو پڑتے تھے -

کچھ یوں بھی اداس تھی طبیعت
کچھ ان کی بھی یاد آ گئی ہے

کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ ٹھٹھرتی رات میں اپنی زندگی کے چیتھڑوں میں لپٹ کر سو بھی جاتے تو تھوڑی دیر میں چونک جاتے۔ چیتھڑوں سے جھانکتے ہوئے اپنے گردوپیش کی ہر چیز کو دیکھنے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ان کی متلاشی نظریں مایوس ہو کر واپس لوٹ آتیں۔ وہ پھر سو جاتے لیکن تھوڑی دیر میں پھر چونک پڑتے۔

ان کی مخمور نگاہوں کے تصور میں اگر
سو بھی جاؤں تو مجھے خواب جگا دیتے ہیں

کچھ لوگ ایسے تھے جن کے لبوں پر کوئی شکوہ نہ تھا۔ کوئی شکایت نہ تھی۔ نہ اپنوں کی نہ پراؤں کی۔ جو تھے لیکن نہیں تھے۔

ہوا کے دوش پہ جلتے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکائتیں کیسی

کچھ لوگ ایسے تھے جو کیمپ میں آگ کا الاؤ جلا لیتے۔ اور آگ تاپتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں ناچتی پرچھائیوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہتے جب تک وہ پرچھائیاں آگ بجھ جانے سے غائب نہ ہو جاتیں۔

ہم نے انہیں کو صورت جاناں بنا لیا
دیوار آرزو پہ جو پرچھائیاں ملیں

کچھ ایسے آبلہ پا بھی تھے جن کے ساتھ اگر زندگی اور زندہ رہنے کی بات کی جاتی تو وہ توجہ ہی نہ دیتے۔ جیسے یہ دونوں چیزیں ان کے لیے بے معنی ہوں۔

مجھے زندگی کی دعا نہ دے مجھے زندگی کی طلب نہیں
کبھی جینا مجھ کو عزیز تھا یہ بجا سہی مگر اب نہیں

اور پھر

زندگی تو ہے درد کا شاہکار عظیم
لوگ کیا سوچ کے جینے کی دعا دیتے ہیں

کچھ آبلہ پا اس قدر یاسیت و محرومیت کا شکار ہو رہے تھے۔ کہ بس کچھ نہ پوچھئے وہ جن بھیانک اندھیروں کو دیکھ آئے تھے۔ روشنیوں کے شہر میں پہنچ کر بھی یہی کہتے تھے۔

اِس اندھیروں کے عہد میں ساغرؔ
کیا کرے گا کوئی اجالوں کو

کچھ آبلہ پا اپنے آبلوں کو سہلاتے ہوئے ہر وقت روتے رہتے تھے۔ ان کی آنکھوں سے برستے آنسوؤں کی جھڑی ایک پل نہ تھمتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ یادیں ان کے دل سے آنسو بن کر مسلسل نکلتی رہتی ہیں۔ اور آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے رکنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔

کچھ لوگ کسی بات پہ آتے ہی نہیں یاد
کچھ لوگ کسی طور بھلائے نہیں جاتے

ان آبلہ پا لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے۔ جو اندھیروں کے سمندر میں ڈوب کر نکلنے کے باوجود جلتی ہوئی شمع تھے۔ اندھیروں کے لیے چیلنج تھے۔ ان کا ہر نقش ایک چیلنج تھا۔

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

ان آبلہ لوگوں میں کچھ لوگ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ انہوں نے قیامت کے جو خونچکاں مناظر دیکھے تھے اور حشر کے جن میدانوں میں سے گزرتے تھے ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے تھے۔ اور پھر ان کے یہاں آنے پر کچھ لوگوں نے ان کے ساتھ جو ترجیحی سلوک کیا تھا۔ وہ ان کے ذہنی توازن کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے کے لیے کافی تھا۔

بن گئے لالہ و گل جزو قفس
کس سے اب ذکرِ صبا کیجئے گا

کچھ کیمپ ایسے تھے جہاں روٹیاں بڑی مہنگی بکیں۔ جن کے پاس پیسے تھے وہ تو دونوں وقت کھا لیتے اور جن کے پاس کچھ نہیں تھا کھانے والوں کا منہ تکتے رہ جاتے۔ قوم پر قیامت کی گھڑی تھی۔ زخموں، آبلوں اور لاشوں کے بازار لگے تھے لیکن بنیا، اور مہاجن قسم کے مسلمان۔ سیوک یہودی قسم کے نام نہاد مسلمان وہاں صرافہ کھول بیٹھے تھے۔

آبلہ پا لوگوں کے پاس زخموں اور آبلوں کے سوا تھا ہی کیا ۔ لیکن پھر بھی ان میں سے کچھ نہ کچھ ایسے تھے جو کسی نہ کسی طرح اپنے زیورات وغیرہ چھپا کر ادھر لے آنے میں کامیاب ہو گئے تھے ۔ کیمپ کی زندگی میں ضروریات کا دباؤ پڑا تو اپنے زیورات بیچنے پر مجبور ہو گئے تھے ۔ بنیائے اور مہاجن قسم کے نام نہاد مسلمان تباہ حال مسلمانوں کے زیور خریدتے تھے ۔ روپیہ کی قیمت دو آنے لگاتے تھے ۔ لیکن سونا چاندی زندگی سے زیادہ قیمتی چیز نہیں ۔ خستہ حال لوگ مجبوراً اونے پونے زیورات فروخت کر کے جو کچھ ملتا صبر شکر کر کے لے لیتے ۔

واہگہ کے اُس پار بھی مسلمانوں کی لاشوں کو گدھ نوچ نوچ کھا رہے تھے ۔ واہگہ کے اس پار بھی مسلمانوں کی زندہ لاشوں کو گدھ نوچ نوچ کر کھاتے رہے ۔ مجبور و مقہور انسانوں سے ناجائز طور پر ایک پیسہ بھی ہتھیا لینا بالکل ایسا ہی تھا جیسے ان کے گوشت کی ایک بوٹی نوچ لینا ۔ انسان نما گدھ اُس وقت بھی موجود تھے اور اس وقت بھی موجود ہیں ۔ زندہ رہنے کے لیے ان کو زندہ انسانوں کا، لاشوں کا گوشت چاہیئے ۔ خون چاہیئے ۔ جبکہ میں محاسبہ کروں گا ۔ دفتر احتساب کھولوں گا ۔ جہاں ان کو زندہ اور مردہ لاشوں کے گوشت کی ایک ایک بوٹی کا حساب دینا ہو گا ۔ اپنی بھیانک چونچوں سے چاٹتے ہوئے ایک ایک قطرہ خون کی جوابدہی کرنا ہو گا ۔

آبلہ پا لوگ مہینوں انہی کیمپوں میں پڑے رہے ۔ ان کی آبادکاری کے کام نے زور پکڑا ۔ تو وہ ایک بار پھر قافلوں کی صورت میں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے ۔ میرے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں انہیں آباد کرنے کے لیے باضابطہ ایک محکمہ بحالیات معرض وجود میں آیا ۔

مہاجرین کو لاریوں اور ریلوں کے ذریعے جہاں جہاں انہوں نے جانا تھا انہیں پہنچایا جا رہا تھا ۔ کیمپوں کی زندگی سے گھبرائے اور بھنائے ہوئے لوگ خوشی خوشی روانہ ہو رہے تھے ۔ اسٹیشنوں پر خلقت کا ہجوم ۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ۔

ریل کے ڈبوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے ۔ بہت سے لوگ پائدان پر کھڑے ، بہت سے ریل کی چھت پر سوار ۔ ۵۰ انسانوں کے بیٹھنے کی گنجائش کے ڈبوں میں ۵۰۰ گھس کر بیٹھ رہے تھے ۔ گرمیوں کا موسم ۔ جو لوگ ڈبوں میں تھے جہنم میں تھے اور جو لوگ ڈبوں سے باہر تھے وہ بھی مئی جون کے سورج کی چلچلاتی دھوپ کے جہنم میں تھے ۔

اور خطرہ سے کھیل رہے تھے ۔

موسم کی شدت میں حفاظت کا کوئی انتظام نہ تھا اور انتظام ممکن بھی نہ تھا۔ منزل تک پہنچتے پہنچتے کئی آدمی پائدان سے نیچے گر گئے اور کئی چھت سے لڑھک گئے ۔ اور پھر سانس نہ لے سکے ۔ یہ ان کی آخری سانس تھی جو وہ لے سکے تھے ۔

آسیبِ شب

تم اندھیروں کے ڈراونے اور آگ اچھالتے سمندر سے نکل کر آئے تھے۔ لاشوں کی لہروں میں تیرتے ہوئے ساحل تک پہنچے تھے۔ تمہیں ہندوستان کی آزادی کی والپر گس رات کے آسیب نے دبوچ لیا تھا۔

جب تم اندھیروں کے ہولناک سمندر سے نکل کر ادھر آئے تو تم پر جبلت مرگ طاری تھی۔ تمہارے جسم کے ہر عضو پر خوف و ہراس کی پھپھوندی لگی تھی۔ تمہاری بوٹی بوٹی کپکپا رہی تھی۔ تھرتھرا رہی تھی۔ تمہاری پھٹی پھٹی آنکھوں میں جانکنی کے عالم کی دھند اور کہر منڈلا رہی تھی۔ تمہاری سانسوں میں تمہاری چیخیں اور دہشت زدہ آوازیں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ تم ذہنی طور پر مر چکے تھے۔ بعض اوقات انسان اپنی مدافعت کرتے کرتے خودکشی کر لیتا ہے، اس کی مدافعت خودکشی کے مترادف ہوتی ہے۔ تمہارے ذہن میں اس قدر اندھیرا چھا چکا تھا۔ کہ روشنیوں کے شہر میں آ کے بھی تمہیں روشنی کا کوئی احساس نہ تھا۔

انسان کا ہر فعل اس کی نفسی حقیقت کا اظہار ہے۔!

کتنی ہی نفسیاتی الجھنوں نے تمہارے ذہن میں مکڑی کے جالے تن دیئے تھے۔ اور ان الجھنوں کا کوئی نام نہ تھا۔ بے شمار نفسیاتی الجھنیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا جو انسانی ذہن پر دھند اور کہر بن کے چھا جاتی ہیں اور ذہن انسانی کے تمام دریچوں اور کھڑکیوں کو بند کر دیتی ہیں۔ اس لئے روشنی کی کوئی کرن اندر نہیں جا سکتی۔

پھر یہ ایک سورج کیا اگر ایک لاکھ سورج بھی ایک ساتھ چمکنے لگیں تو انسان کے ذہن پر چھائی ہوئی نفسیاتی رات کو نہیں اجال سکتے۔ اور انسان اندھیروں کی بھول بھلیاں میں کھو کے رہ جاتا ہے جہاں وہ دوسروں ہی کو نہیں اپنی ذات کو بھی اپنے لئے اجنبی پاتا ہے جہاں وہ دوسروں ہی سے نہیں اپنے آپ سے بھی ڈرتا ہے۔

ایسا ہی ایک ذہنی سانحہ، ایک ذہنی المیہ، ایک ذہنی Slide Land۔ ایک ذہنی زلزلہ

زلزلہ تمہاری ذہنی دنیا میں بھی آیا تھا جس نے تمہیں ریزہ ریزہ، کرچی کرچی کر دیا تھا۔ تم ہزاروں ٹکڑوں میں ٹوٹ چکے تھے۔

پھر جب تمہیں روشنیوں کے شہر کی بستیوں میں اتارا گیا کہ تم اپنے لئے نئی بستیاں آباد کرو۔ تو تم آسیب بن کر ان بستیوں میں اترے۔ تم جہاں جہاں تھے وہاں وہاں اپنی ذات میں سمٹنے لگے اور اپنے ان ٹکڑوں کو چننے لگے جو یہاں آکے ٹوٹے تھے اور بکھر گئے تھے۔ تم نے اپنے اوپر اندھیروں کا ایک اور خول چڑھا لیا۔ تم خوف دہراس سے صحیح معنوں میں اپنی ذات کے اندر کاموفلاج ہو گئے — کاموفلاج —!!

اس میں تمہارے ارادے، تمہارے شعور و احساس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تم اس ذہنی آسیب سے مجبور تھے جو پیر تسمہ پا کی طرح تمہارے کندھوں پر سوار تھا۔

یہ وہ عبوری دور تھا جسے تعمیر و حسرت تعمیر کا دور کہنا چاہیئے۔ روشنیوں کے شہر میں چراغاں تھا۔ ایک نصب العینی مملکت خداداد کا قیام عمل میں آ چکی تھی۔ آزادی کے چراغ روشن تھے۔ اور ہر چراغ تلے اندھیرا تھا۔

روشنیوں کے رستے۔ بستے شہر پر شب خون مارنے کے لئے اندھیرے ہر چراغ تلے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یہ اندھیرے اس شہر کی ہر روشنی کے کھیت میں اندھیرے بونے کے مواقع کے منتظر تھے۔

اندھیرا روشنی کا دشمن ہے۔ اور روشنی اندھیرے کی دشمن۔ روشنیوں کے شہر کے ساتھ اندھیروں کی ابتداء سے دشمنی چلی آ رہی ہے کئی بار روشنی سے شکست کھا چکے ہیں۔

شکست کھا کے رہے گی چراغ سے ہر شام —!

لیکن شکست کھا چکنے کے باوجود جب تک اندھیرا ختم نہ ہو جائے روشنی کے لئے خطرہ ہے۔ اجالے کے خلاف اندھیرے کی سازشیں ہمیشہ جاری رہی ہیں۔ ہمیشہ جاری رہیں گی۔ تمہاری ہی آزادی کے چراغوں تلے گھات لگائے بیٹھے اندھیروں نے زیرِ زمیں سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے ایک مبسوط و مربوط پلان بنا لیا کہ آزادی کے یہ چراغ جل تو گئے ہیں لیکن انہیں زیادہ دیر جلنے نہ دیں گے۔ ان کو بجھا کر رہیں گے۔ ان کو بجھنا ہی ہو گا۔

اندھیروں نے مختلف میک اپ کئے۔ مختلف مصنوعی چہرے لگائے اور اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔

ہر رات کا اندھیروں کا اپنا ایک ناٹک ہے۔ وہ جنہوں نے رات کا ناٹک نہیں دیکھا نہیں جانتے۔ لیکن جنہوں نے دیکھا ہے خوب جانتے ہیں کہ سورج کے غروب ہونے سے طلوع ہونے تک ہر رات کا اپنا ایک ناٹک ہے۔ ہر رات اندھیروں کی اسٹیج پر ایک کھیل کھیلا کرتی ہے۔ وہ اپنی اندھیروں سے ایک مخلوق یعنی اس کھیل کے اداکار پیدا کیا کرتی ہے۔ جو مختلف میک اپ کر کے مختلف سوانگ بھرا کرتے ہیں۔ مختلف روپ دھار لیا کرتے ہیں۔ وہ کردار وہ اداکار اندھیروں میں خود بخود کگرمتوں کی طرح اگ آتے ہیں۔ جن کی یہ کوشش ہوتی ہے رات جتنی لمبی ہو سکتی ہے لمبی ہو جائے۔ کبھی اجالا نہ ہو۔ ہمیشہ اندھیرا رہے۔ ان کا کھیل جاری رہے۔

دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا ہے اور وہ خوب جانتی ہیں کہ ہر رات گذر جانے کے باوجود ہر دن کی طرح اپنے کچھ نقوش ہر بستی کے در و دیوار پر چھوڑ جایا کرتی ہے اور وہ نقوش اپنا اپنا جادو جگایا کرتے ہیں۔

اور پھر رات کے پیچھے چھوڑے ہوئے نقوش کا جادو دن کے چھوڑے ہوئے نقوش کے جادو سے زیادہ عجیب و غریب ہوتا ہے۔ آج تک ایسا نہیں دیکھا گیا کہ کبھی غروب آفتاب کے بعد کسی روشن شے نے پوری رات اور اس کے بیکراں اندھیروں کو اس طرح اجال دیا ہو کہ رات پر دن کا گمان ہونے لگے۔ لیکن ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی کالی آندھی، کسی کالی گھٹا یا دھند کے دبیز پردوں نے سورج کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ دن پر رات کا گمان ہونے لگا ہے۔ یہ اندھیروں کا جادو ہے۔ اندھیروں کا مسمریزم ہے۔ ہپناٹزم ہے۔ جس نے اجالوں میں جیتی جاگتی سانس لیتی قوموں کو میٹھی لوریاں سناتے ہوئے انہیں سلا کر بڑے پیار سے ان کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ کہ آج صدیوں کے اندھیروں میں ان کی قبروں اور مقبروں کے کھنڈر بھی نظر نہیں آتے۔

روشنیوں کے شہر میں اندھیروں کی سازشیں زیر زمین گہری ہوتی چلی گئیں۔ سطح پر روشنی

تھی لیکن عمق میں اندھیرے۔ جو بھنور بن کر آہستہ آہستہ سطح کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ اس صورت حالات میں کچھ دردمند دُور اندیش ذہن ایسے بھی تھے جنہوں نے تم سب کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ روشنیوں کے شہر کی طرف بڑھتے اندھیرے کے گردابوں سے تمہیں آگاہ کرنے کے لئے چیخ چیخ کر منادی کی۔ لیکن تم نے انہیں پاگل کہا۔ انہیں پتھر مارے۔

تم اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہو۔ تم نے اپنے مخلص و سچے سربراہوں اور قائدوں کے ساتھ اب تک ایسا ہی برتاؤ کیا ہے۔ کسی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ کسی کو جلاوطن کر دیا۔ کسی کو محلاتی سازشوں کے پردوں میں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ کسی کی تمام عمر تمہارے قید خانوں میں گزری۔ تمہاری تفہیم کے لئے ان اندھیروں کو اہم اشاریے قرار دیا جا سکتا ہے۔

روشنیوں کے شہر میں اندھیروں کی سازشیں کامیاب رہیں۔ تمام شہر پر آسیب سا بن کر مسلط ہو گئے۔ تم نے اجالے میں اندھیرا کر دیا۔ سفیدی میں سیاہی گھول دی۔ اندھیروں نے تم پر مسمریزم کا عمل کر دیا۔ تم ایک خواب میں جاگ اٹھے۔ نیند میں جاگ اٹھے۔ نیند میں چلنے پھرنے لگے۔ نیند میں بولنے چالنے لگے۔ نیند میں اوڑھنے، پہننے اور نیند میں کھانے پینے لگے۔

اور پھر وہ ہوا جو نہ ہونا چاہیئے تھا۔ جو خود زخمی تھے اس کا انتقام دوسروں کو زخمی کر کے لینے لگے۔ ایک ہی شہر کے باشندے ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن گئے۔ ایک ہی کنبے کے افراد ایک دوسرے کے لئے بیگانے بن گئے۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگا۔ بھائی نے بھائی کی عزت کو لوٹا۔ قوی نے ضعیف کو، طاقتور نے کمزور کو معاشرتی جبر سے مغلوب کرنے کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ تمہاری آپس کی معاشی لوٹ کھسوٹ نے ایسے مسائل پیدا کر دیئے کہ پردہ نشین عورتیں جن کا کبھی کسی نے سایہ تک نہ دیکھا تھا صرف پیٹ کی خاطر اندھیروں میں نکلنے پر مجبور ہو گئیں۔

تمہارے لالچ و مطامع اور حرص و ہوس نے ایسے ایسے سکینڈل چلائے کہ لاشوں کے ڈھیروں پر تمہارے تاج محل تعمیر ہوتے چلے گئے۔ جب کہ بے شمار خانماں برباد لوگوں کو سر چھپانے کے لئے گھاس پھونس کا جھونپڑا بھی نصیب نہ ہوا۔ وہ زمانے کی نہیں تمہاری ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمہاری گرد راہ بن کر ہوا میں منتشر ہو گئے۔

جو لوگ محتاج اور ضرورت مند تھے۔ وہ تو بیچارے زیادہ ترٹھوکریں کھاتے رہے۔ الاٹمنٹوں لائسنسوں اور پرمٹوں کی دولت اور نعمت تو صرف انہی کے حصے میں آئی ہے جو نہ تو ضرورت مند تھے اور نہ محتاج۔ جو کھاتے پیتے لوگ تھے۔ جن کے پاس پہلے ہی بنک بیلنس تھا۔ عالیشان بنگلے تھے۔

تم خوب جانتے ہو۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ دکانوں کا مال، گھروں کا فرنیچر، لہلہاتے کھیت، چلتے ہوئے کارخانے کس کس کے حصے میں آئے۔ جو مستحق تھے محروم رہے اور جو مستحق نہیں تھے مالامال ہو گئے۔

دیکھا ہے میں نے اپنے زمانے کی دھول میں
کچھ سیدھے سادھے لوگ خموشی سے مر گئے

یہ اندھیروں کا انقلاب تھا۔

چور اچکے چودھری اور غنڈی رَن پردھان ہو گئی۔ ملمع سازوں کو مفکرِ اعظم اور زعیم کبیر بنا دیا۔ ملت فروش ملت کے رہبر بن بیٹھے۔ ایک چہرے میں کئی چہرے لگا کر انسان نے انسان کو کیسے کیسے دھوکے نہیں دیئے۔ لوگ کانٹوں کی بات کرتے ہیں۔ میں نے پھولوں کو زخم لگاتے دیکھا ہے۔

خوشنما رنگ اگر صحیح مقام پر نہ ہو تو دھبہ معلوم ہوتا ہے۔ میری تعمیر کی تصویر کے رنگوں کو ان کے صحیح مقام پر نہ لگایا گیا جس سے میری تعمیر کی تصویر کے خوش نما رنگ نقطوں، دھبوں اور بدنما لکیروں میں بکھر کر رہ گئے۔

تم میں سے اکثر اپنا توازن کھو بیٹھے۔ میں نے انسانوں کو ایک ایک ہڈی پر غراتے اور لڑتے دیکھا۔ دو پیسے کے نفع کے لئے ایک دوسرے کا گلا گھونٹتے دیکھا۔ شخصی اثر اور سیاسی قوت کے حصول کے لئے ایک دوسرے کی قبریں کھودتے دیکھا۔ اور پھر میں نے ان کو بھی دیکھا۔ جو "قال اللہ و قال الرسول" کے پردے میں لوگوں کے کپڑے اتار لیتے ہیں۔ اور میں نے ان کو بھی دیکھا جو زندگی بھر نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے ہیں۔

میں تم سب کو اسی طرح جھگڑتے، مرتے مارتے، ڈوبتے تیرتے، فنا ہوتے اور زندہ رہتے ہوئے دیکھتا رہا اور اب تک دیکھ رہا ہوں۔ آسیب شب نے تمہیں بدستور دبوچ رکھا ہے۔ وہ آسیب زدہ رات ابھی گذری تو نہیں۔ اور تم خواب میں جاگ اٹھے ہو۔ تم نیند میں جاگ اٹھے ہو۔ نیند میں چل رہے ہو۔

نیند میں بول چال رہے ہو۔ نیند میں اوڑھتے پہنتے اور نیند میں کھاتے پیتے ہو۔

تمہاری اس بدحالی اور آسیبی کیفیت سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمہیں ایک طوفان نوح کی ضرورت ہے۔ جو ایک ہی دفعہ تمہاری زندگی کا سارا نظام درہم برہم کردے۔ اس طرح کہ اس کا نشان بھی باقی نہ رہے۔ اور پھر جو صالح لوگ بچ جائیں کیونکہ قدرت ہر طوفانِ نوح سے پہلے ان کے زندہ رہنے کے اسباب پیدا کر دیا کرتی ہے۔ ان سے ارض موعود پر از سر نو زندگی کا نمو شروع ہو۔ اور نظام قدرت کا وہ توازن جس کو تم نے تباہ کر دیا ہے پھر اس ارض موعود پر ایک دفعہ قائم ہو جائے۔

اور سنو — !

تمہارا بگڑا ہوا توازن میرا توازن نہیں بگاڑ سکتا۔ میں ایک مضبوط چٹان کی طرح وہیں ہوں جہاں تھا۔ میں اس قد آور جسیم سایہ دار درخت کی طرح ہوں جس کے سائے راہی بھی اور راہزن بھی آکے دم لیتے ہیں۔ بھوکے، پیاسے، تھکے ہارے، ہنستے روتے، لوٹ کھسوٹ کر، لڑتے جھگڑتے ایک دو ساعت ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میں زندگی کے لق و دق صحرا میں کھڑا جھومتا ہوں۔ طوفان کی بجلیاں میرے سر پر کوندتی ہیں۔ بادل جھومتے ہیں، برستے ہیں گزر جاتے ہیں۔ آندھیاں آتی ہیں اتر جاتی ہیں آفتاب کی گرم شعاعیں اور مہتاب کی ٹھنڈی روشنی مجھ سے لپٹتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے میں جس مرکز پر جم گیا ہوں۔ ہمیشہ اس مرکز پر جما رہوں گا۔ تم آنکھیں بند کئے جن غلط راستوں پر بھاگ رہے ہو بھاگتے چلے جاؤ۔ تم سمجھتے ہو یہی نجات کا راستہ ہے۔ یہی آزادی و خوشحالی کا راستہ ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکر کھا رہے ہو۔ گر جاتے ہو۔ اٹھتے ہو اور پھر بھاگنے لگتے ہو۔ ایسے ہی حادث کا نام مقدر ہے۔ قسمت اس کو کہتے ہیں۔ یہ تم کہتے ہو۔ مشرق کی طرف منہ کرکے بھاگے اور مغرب میں پہنچ گئے۔ آسمان کی طرف پرواز کرنا چاہا۔ لیکن زمین میں دھنستے چلے گئے۔ یہی تمہاری تقدیر ہے۔ اور تم تقدیر کے کھلونے۔ تم اپنے نفس کے کھلونے ہو۔ تم میرے کھلونے نہیں۔ تم میرے جذبات کو اب تک نہیں سمجھ سکے۔ میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ سمندر کیا ہے اگر اس میں موجیں نہ ہوں۔ آگ کیا ہے جس میں شعلے نہ ہوں۔ سمندر کی عزت اس کی موجوں سے اور آگ کا وقار اس کے شعلوں سے قائم ہے۔ خشک فلسفی اور بے مغز حکیم سمندر کے سوکھے ہوئے جھاگ اور لکڑی کے جلے ہوئے کوئلے ہیں۔ اگر وہ جذبات سے محروم ہیں۔ ماں اور باپ جذبات سے خالی ہوں تو اولاد کیوں کر پرورش پائے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے

متعلق جذبۂ شوق سے عاری ہوں تو یہ آبادی ویرانہ ہو جائے۔ مگر آگ اور سمندر کی طاقت کا مبالغہ بھی تباہی لاتا ہے۔ طوفان حد سے گزر جائے اور آگ قابو سے باہر ہو جائے تو پھر دنیا میں قیامت آجاتی ہے۔ اعتدال سے گزر کر تریاق بھی زہر ہو سکتا ہے۔ تم مسجد سے منسوب اپنے جذبات کے ظاہر کرنے میں جو مبالغہ کرتے ہو۔ اس سے میں نے کبھی دھوکا نہیں کھایا۔ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے جذبات کی شدت نے مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی متاثر کیا ہے تو اس وہم کو دل سے نکال دو۔ میں تمہارے جذبات سے دھوکا تو کھا سکتا ہوں مرعوب نہیں ہو سکتا۔

تم نے یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا تھا۔ اس ملک کی نیو ہی مذہب پر رکھی گئی ہے۔ جب کہ مذہب معاشرتی نفسیات کا ایک عظیم شعبہ ہے۔ اور تم نے اس عظیم شعبہ کا اب تک جس قدر مذاق اڑایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے مذہب کو بنیادی ضروریات سے متعلقہ مختلف چیزوں میں مشتمل کر لیا ہے۔ جنہیں تم ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے ہو۔ تیز بارش اور چلچلاتی دھوپ میں تم اس سے چھتری کا کام لیتے ہو۔ یہ چھتری تمہیں سن سٹروک سے بچاتی ہے۔ بارش میں تمہارے عمامہ اور قبا کو بھیگنے نہیں دیتی۔ بازار کے کتوں کو ڈرانے کے لئے تم اسے لاٹھی کے طور پر استعمال کرتے ہو۔ یہ لاٹھی یہ چھتری اگر ضرورت نہ ہو تو گھر کے کسی کونے میں پڑی رہتی ہے۔ اور پھر ایسا بھی ہے کہ ہر شخص کو اس کو استعمال کرنے کا حق نہیں۔ مذہب کے ٹھیکیدار اور اجارہ دار ہی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کی شریعت کے مسائل بھی چھتری کی طرح پھیلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اور لاٹھی کی طرح اندھا دھند برسنے لگتے ہیں۔ ان کی شریعت کے مسائل اس سے لاٹھی چارج بھی کر سکتے ہیں۔ ضرورت کے وقت شرعی مسائل موم کی ناک بھی بن سکتے ہیں۔ جدھر جی چاہے موڑے جا سکتے ہیں۔ ان کی تاویل و توجیہہ بالکل اسی طرح کی جا سکتی ہے۔ جس طرح وکلاء قانون میں بال کی کھال اتارتے ہیں۔ جب شریعت کا کوئی حکم حالات اور خواہشات کے مطابق نہ ہو تو اسے مطابق کرنے کے لئے توڑ مروڑ کر اس کی صورت بھی بگاڑی جا سکتی ہے۔ اس کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی ذاتی مفاد، کوئی غرض، کوئی ضرورت، کوئی مقصد پورا کرنا ہو تو کسی نہ کسی طرح کتاب میں کوئی مفید مطلب روایت و رعایت بھی نکل آتی ہے۔ اور کبھ

دیا جاتا ہے کہ یوں بھی لکھا ہے۔ کاغذ کے پھول اصلی پھول بن جاتے ہیں۔ اور بے حد آرٹسٹک نظر آتے ہیں۔ بات اپنی غرض وغایت کی ہے۔ وہ روک دیں تو حرام ہے۔ وہ حکم دیں تو حلال ہے۔ کچھ زعمائے دین ایسے بھی ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں شریعت کی ڈوری ربڑ کی طرح بڑھتی اور سکڑتی ہے۔ منہ کے جھاگ اور گلے کی پھولی ہوئی رگوں کے ساتھ جب "ملعون و مردود" کی کڑک سے مدرسہ اور مسجد کی محرابیں گونجتی ہیں۔ جب منبر اور مصلے پر بیٹھ کر خدا کی مخلوق کافر اور ملحد بنائی جاتی ہے۔ جب دنیا کو صغیرہ اور کبیرہ کے متعلق احکام سنائے جاتے ہیں اس وقت ان کو اپنے صغیرہ اور کبیرہ کا ذرا خیال نہیں آتا۔

اور پھر جب مذہب کو سیاست کی بساط کا بادشاہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے تو قوت و اقتدار قہر و غلبہ، قتل و غارت اور فتنہ و فساد کی ایسی ایسی خونچکاں حکایتیں جنم لیتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اس بادشاہ پر شہ پڑ سکتی ہے۔ زوچ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر قتل نہیں کیا جا سکتا جب کہ اس کے نام پر دوسروں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ اس کو بساط سے نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اور سب مہرے اٹھائے جا سکتے ہیں۔ وہ شاہانہ قوت و عظمت کے ساتھ ہر بازی کو فتح کرتا ہے، کبھی سیاسی گٹھ جوڑ سے، کبھی دولت کے بل بوتے پر، کبھی قہر و غلبہ کی تلوار سے۔ کبھی مذہب کے پردے میں۔ اور اگر ضرورت سمجھتا ہے تو اپنی شکست کو بھی مذہب کے سہارے فتح بنا لیتا ہے۔ ایسے سیاسی مذہب نے اب تک کیا کچھ نہیں کیا۔ زندگی کی فروعات بھی مذہب کے اندر داخل کر لی گئی ہیں۔ تاکہ تمہارے فہم و ارادے کی گردن میں ایسا پھندا پڑا رہے کہ تم فرعون کے غلاموں کی طرح عمر بھر پتھر ڈھوتے رہو۔ اور کوڑوں سے پٹتے رہو۔ اگر دہنے نتھنے کی بجائے بائیں نتھنے سے سانس لوگے تو اس کی سزا ۵۰ ہزار برس تک جہنم کا عذاب ہوگا۔ اگر دہنے پاؤں کی بجائے بایاں پاؤں اٹھاؤگے تو ۸۰ ہزار برس تک دوزخ کی آگ پر جلنا ہوگا۔ اگر پانی ناک پکڑ کر پیوگے تو عاقبت میں اکتیس تازیانے تمہاری پشت پر پڑیں گے۔ لہٰذا پاؤں اٹھاؤ تو یوں اٹھاؤ۔ ناک سنکو تو یوں سنکو۔ پانی پیو تو یوں پیو۔ لقمہ منہ میں رکھو تو یوں رکھو۔ غرضیکہ تمہاری ہر سانس کے ساتھ قانون کی ایک دفعہ ایک ضابطہ موجود ہے۔ جرم اور پاداش جرم کی تمام تفصیلات کے ساتھ ان مذہبی عدالتوں میں جہاں پاجاموں کی لمبائی۔ داڑھیوں کا پھیلاؤ اور مونچھوں کی تراش خراش ناپی تولی جاتی ہے تمہارا ذہن میدان عمل میں ہر طرف

محدود ہے۔ اور تمہاری شخصیت مفلوج۔ تمہاری ہر حرکت، ہر جنبش، ہر فعل، ہر اقدام مذہبی اجارہ داروں کی مرضی پر منحصر ہے جو تم کو مذہب کے نام پر ورغلاتے، پھسلاتے اور بہکاتے ہیں اور گھیر گھار کر حقیقی مذہب ہی کے خلاف لے جاتے ہیں۔

تمہاری قوت ارادی معطل ہو چکی ہے۔ مذہب کے ستھرے ستھرے اصول فروعات دنیا میں الجھ کر رہ گئے ہو۔ غضب تو یہ ہے کہ اصول دیں توڑ جاتے ہیں اور فروع دیں کی پیروی و پابندی پر نجات کا انحصار سمجھا جاتا ہے۔ پھر اگر اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے تو حکم نظر بندی۔ جیسے جابر حکومتیں اپنے مظلوموں کی آواز بند رکھنے کے لئے نظر بندی، زباں بندی، تالہ بندی یعنی قید کی ہزاروں صورتیں پیدا کر لیتی ہے۔ تاکہ مظلوموں کی آواز قید خانے کی دیواروں سے باہر نہ جا سکے۔ تمہاری تمام ذہنی تربیت یہی ہے کہ ہر کام خوف، دھمکی اور دھاندلی سے انجام دیا جائے۔ تمہارے مذہب کا سب سے بڑا عنصر خوف ہے۔ کیا میں اس مذہب کے نام پر معرض وجود میں آیا تھا۔

کیا اس مثالی انسان کی انتھک جدّوجہد نے مجھے اس لئے دنیا کے نقشے پر ابھارا تھا کہ تم اس کے مرنے کے بعد ہی نہیں اس کی زندگی ہی میں اس مذہب کے شرعی خدّوخال بدل کر رکھ دو جس کی بنیاد پر میری عمارت اٹھائی گئی تھی؟ کیا پاکستان میں دین الہیہ کا تخیل وہی ہے جو مولانا و مرشد تمہیں سمجھاتے ہیں؟

تم ضمیر کی پھانسی پر چڑھی ہوئی مخلوق ہو۔ میں نے تمہاری ذہنی و فکری تحریکوں کے محرکات کے تار پود میں بے شمار سمتوں کو نہ صرف جھانکا بلکہ ان کو ٹٹول کر اور کرید کر دیکھا ہے۔ ان میں ایک سمت یعنی حال سے مستقبل موجود نہیں۔

تم نیکروفیلزم کا شکار ہو گئے ہو۔ یہ وہ ننگ انسانیت علت و جبلت ہے۔ جس میں انسان مردہ جسموں سے جنسی فعل کرتا ہے۔ اپنے ضمیر کی ہولناک قبروں میں جھانک کر دیکھو کیا تم اپنی مردہ قوم کے ساتھ اس مذموم فعل کے مرتکب نہیں ہو رہے؟

اور پھر کیا تم مرتکب فحش نہیں ہو؟

کیا یہ تمہاری بہو بیٹیاں ہیں۔ اسلام کی بہو بیٹیاں ہیں۔ پاکستان کی بہو بیٹیاں ہیں جو نیون سائن کی طرح سڑکوں پر جلتی بجھتی نظر آتی ہیں۔ جو تمہارے کلچر کی ڈونلٹن مارکیٹ میں لٹکتے ہوئے بیف اور

بیکن کے سونا چاندی اور میکس فیکٹر کے ورقوں سے سجائے ہوئے وہ لوتھڑے ہیں۔ جنہیں تر و تازہ اور پروٹین (لحمیات) سے بھرپور سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ خریدا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں — یہ کنواریاں — اس ملک کے مستقبل کی مائیں۔ تمہارے کلچر کی الٹرا ماڈرن قلو پطرائیں کیا تمہارے کلچر کا بلیو پرنٹ نہیں؟ اور پھر تمہارے ملک کی بل گم کھا کر چٹاخ پٹاخ بلبلے بنا کر توڑتی پھوڑتی ہپی حسینائیں کیا بذات خود بل گم معلوم نہیں ہوتیں؟

کیا ان کی ہر بات، ہر حرکت، ہر جنبش، ہر ادا ایک جدید ترین ڈرامائی اظہار نہیں؟

کیا ان کو کسی ٹکنی کلر مووی کا ایک ( ) نہیں کہا جا سکتا جو اپنی نوعیت اور فنی تکنیک کے اعتبار سے فن تمثیل میں ایک اہم اور چونکا دینے والا تجربہ ہے۔

کیا تمہاری تہذیب فش ایکوریم ہے جس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی ہیں؟

کیا یہ تمہارے معاشرے کے ڈرائینگ روم کے قسم کے ڈیکوریشن پیسیز ہیں۔

کیا یہ اسلامی ماحول کے خلاف ایک شدید ردّ عمل نہیں؟ کیا تم نے اپنی آئندہ زندگی کا یہی پیٹرن بنایا ہے؟

کیا یہ لڑکی نما لڑکے تمہاری قوم کے سرفروش اور کفن بردوش مجاہد ہیں جنہیں دیکھ کر، ہجڑے بھی شرما جاتے ہیں۔ جن کی کرداریت اور ہیرا منڈی کے بھڑووں اور دلالوں کی کرداریت میں رتی بھر فرق نہیں۔ آسیب زدہ ننگی رات کے ننگے مرد اور ننگی عورتیں۔ !!

سب سے مشکل فن جینے کا فن ہے۔ لیکن تمہیں اس سے کیا تم تو ایک ایسی قوم ہو جس پر سکوت موت طاری ہے۔ !

تم نے شاید پاکستان کو بھی ایک ہپی گرل سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ شادی کی تھی۔ اس کو ہندوستان کی آگ اور خون سے کھیلتی والپرگس رات میں بیاہ کر لائے تھے اور جب تم اس کا سب کچھ لوٹ چکے اس کے ساتھ کشیدگی پر اتر آئے ہو۔ اور یہ کشیدگی بتاتی ہے کہ تم اسے طلاق دینا چاہتے ہو اور طلاق بہر حال قسطوں میں واقع ہو رہی ہے۔

روشنیوں کے جیتے جاگتے شہر پر اپنی بداعمالیوں سے، اپنے خبث باطن سے آسیب زدہ رات مسلط کرنے والو — یاد رکھو۔ اس دنیا میں داخل ہونے کا ایک ہی مہذب ادارہ ہے۔ اور جو لوگ تہذیب کے خلاف کسی چور دروازے سے آتے ہیں وہ معاشرے کا ایک کبھی نہ مندمل ہونے والا زخم

بن کر رہ جاتے ہیں۔

یاد رکھو۔!

کوئی انسانی ادارہ جس نے قہر و غلبہ یا معاشی دباؤ سے کام لے کر اقتدار حاصل کیا ہو کبھی فساد سے محفوظ نہیں رہے گا۔ لیکن تم ابھی اس نقطے کو نہیں سمجھ سکتے اور اس لئے نہیں سمجھ سکتے کہ تم نے وہ لمحے نہیں دیکھے جب پوری کائنات سمٹ کر ایک نقطہ بن جاتی ہے اور نقطے کی وسعتوں میں پوری کائنات سمانے لگتی ہے تم نہ سمٹ رہے ہو اور نہ پھیل رہے ہو۔ تم بالکل سپاٹ پڑے ہو۔

میں پوچھتا ہوں تمہارے وہ اہل قلم، وہ نقاد، وہ وقائع نگار۔ وہ صحافی کہاں ہیں جو انسانوں کے خون میں قلم ڈبوتے ہیں اور پھر اسے وحی و الہام سے موسوم کرتے ہیں۔

جو خود دھواں دھواں ہو رہے ہیں اور اپنا چرچا یہ کرتے ہیں وہ زندگی نویسی کرتے ہیں۔ زندگی نویس ہیں۔ شعلہ نویسی کرتے ہیں۔ وہ شعلہ نویس ہیں۔ جو عظیم الشان ادبی و صحافتی سیمناروں جلسوں اور محفلوں میں یہ کہتے ہیں۔

از شعلہ تراشں کردہ ام حرف

کیا ہوا ان سریع القلم۔ کثیر التصانیف جامع تریں احسن الکلام عالموں و فاضلوں کو کیا ہوا۔ جن کے مسیحا نفس قلموں کے لمس سے مردے زندہ ہو جاتے ہیں۔ سکرات موت میں اکھڑے اکھڑے سانس لیتی قوم کی مسیحائی کیوں نہیں کرتے۔ انکے قلم کے اعجاز و کرشمہ کو کیا ہوا؟

پاکستان اور پاکستانیوں کے ساتھ ان کی ہمدردیاں۔ ان کا خلوص، ان کا جذبۂ ایثار و قربانی ان ادبی و ثقافتی اداروں کی قابل آسامیوں و منفعت کرسیوں تک ہی محدود ہے جن پر وہ بڑی شان سے متمکن ہیں۔ بڑے مزے میں ہیں اور روشنیوں کے شہر پر مسلط آسیب زدہ رات کے اندھیرے میں ماضی کی یادوں کے جگنو پکڑنے میں محو ہیں۔

جس ادب میں سیاست کے مقبرے تعمیر کر دیئے جائیں وہ ادب زندہ نہیں رہتا۔ وہ ادب مر جاتا ہے۔ لیکن یہ اس آسیبی عہد کا المیہ ہے کہ اس ملک میں ادب کو سیاست کا مقبرہ بنا دیا گیا ہے۔ اور اس سیاست کا نام ہے نجی سیاست۔ ذاتی سیاست، شخصی سیاست۔

جو اس سیاست کے امام ہیں دراصل لٹیرے ہیں۔ ادبی بکیلے ہیں۔ ادبی سمگلر ہیں۔ وہ علم و ادب کے نام پر اس ملک کی دولت پر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ اور یہی چاہتے ہیں کہ علم و ادب کی شاہراہوں پر استحصال کا یہ روٹ پرمٹ انہی کے پاس رہے۔ انہوں نے ملک و قوم کے مخلص قلمکاروں اور دانشوروں کو بہتی گنگا سے دور رکھنے کے لئے بڑی بڑی خندقیں، بڑے مورچے اور بنکر تیار کئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی حفاظت کے لئے کرائے کے سپاہی بھی چپے چپے پر بٹھا دیئے ہیں کہ ان کے علاوہ اگر کوئی قلمکار ادھر نظر آئے تو اپنی ٹامی گنوں اور سٹین گنوں کا پورا میگزین اس پر ختم کر دو۔ اس ملک کے کئی مخلص و ممتاز قلمکار سیاست دان ادیبوں کی سولیوں پر کھچ کر دم توڑ چکے ہیں۔ کتنے ہی فنکار انہوں نے تہہ و تیغ کئے ہیں۔ کتنے ہی زندگی نویسوں اور شعلہ نویسوں کو جو حقیقت زندگی میں شعلہ نویس تھے۔ دھوئیں کی ان دیواروں نے ابھرنے نہیں دیا۔ اس دور میں جب کہ ہر طرح کے استحصال کا محاسبہ ہو رہا ہے اس قلمی استحصال کا بھی محاسبہ ہو گا۔ ادب کی دنیا میں جنہوں نے دوسروں کو سانس تک نہیں لینے دیا۔ جب کہ فن کسی کی میراث نہیں اور نہ جدّی ورثہ ہے۔ کہ ایک ادیب شہیر صاحب کی ولادت کے بعد اور کوئی ادیب اس ملک میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔

میں نے ذاتی سیاست کے ماہران قلمکاروں کے افکار و خیالات پڑھے ہیں۔ سنے ہیں۔ لیکن ان کا ادب ان کا فن ابھی تک پاکستان کے علم و ادب میں کوئی اقبال، کوئی نذرالاسلام کوئی حالی، کوئی حسرت موہانی، کوئی مولانا ظفر علی خاں پیدا نہیں کر سکا۔ اس کے متوازی سیاست کے ماہر دانشوروں نے بنگلے اور بنک بیلنس ضرور بنائے ہیں۔ جن کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی علمی و ادبی لوٹ کھسوٹ، بلیک مارکیٹنگ اور سمگلنگ نظر آئے گی۔ ہزاروں غیر ملکی فلمی کہانیاں تک سمگل ہو کر یہاں چربہ ہو چکی ہیں۔ اور اپنے اس بین الاقوامی جرم کو چھپانے کے لئے چربہ سازوں نے کروڑوں روپے کمانے کیلئے ہزاروں روپے صاحب لوگوں کی ڈالیوں میں صرف کر دیئے ہیں۔ عورت اور شراب کا چکر چلا کر باقی چکر بند کر دیئے۔ ان کی چکر بازی کے بند دروازے رات کے اندھیرے ہی میں کھلتے ہیں۔ یہ جس سماج میں رہتے ہیں خود غرضی اس کا دستور ہے اور حق تلفی اس کا رواج۔ لیکن تم بھی میرے محاسبے سے بچ نہ سکو گے۔

یکدم عریاں ہو کر تم کو اپنے سامنے آتا ہو گا۔ تمہاری شخصیت پر ماہناموں، جریدوں اور ادبی پرچوں کے ہزار ہزار صفحے پر پھیلے ہوئے شخصیت نمبر تمہاری وکالت نہ کر سکیں گے۔ جن کی اپنی کوئی شخصیت نہیں شخصیت نگاری کو کیا جانیں۔ تم نے آج تک اس کی شخصیت کو نہیں سمجھا۔ جس نے تمہیں ایک ملک سے کر دیا۔ تمہیں آزادی سے روشناس کرایا۔ تمہیں زندہ قوموں میں زندہ رہنے کے گر بتائے۔

اور تم بتاؤ تم نے ملک و قوم کو اپنی تحریروں میں، شہ پاروں میں، شہکاروں میں زندہ رہنے کے کن قرینوں سے روشناس کرایا ہے۔ تمہاری وہ کونسی تحریر ہے جسے صحیفہ آزادی کہا جائے۔ تمہارا وہ کونسا شاہکار ہے جس میں تم نے اس ملک کی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے فکر و نظر کے نئے راستے کھول دیئے ہیں تمہاری وہ کونسی تصنیف ہے جس میں تم نے ملک و ملت تعمیر و ترقی کے لئے اس آسیب زدہ رات کے اندھیروں میں اپنے لہو کے چراغ جلائے ہوں۔

تم نے اس ملک میں بڑھتے ہوئے جرائم، ملاوٹ، رشوت ستانی، حب الوطنی کے متعلق کیا کچھ لکھا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے وہ کہاں تک اس قابل ہے کہ اسے میں تمہارا عطا کیا ہوا ایک اعزازی تمغہ سمجھ کر اپنے سینے سے آویزاں کر لوں۔

تم نے ملک کو خود کفیل بنانے کے لئے اور اس کے معاشی معیار کو بلند کرنے کے لئے اس کی پیداوار بڑھانے پر کہاں تک غور کیا ہے۔ جب کہ اپنی کوٹھی میں کم سے کم دو فرج، دو ٹیلیویژن سیٹ، دو عالیشان قالین، دو مزید ریڈیو، دو نیو ماڈل کاریں اور مزید دو خوبصورت الٹرا ماڈرن لڑکیوں سے شادی کرنے کے متعلق تو تم نے اکثر بڑا ہی سوچا ہے۔ اور اکثر اس قدر سوچتے ہو اور سٹرانگ کافی پیتے ہو۔ کافی پیتے ہو اور لگاتار اسقدر سوچتے ہو کہ رات کو سونے کے لئے تمہیں نیند آور گولیاں کھانا پڑتی ہیں۔ اور یاد رکھو اگر تم اس شدت رفتار کے سوچتے رہے تو شائد یہی گولیاں کسی دن مقدار سے زیادہ کھا کر تم خودکشی کر دگے۔

اپنی کسی ایسی تقریر کا حوالہ دو۔ جو تمہاری ملی زندگی کے حقائق کے واضح شعور اور اس پر تمہارے فکر و فن کی کامل گرفت کی علامت ہو۔ تمہاری لکھی ہوئی ایسی کوئی کہانی جس میں تم نے اس ملک کے لوگوں کو انتہائی ندرت و رفعت کے ساتھ صحت مند فکر و خیال کے انقلاب سے آشنا کیا ہو۔ جس کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جاسکے کہ تم زندگی کو دیکھنے، پرکھنے اور برتنے کا ایک منفرد زاویہ نگاہ رکھتے ہو۔ جس کے مطالعے

بعد یہ تسلیم کرنا پڑے کہ تم پاکستان اور پاکستانیوں کی فکری اور تہذیبی تونگری کا مظہر ہو اور تمہاری بصیرت اور نقش گری نے عہد آفریں کردار انجام دیا ہے۔ اور تمہاری تخلیقات اس ملک و قوم کا قابلِ فخر ادبی اور تہذیبی ورثہ ہے۔ تمہارا مطالعہ قائدِ اعظم کا مطالعہ ہے۔ پاکستان کا مطالعہ ہے۔ پاکستان کے ہر انسان کا مطالعہ ہے۔

کیا تم نے پاکستان کی وحدت کو ٹکڑے کرنے والوں کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہے۔ صوبائی و طبقاتی تعصب کی بیخ کنی کرنے کے لئے کوئی ملک گیر نہ سہی صوبائی حدود تک محدود کوئی تحریک چلائی ہے اور اس میں اپنے مخالفین سے مار کھائی ہے۔ زخمی ہو کر کسی ہسپتال میں گئے ہو۔ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر وطن کی خاطر، وطن کے ہر ذرّے کی خاطر، وطن کے ہر انسان کی خاطر بوتل دو بوتل نہ سہی اپنا کبھی آدھ پاؤ خون بھی کسی بلڈ بنک کو دیا ہے خون پینے والی ادبی جونکوں؟

کبھی گراں فروشوں، بلیکیوں اور سمگلروں کی مذمت کرتے ہوئے تمہاری اتنی ٹپائی ہوئی ہو کہ تمہاری جان کے لالے پڑ گئے ہوں۔ ملک میں آمریت کا خاتمہ کرنے کے لئے سمر قند سے اسلام آباد تک تم کبھی خون کے آنسو روتے ہوئے آئے ہو۔ آمریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے پولیس کی لاٹھیاں پیٹھ پر کھا کر کہیں بیہوش ہوئے ہو۔ اگر نہیں تو ایک طرف ہٹ جاؤ۔ تم اس ملک کے ادب کے قائد نہیں ہو سکتے۔ قائد کیا تمہیں اس کا رضا کار بھی نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ زندہ ادب وہی ہے جو اپنے عہد کے ملکی و ملی تقاضوں سے پیدا ہو۔ جو اس عہد کے انسانوں کی فکری و نظری سمتوں کی عکاسی کرے۔ جو ان کے جذبات و تاثرات کا ترجمان ہو۔ چھوڑ دو ان ادبی و ثقافتی اداروں کی کرسیوں کو یہاں ان کو آنے دو جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ جن کے پاس کہنے کو کچھ ہے، جو کچھ کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ تمہارے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں۔ تم اب تک کچھ نہیں کہہ سکے۔ جو کچھ کہہ چکے ہو کچھ نہ کہہ سکنے کے برابر ہے۔ تم نے اب تک کچھ بھی نہیں کر کے دکھایا اس لئے کہ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تم صرف سٹرونگ کافی اور سگریٹ پی سکتے ہیں۔ لیکن ملکی و ملی تعمیر و ترقی کی تگ و دو میں ان کی ضرورت ہے جو اپنا خونِ جگر پیتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ تم نے روشنیوں کے شہر پر آسیبِ شب کے اندھیروں کو مسلط کیا ہوا ہے نئے اجالے نئے سویرے کا آغاز ہو چکا ہے۔ عوامی دور، عوامی انقلاب ان اندھیروں کے چھٹ جانے کی علامت ہے۔ جب کہ تم ایک خواب میں جاگ اٹھے ہو۔ نیند میں چل رہے ہو۔

نیند میں بول چال رہے ہو۔ نیند میں اوڑھتے پہنتے اور نیند میں کھاتے پیتے ہو۔ یہ بھی ایک بیماری ہے۔ یہ بھی ایک عارضہ ہے۔ جس کا کوئی نام نہیں۔ اور اگر کوئی نام ہو سکتا ہے تو وہ "آسیب شب" ہی ہو سکتا ہے۔

پتے ہوا دینے لگے

تم اپنی اغراض مقاصد کی شطرنج کا ایک مہرہ ہو اور خود غرضی کی بساط پر ایک دوسرے کو پیٹ کر آگے بڑھنا چاہتے ہو۔ تمہارے معاشی مسائل نے تمہیں ایسا فتور پیدا کر دیا ہے کہ تم نے معاشی مسائل کی تلوار ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے۔ اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہوئے معاشی قتل عام کر رہے ہیں۔ تم نے معاشیات کو انسانیات کے مجموعے سے نکال کر الگ کر لیا ہے اور اسی کو عین انسانیت قرار دے کر سارے مسائل زندگی اس سے حل کرنے کی ٹھان بیٹھے ہو۔ حالانکہ اصل حقیقت جو کچھ ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم سب ایک کُل کے مختلف جزو ہو۔ اس کُل کے اندر تمہارا سب کا ایک خاص مقام ہے اور اس مقام کے لحاظ سے ہی تمہاری اپنی اپنی اہمیت ہے۔ ہر انسان ایک جسم رکھتا ہے جو قوانین طبعی کے ماتحت ہے۔ اس لحاظ سے انسان طبیعات کا موضوع بھی ہے۔ مگر وہ نرا جسم ہی نہیں ہے کہ صرف طبیعات سے اس کے سارے مسائل حل کئے جا سکیں۔ دل اشرف الاعضا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف دل کا نام ہی انسان ہے۔ انسان ایک ذی حیات ہستی ہے اس اعتبار سے وہ علم الحیات کا موضوع بھی ہے۔ مگر وہ فقط ذی حیات ہی نہیں کہ صرف حیاتیات و حیوانیات ہی سے اس کی زندگی کا پورا قانون اخذ کیا جا سکے گا۔ انسان انسان ہے اس لئے علم الحیات اس کی حیات کا ایک اہم شعبہ ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ انسان علم الحیات کا بٹن دبا کر بیٹھا رہے اور حیات سے متعلقہ دیگر علوم کو چھٹی دے دے۔ یہ درست ہے کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے روٹی، کپڑے اور مکان کی ضرورت ہے یہ چیزیں اس کی بنیادی ضروریات میں سے ہیں۔ اس لحاظ سے معاشیات اس کی زندگی کے ایک اہم شعبہ پر حاوی ہے مگر وہ محض کھانے پینے، پہننے اور گھر بنا کر رہنے والا حیوان ہی نہیں ہے کہ فقط معاشیات پر اس کے فلسفہ حیات کی بنیاد رکھ دی جائے۔ انسان اپنی نوع کو باقی رکھنے کے لئے تناسل پر بھی مجبور ہے

جس کے لئے اس کے اندر ایک زبردست منفی میلان پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے صنفیات کا علم بھی انسان کی زندگی کے ایک اہم پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر انسان بالکل نسل کشی کا آلہ بھی نہیں ہے۔

تمہارا اصل معاشی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تمدن کی ترقی کو کس طرح روکا جائے یا اس کے قدرتی مظاہر کو کس طرح بدلا جائے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمدن کے نشو و نما کی فطری رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی ظلم و بے انصافی کو کیسے روکا جائے۔ اور فطرت کا یہ منشا کہ ہر مخلوق کو اس کا رزق پہنچے کیوں کر پورا کیا جائے۔

نظام معیشت میں خرابی خودغرضی کے حد اعتدال سے بڑھ جانے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ اور فاسد نظام سیاست سے بھی یہ خرابی بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ جب تم فطری اسباب سے بہتر معاشی حیثیت کے حامل ہوئے تم خودغرضی، تنگ نظری، بداندیشی، بخل، حرص، بددیانتی اور نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ تمہاری ذاتی ضرورت سے زیادہ جو وسائل معیشت تمہیں میسر آئے۔ جن پر تمہیں مالکانہ حقوق حاصل ہوئے ان کو تم نہ صرف اپنی آسائش و آرائش، تفریح و تفنن اور خوش باشی پر صرف کر رہے ہو بلکہ ان کو مزید وسائل معیشت پر قبضہ کرنے کے لئے بھی استعمال کر رہے ہو۔ تاکہ بن پڑے تو ان کے ذریعے انسانوں کے خدا اور ان داتا بن جاؤ۔

تم نے قوم کے ان افراد کا حق ماننے سے انکار کر دیا جو دولت کی تقسیم میں حصہ پانے سے محروم رہ گئے یا محروم کر دیئے گئے یا جنہوں نے اپنی اصلی ضرورت سے کم حصہ پایا۔ تمہاری خودغرضی تنگ نظری، بداندیشی، بددیانتی اور نفس پرستی نے اس استحصال کو جائز سمجھا جس سے قوم کے بہت سے افراد جرائم پیشہ بن گئے۔ جہالت و گمراہی میں مبتلا ہو گئے جسمانی کمزوری اور امراض کا نشانہ بنے۔ ان کی ذہنی و جسمانی قوتیں اور صلاحیتیں مناسب نشو و نما نہ پاسکنے کیوجہ سے مفلوج ہو گئیں۔ اور روشنیوں کے شہر کی تہذیب و تمدن کے ارتقا میں وہ کردار ادا نہ کر سکیں۔ جو کہ انہوں نے ادا کرنا تھا۔ ان کا استحصال کرتے ہوئے تم نے یہ نہ سوچا کہ استحصال کرنے سے معاشرہ بحیثیت مجموعی متاثر ہوگا اور نقصان اٹھائے گا۔ کیونکہ جن کا استحصال کیا جاتا ہے وہ بھی معاشرے کا جزو ہوتے ہیں۔

تمہارے پاس دولت کیا آئی ایک قیامت آگئی۔ تم نے اپنی اصلی ضروریات میں مزید

بے شمار ضروریات کا اضافہ کیا ہے اور بہت سے انسانوں کو جن کی قابلیتیں معاشرے کی بہتر خدمات کے لئے استعمال ہو سکتی تھیں تم نے اپنی غیر ضروری ضروریات کو پورا کرنے میں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ اس طرح تم نے معاشرے کے ایک بہت بڑے حصے کو اخلاقی، روحانی اور جسمانی تباہی میں مبتلا ہونے کے لئے چھوڑ دیا۔ تم نے ان کو تعمیری کاموں سے ہٹا کر تخریبی کاموں میں لگا دیا۔ اور اس طرح ایک نتھرے ستھرے معاشرے کو فاسد بنایا اور اس میں فتنہ و فساد کی راہیں کھول دیں۔

تم نے انسانی سرمایا کو ضائع کرنے کے ساتھ ساتھ مادی سرمایہ کا بھی غلط استعمال کیا۔ تم نے بہت سا مادی سرمایہ اپنے محلوں، کوٹھیوں، سیر گاہوں، تفریح گاہوں اور اپنی عشرت گاہوں پر صرف کر دیا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی اپنے لئے عالیشان مرقد اور ان پر مقبرے بنانے کے لئے ایکڑوں زمین، سامان تعمیر اور اس انسانی محنت و مشقت کا بھی نہایت بے دریغی سے زیاں کیا جن سے غریب عوام کے سر چھپانے کے لئے لاکھوں کھولیاں اور چھپرے کھپرے تیار ہو سکتے تھے۔

وہ کونسی چیز ہے جو تم نے دولت سے فراہم نہیں کی۔ زیورات و ملبوسات، آلات و ظروف، زینت و آرائش کا سامان، شاندار سواریاں، یہاں تک کہ تم نے اپنی کوٹھیوں کے دروازوں کو بھی قیمتی پردوں سے ڈھانپ کر ننگا نہ رہنے دیا لاکھوں انسانوں کا ننگا رہنا گوارا کر لیا

تم نے اپنے عیش و آرام کرنے کے کمرے ہزاروں روپوں کی تصویروں سے مزین کئے۔ اپنے پالتو کتوں کو مخمل کے گدیلوں پر بٹھایا اور ان کے گلے میں سونے کے پٹے ڈالے اس طرح وہ بہت سا مواد اور انسانی عمل جو ہزارہا بھوکے ننگے بے گھر انسانوں کا تن ڈھانپنے، پیٹ بھرنے اور سر چھپانے کے کام آسکتا تھا تمہاری شخصی نفس پرستی کے بھیانک دیوتا کی بھینٹ ہو گیا۔

اسلام میں دولت مقصد حیات نہیں وسیلۂ حیات ہے۔ اسلام میں لاکھوں انسانوں کے استحصال سے پیدا کردہ شخصی و انفرادی ملکیت کو سرے ہی سے جرم قرار دیا جاتا ہے۔

اسلام نے تقسیم زر کے ایسے جامع معاشی اصول مقرر کئے ہیں جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اور کوئی فرد ساری دولت نہیں سمیٹ سکتا۔

اسلام معاشی انصاف کا علمبردار ہے —!

اسلام معاشی مساوات کا نقیب ہے —!

اور صرف اسی نظام سے یہ مقصد حل ہو سکتا ہے۔ اسلامی معاشیات میں معاشی ترقیات یقیناً ضروری اور ناگزیر تو ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کا مقصد حقیقی نہیں ہیں۔ اسلام کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی راہگزر کے مرحلے ہیں اس کی اصلی منزل نہیں۔

اور یاد رکھو۔!

اسلامی دستور حیات میں کوئی کتر بیونت یا ناجائز سختی و نرمی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ اس دستور حیات میں ایسا ہرگز نہیں کہ انسان اپنی زیر تصرف چیزوں کے تصرف میں ان حدود و قیود سے تجاوز کر جائے جو اس پر دولت کے اصل مالک نے لگا رکھی ہے۔ جہاں وہ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے وہاں اسے خرچ کرنا ضروری ہے اور جس جگہ ہاتھ روکنے کا حکم دیتا ہے وہاں ہاتھ نہ روکنا اس کے حکم کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

قرآن کریم نے اشتراک دولت کا ایک مکمل، مربوط اور متوازن نظام پیش کیا ہے۔ یہ نظام انفرادیت اور اشتراکیت کے پراگندہ عناصر سے پاک اور ان کی خوبیوں کا جامع ہے سرمایہ پرستی کے نقصانات کو دور کرنے کے لئے اسلام نے تنبیہی اور ایجابی دونوں طریقے اختیار کئے ہیں۔ اوّل تو سرمایہ داری کبھی مضر حد تک نظام اسلامی میں پیدا ہی نہیں ہونے پاتی۔ پھر جو کچھ سرمایہ پیدا ہوتا ہے اس پر ایجابی حدود اور شرائط عائد کی گئیں تاکہ توازن دولت قائم رہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ہی کو دولت اور دولت کے ماخذوں کا حقیقی ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اور انسانوں کی ملکیّت ذاتی کی نفی کی گئی ہے۔ وہ دولت کے امین ٹھہرائے گئے ہیں۔ ہماری ملکیّت کے معنی تمتع کے حقوق ہیں۔ اسلامی دولت کو متاع کی حیثیت دی گئی ہے۔ متاع سے استفادہ کرنے پر حدود اور شرائط عائد کر دی گئی ہیں اور اسلامی حکومت قومی متاع کی نگران قرار پائی ہے۔ تاکہ معاشی توازن اور سماجی انصاف برقرار رہے۔ مذہبی پیشوائی کے روپ میں مال کے ناجائز حصول کو ممنوع قرار دیا گیا۔ رسول اکرمؐ نے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے زکوٰۃ و صدقات کو حرام قرار دے کر مذہبی اور اسلامی اصلاح کی تاریخ میں ایک انقلابی قدم اٹھایا۔

اسلام نے پیدائش زر اور تقسیم زر پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دیں۔ مثلاً سودی عناصر کو بیدخل کیا گیا۔ سود خور سرمایہ داروں کے خلاف ایک محاذ جنگ بنایا گیا۔ ذخیرہ اندوزی اور زراندوزی

کو روکا گیا۔ خاص خاص ذرائع دولت کو مفاد عامہ کی خاطر عام طور پر حکومت کی ملک قرار دیا گیا۔ تقسیم وراثت کا قانون نافذ کیا گیا تاکہ ہر نسل کی ساری دولت پوری قوم میں تقسیم ہو جائے۔

محفوظ اور ترقی پذیر سرمایہ پر سماجی تحفظ کا ٹیکس عائد ہوا یعنی زکوٰۃ۔ اس کے منکرین مدعیانِ اسلام کو دائرہ اسلام سے خارج کیا گیا اور ارتداد و بغاوت کا مجرم بنایا گیا۔ جن کے خلاف جہاد واجب ہوا۔

فقہِ اسلامی میں ادائے زکوٰۃ کے بعد مال و دولت میں غریبوں کا حق ختم نہیں ہوتا۔ ضرورت احتیاج باقی ہے تو یہ حق بھی باقی ہے۔ زر و مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی اہل حاجت کا حق باقی ہے۔ مال میں علاوہ زکوٰۃ کے بھی غریبوں کا حق ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے ایک اور دفعہ ہے کہ زکوٰۃ ہی نہیں بلکہ فتوحات سے حاصل شدہ زمین کے محاصل بھی غریبوں کی تکمیل احتیاجات کے لئے کافی نہ ہو تو ان کی تکمیل اغنیا پر لازم ہے۔

اس کی فقہی تشریح یہ ہے کہ بنیادی احتیاجات کیا ہیں۔ ایسی غذا جو ان کی زندگی اور ضروریات کے لئے ناگزیر ہے۔ ایسا لباس جو گرمی سردی میں صحت و قوت کو برقرار رکھے۔ ایسا مکان جو انہیں موسم کے طوفانی اور مضر اثرات سے محفوظ رکھے اور راہگیروں کی نظروں سے ان کی خلوت کی پردہ داری ہو سکے۔

بنیادی ضروریات ان ہی چند صورتوں پر منحصر نہیں ان کی مزید صورتیں بھی ہو سکتیں ہیں۔ یہ سب کچھ ملک کے ترقی پذیر شعور اور معیار زندگی کی تدریجی ترقی پر منحصر ہے۔ اور ضروریات کی تکمیل کے مفہوم میں انسان کی ساری حقیقی ضروریات داخل ہیں۔ قرآنی کلیات اور فقہی جزئیات پیش نظر ہوں تو قیام و طعام کی ضروریات کے علاوہ طبی و تعلیمی ضروریات کی تکمیل بھی ان میں شامل ہو جاتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں۔ کہ اغنیا کے مال میں اہل حاجت کا حق اس قدر فرض ہے کہ جو ان کی بنیادی ضروریات کو کافی ہو سکے۔ جب کوئی پیاسا ہو اور پیاس سے موت کا خوف پیدا ہو جائے تو اس پر فرض ہے کہ وہ جہاں کہیں اور جس کسی کے پاس پانی ہو چھین لے خواہ اسے اس کے لئے جنگ و جدل کی بھی ضرورت پیش آئے۔ اگر انقلاب کے بغیر ضروریات زندگی حاصل نہ ہو سکیں تو مضطر اور مجبور غریبوں کو کا حق ہے۔ اس مقاتلے اور مقابلے میں اگر مجبور غریب مارا جائے تو

حق کو روکنے والے سرمایہ داروں پر اس کا خوف عائد ہو گا۔ اور اگر ایسی کشمکش میں حق کو روکنے والا سرمایہ دار مارا جائے تو خدا کی لعنت میں گرفتار ہو گا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زکوٰۃ روکنے والے سرمایہ دار قبائل کے خلاف جہاد کیا۔ کیونکہ زکوٰۃ غربا کا حق ہے۔

اسلام نے تمام مسائل حیات میں اس قاعدے کو ملحوظ رکھا ہے کہ زندگی کے جو اصول فطری ہیں ان کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے اور فطرت کے راستے سے جہاں انحراف ہوا ہے وہاں سے اس کو موڑ کر فطرت کے راستے پر ڈال دیا جائے۔

اسلام خارجی طور پر نظام تمدن میں صرف چند ضابطوں پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اخلاق اور ذہنیت کی اصلاح پر بھی زور دیتا ہے تاکہ نفس انسانی میں خرابی کی جڑ کٹ جائے۔ اسلام حکومت کے جبر و قانون سے صرف وہیں کام لیتا ہے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ اس طرح اسلام زندگی کے معاشی شعبہ میں ان تمام غیر فطری طریقوں کو زیادہ سے زیادہ اخلاقی اصلاح اور کم سے کم حکومتی مداخلت کے ذریعے مٹاتا ہے۔ جو برائیوں کے اثر سے انسان نے اختیار کئے ہوں۔

اسلام اس حق کو تلاش کرتا ہے کہ آدمی اپنا ایک تشخص رکھتا ہے۔ جو اپنی فطری رفتار پر بڑھنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ آزادی سلب کر لی جائے تو وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور یہ انسان کا عین فطری تقاضا ہے کہ خدا کی زمین میں وہ اپنی طبیعت کے رجحان اور اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق خود اپنی زندگی کا سامان تلاش کرے۔ لیکن اسلام اس کو یہ حق ہرگز نہیں دیتا کہ وہ اپنی معاش حاصل کرنے کے لئے اخلاق کو خراب کرنے والے یا تمدن کے نظام کو بگاڑنے والے ذرائع اختیار کرے۔ وہ کسب معاش کے ذرائع میں حرام اور حلال کی تمیز قائم کرتا ہے۔ اور نہایت تفصیل کے ساتھ چن چن کر ایک ایک نقصان رساں طریقہ کو حرام کر دیتا ہے۔ اس کے قانون میں خبیثات و مسکرات نہ صرف بجائے خود حرام بلکہ ان کا بنانا، بیچنا، خریدنا، رکھنا سب حرام ہے۔ وہ حرامکاری۔ فحاشی اور رقص و سرود کو بھی ناجائز ذریعہ کسب معاش قرار دیتا ہے۔ وہ ایسے تمام وسائل معیشت کو بھی ناجائز ٹھیراتا ہے جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے لوگوں کے یا سوسائٹی کے نقصان پر مبنی ہو۔ رشوت، چوری، جوا اور سٹہ، دھوکہ اور فریب

کے کاروبار، اشیائے ضرورت کو اس غرض سے روک رکھنا کہ قیمتیں گراں ہوں، معاشی وسائل کو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا اجارہ قرار دینا کہ دوسروں کے لئے جدّوجہد کا دائرہ تنگ ہو۔ ان سب طریقوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نزاع پیدا کرنے والے ہوں۔ یا جن میں نفع و نقصان بخت و اتفاق پر مبنی ہو۔ یا جن میں فریقین کے درمیان حقوق کا تعین نہ ہو۔

اگر تم اسلام کے اس تجارتی قانون کا تفصیلی مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہو جائے کہ آج جن طریقوں سے لوگ کروڑ پتی اور ارب پتی بنتے ہیں ان میں سے بیشتر طریقے وہ ہیں جن پر اسلام نے سخت قانونی بندشیں عائد کر دی ہیں۔ وہ جن وسائل کسب معاش کو جائز ٹھہراتا ہے ان کے دائرے میں محدود رہ کر کام کیا جائے تو اشخاص کے لئے بے اندازہ دولت سمٹتے چلے جانے کا بہت کم امکان ہے۔

جائز ذرائع سے جو کچھ انسان حاصل کرتا ہے اس پر اسلام اس شخص کے حقوق ملکیت تو تسلیم کرتا ہے مگر اس کے استعمال میں اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑتا بلکہ اس پر بھی متعدد طریقوں سے پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کمائی ہوئی دولت کے استعمال کی تین ہی صورتیں ہی ممکن ہیں۔ اس کو خرچ کیا جائے۔ اس کو مزید نفع آور کاموں میں لگایا جائے یا اسے جمع کر دیا جائے۔ ان سب میں سے ایک ایک پر اسلام نے جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ خرچ کرنے کے جتنے طریقے اخلاق کو نقصان پہنچانے والے ہیں یا جن سے مسلم سوسائٹی کو نقصان پہنچتا ہے وہ سب ممنوع ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی اسراف بیجا بھی نہیں کر سکتا۔ ریشمی کپڑے اور زیورات تک بھی نہیں پہن سکتا۔ غرض کہ اسلام نے ان تمام تاریک دروازوں کو بند کر دیا ہے جن سے انسان کی دولت کا بیشتر حصہ اس کی اپنی نفس پرستی پر صرف ہو جاتا ہے۔ وہ خرچ کی جن صورتوں کو جائز رکھتا ہے وہ بس اس قسم کی ہیں کہ آدمی لس ایک اوسط درجہ کی شستہ اور پاکیزہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اگر کچھ بچتا ہے تو اسے خرچ کرنے کا راستہ اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ اسے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ رفاہ عامہ میں ان لوگوں کی امداد پر لگا دیا جائے جو معاشی دولت میں سے اپنی ضرورت کے مطابق

حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں۔

اسلام کے نزدیک بہترین طرزِ عمل یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے اسے اپنی جائز اور معقول ضرورتوں پر خرچ کرے۔ اس صفت کو اسلام نے بلند ترین اخلاقی معیاروں میں داخل کیا ہے۔ اور ایک آئیڈیل کی حیثیت سے اس کو اتنے زور کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جب کبھی سوسائٹی پر اسلامی اخلاقیات کا اثر غالب ہوگا اجتماعی زندگی میں وہ لوگ زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

تاہم مجرد اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے اور سوسائٹی کے اخلاقی اثر اور دباؤ سے غیر معمولی حرص و طمع رکھنے والے لوگوں کی کمزوریوں کا بالکل استحصال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود پھر بھی بہت سے لوگ ایسے باقی رہ جائیں گے جو اپنی ضرورت سے زیادہ کمائی دولت کو پھر مزید دولت کمانے میں لگانا چاہیں گے۔ اس لئے اسلام نے اس کے استعمال کے طریقوں پر چند قانونی پابندیاں عاید کردی ہیں۔ اس بچی ہوئی دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے سود پر چلایا جائے اسلامی قانون میں قطعی حرام ہے۔ اگر تم اپنا مال قرض دیتے ہو تو خواہ قرض دار نے وہ قرض اپنی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے لئے لیا ہو، یا وسیلہ معاش پیدا کرنے کے لئے بہر حال آپ اس سے صرف اپنا اصل مال واپس لینے کے حق دار ہیں۔ اس طرح اسلام ظالمانہ سرمایہ داری کی کمر توڑ دیتا ہے۔ اور ان ہاتھوں کو شل کر کے رکھ دیتا ہے جو محض اپنے سرمایہ کے بل پر آس پاس کی معاشی دولت سمیٹتے رہتے ہیں۔ رہا فاضل دولت کے استعمال کا طریقہ اسے انسان خود اپنی تجارت یا صنعت و حرفت میں یا دوسرے کاروبار میں لگائے یا دوسروں کے ساتھ نفع نقصان کا شریک ہو کر سرمایہ فراہم کرے تو اسلام اسے جائز رکھتا ہے۔ اور اس سے ضرورت سے زیادہ جو دولت اشخاص کے پاس سمٹ آتی ہے اس کا علاج دوسرے طریقوں سے کرتا ہے۔

اسلام نے ضرورت سے زیادہ دولت جمع کرنے کو معیوب قرار دیا ہے۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تمہارے پاس ہے یا تو اسے اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کرو یا دوسروں کو دو کہ وہ اس سے اپنی ضروریات خریدیں اور اس طرح پوری دولت

برابر گردش میں آتی رہے۔ تو تمہاری اس جمع کردہ دولت میں سے اسلامی قانون کی رو سے ۲/۱ ۲ فیصد رقم سالانہ لے لی جائے اور اسے ان لوگوں کی اعانت پر صرف کیا جائے جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل نہ ہوں۔ یا سعی و جہد کرنے کے باوجود اپنا پورا حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہوں۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے۔ اور اس کے انتظام کی جو صورت اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسے جماعت کے قوم کے مشترک خزانہ میں جمع کیا جائے۔ اور خزانہ ان تمام لوگوں کی ضروریات کا کفیل بن جائے مدد کے حاجت مند ہوں۔

اسلام کا معاشی نظام ہی حقیقی معاشی انصاف اور اجتماعی عدل کا ضامن ہے۔ اسلام ہی میں عدالت اجتماعیہ ہے۔ اسلام ہی وہ دین حق ہے جو خالق کائنات اور رب کائنات نے انسان کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے۔ اور انسانوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور یہ طے کرنا کہ ان کے لئے کیا چیز عدل ہے اور کیا عدل نہیں ہے۔ انسانوں کے خالق و رب ہی کا کام ہے۔ دوسرا کوئی نہ اس کا مجاز ہے کہ عدل و ظلم کا معیار تجویز کرے۔ اور نہ دوسرے کسی میں یہ اہلیت پائی جاتی ہے کہ حقیقی عدل قائم کر سکے۔ انسان اپنا آپ مالک اور حاکم نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے معیار عدل خود تجویز کر لینے کا مجاز ہو۔ کائنات میں اس کی حیثیت خدا کے مملوک اور رعیت کی ہے۔ اس لئے معیار عدل تجویز کرنا اس کا اپنا نہیں بلکہ اس کے مالک اور فرمانروا کا کام ہے۔ پھر انسان خواہ کتنے ہی بلند مرتبے کا ہو اس کے علم کی محدودیت، اور عقل کی کوتاہی و نارسائی اور عقل پر خواہشات و تعصبات کی دستبرد سے کسی حال میں بھی مفر نہیں ہے۔ اسو جہ سے اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان خود اپنے لئے کوئی ایسا نظام بنا سکے جو درحقیقت عدل پر مبنی ہو۔ لہذا حقیقی عدل اسی نظام میں ہو سکتا ہے جو اللہ تعالےٰ نے بنایا ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عدل ہی اسلام کا مقصود ہے۔ اور کہ اسلام آیا ہی عدل قائم کرنے کے لئے ہے۔

لیکن تم ایسے غافل ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ کر کسی دوسرے ماخذ کی طرف بھاگے جاتے ہو۔ اگر تم معاشی عدل اور اجتماعی عدل قائم کرنا چاہتے ہو تو اسلام کو قائم کرو۔ عدل اسلام سے الگ کسی چیز کا نام نہیں۔ اس کا قائم ہو جانا عدل کا قائم ہو جانا ہے

لیکن تم یہ بھی نہیں جانتے کہ عدل اجتماعی درحقیقت ہے کس چیز کا نام۔ اور اس کے قیام کی صحیح صورت کیا ہے۔ تم بھلا تالیف معاشرہ کیا کروگے جو بھی نہیں جانتے کہ معاشرہ کیا ہوتا ہے؟ اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا جس سے تمہارے بگڑے ہوئے منتشر معاشرتی خلیے از سر نو اکٹھے ہو کر نئی تنظیموں اور تربیتوں کا روپ دھارنے لگیں۔

معاشرہ یوں تو ایک لفظ ہے لیکن ان گنت چیزوں سے عبارت ہے۔ وہ ان تمام طور طریقوں کا احاطہ کرتا ہے جن کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کے تجربوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور اشتراک عمل سے مشترک مفاد اور مقاصد وضع کرتے ہیں۔ اور ان مقاصد کو وضع کرنے کے لئے معاشرتی انداز فکر اپنانا پڑتا ہے۔

اعضا کی معاشرت کا وجود جسم اور افراد کی معاشرت کا وجود قوم ہے ــــــــــ!
فرد، مملکت یا معاشرتی ادارہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں ــــــــــ! معاشرہ بھی ایک عضویاتی نظام ہے جس میں افراد کی مانند تغذیہ، دوران خون اور تولید کے اعضا ہوتے ہیں۔ افراد کے عضوی نظام کی طرح معاشرے میں بھی نشو و نما ہوتی ہے۔ اور کہ معاشرہ کوئی واحد تنظیم نہیں، وہ بہت سی انجمنوں اور تنظیموں کا نام ہے۔ معاشرے سے مراد ہے انجمن یعنی کسی بھی قسم کے تجربے کی بہتر تکمیل کی خاطر مل جل کر کام کرنے کے لئے اکٹھا ہونا۔ معاشرتی ارتقا کو سمجھنے کے لئے یہ بات سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ معاشرہ اور اس کا ہر فرد لازم و ملزوم ہیں۔ افلاطون نے اپنے مثالی معاشرے اور تصوراتی مملکت یوٹوپیا کی بنیاد اسی پر رکھی تھی۔

ہر انسانی معاشرہ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں افراد سے مل کر بنتا ہے۔ اس مرکب کا ہر فرد ذی روح، ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ ہر فرد اپنی ایک مستقل شخصیت رکھتا ہے جسے پھولنے پھلنے اور نشو و نما پانے کے لئے مواقع درکار ہیں۔ ہر فرد کا اپنا ایک ذاتی ذوق ہے۔ اس کے اپنے نفس کی کچھ رغبات و خواہشات ہیں۔ مرغوبات و محبوبات ہیں، اس کے اپنے جسم و روح کی کچھ ضروریات ہیں، ان افراد کی حیثیت کسی مشین کے بے روح پرزوں کی سی نہیں ہے۔ بلکہ وہ فعال پرزے ہیں۔

انسانی معاشرہ جیتے جاگتے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ افراد اس مجموعے کے لئے نہیں ہیں بلکہ مجموعہ ان افراد کے لئے ہے۔ اور افراد جمع ہو کر یہ مجموعہ بناتے ہی اس غرض کے لئے ہیں کہ ایک دوسرے کی مدد سے انہیں اپنی ضروریات حاصل کرنے اور اپنے نفس و جسم کے مطالبات اور تقاضے پورے کرنے کے مواقع ملیں۔

پھر یہ افراد فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ہر ایک کو اس دنیا میں ایک خاص مدت امتحان گزارنے کے بعد اپنے خدا کے حضور میں جا کر حساب دینا ہے کہ جو قوتیں اور صلاحیتیں اسے دنیا میں دی گئی تھیں۔ ان سے کام لے کر اور جو ذرائع اسے عطا کئے گئے تھے ان پر کام کر کے وہ اپنی کیا شخصیت بنا کر لایا ہے۔ خدا کے سامنے انسان کی یہ جواب دہی اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ وہاں کنبے قبیلے اور قومیں کھڑی ہو کر حساب نہیں دیں گی۔ بلکہ دنیا کے تمام رشتوں سے کاٹ کر اللہ تعالیٰ ہر ہر انسان کو الگ الگ اپنی عدالت میں حاضر کر دے گا اور فرداً فرداً اس سے پوچھے گا کہ تو کیا کر کے آیا ہے اور کیا بن کر آیا ہے۔

یہ دونوں امور یعنی دنیا میں انسانی شخصیت کا نشو و نما اور آخرت میں انسان کی جواب دہی اسی بات کے طالب ہیں کہ دنیا میں فرد کو حریت حاصل ہو۔ اگر کسی معاشرے میں فرد کو اپنی پسند کے مطابق اپنی شخصیت کی تکمیل کے مواقع حاصل نہ ہوں تو اس کے اندر انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس کی قوتیں اور قابلیتیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ اور اپنے آپ کو محصور و محبوس پا کر انسان جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر آخرت میں ان محبوس و محصور افراد کے گناہوں اور خطاؤں کی بیش تر ذمہ داریاں ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جانے والی ہیں جو اس قسم کے اجتماعی نظام کو بنانے اور چلانے کے ذمہ دار ہوں۔ ان سے صرف ان کے اپنے انفرادی اعمال ہی کا محاسبہ نہ ہوگا بلکہ اس بات کا محاسبہ بھی ہوگا کہ انہوں نے ایک جابرانہ نظام قائم کر کے دوسرے بے شمار انسانوں کو ان کی مرضی کے خلاف اور اپنی مرضی کے مطابق ناقص شخصیتیں بننے پر مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی آخرت پر ایمان رکھنے والا انسان یہ بھاری بوجھ اٹھا

کہ خدا کے سامنے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر خدا سے ڈرنے والا انسان ہے تو لازماً وہ افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کی طرف مائل ہوگا۔ تاکہ ہر فرد جو کچھ بھی بنے اپنی ذمہ داری پر بنے۔ اس کے غلط انسان، غلط شخصیت بننے کی ذمہ داری اجتماعی نظام چلانے والے پر عائد نہ ہو جائے۔

ہر معاشرہ پوری انسانیت کی شکل میں کنبوں، قبیلوں اور قوموں میں علی الترتیب قائم ہوتا ہے، اس کی ابتدا ایک مرد اور ایک عورت اور ان کی اولاد سے ہوتی ہے جس سے خاندان بنتا ہے۔ ان خاندانوں سے قبیلے اور برادریاں بنتی ہیں۔ ان سے ایک قوم وجود میں آتی ہے اور یہ قوم اپنے اجتماعی ارادوں کی تنفیذ کے لئے ایک ریاست کا نظام بناتی ہے، ان مختلف شکلوں میں یہ اجتماعی ادارے اصلاً جس غرض کے لئے مطلوب ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی حفاظت اور ان کی مدد سے فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے مواقع نصیب ہو سکیں جو وہ تنہا اپنے بل بوتے پر حاصل نہیں کر سکتا۔ اس اس بنیادی مقصد کا حصول اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے ہر ایک ادارے کو افراد پر اور بڑے ادارے کو چھوٹے اداروں پر اقتدار حاصل ہوتا کہ وہ افراد کی ایسی آزادی کو روک سکیں جو دوسروں پر دست درازی کی حد تک پہنچتی ہو۔ اور افراد سے وہ خدمت لے سکیں جو بحیثیت مجموعی تمام افراد معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے مطلوب ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر عدالت اجتماعیہ کا مسئلہ ہوتا ہے اور انفرادیت و اجتماعیت کے متضاد تقاضے ایک گتھی کی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

آسیب زدہ لوگو!

تم کرہ ارض کی کوئی قوم لے لو۔ زمین کا کوئی خطہ سامنے رکھ لو جس وقت سے اس کی تاریخ میں روشنی آئی ہے ان حالات کا کھوج لگانے سے پتہ چلے گا کہ اس کی پوری تاریخ کی حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وارث و میراث کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ایک قوم قابض ہوئی اور مٹ گئی، پھر دوسری وارث ہوگئی اور وہ بھی مٹ گئی تو اس کی جگہ کسی تیسری قوم کا تسلط و اقتدار قائم ہوگیا۔ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ یہاں وارث

و میراث کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ جو ورثہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں کیوں ہوتے ہیں اور جو وارث ہوتے ہیں ان کو حق وراثت کیوں ملتا ہے۔ فرمایا اس لئے کہ یہاں خدا کا ایک ہی اٹل قانون کام کر رہا ہے۔

زمین کے وارث خدا کے نیک بندے ہوتے ہیں ——!

یہ ایک فکر و عقل کی بات ہے جبکہ عقل و حکمہ صرف انسان ہی سے مخصوص ہے تو پھر عقل و فکر سے کام لو۔ کیا یہ خطہ زمین تمہیں اس لئے دیا گیا ہے کہ تم یہاں فتنہ و فساد کا بازار گرم کرو۔ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کی وارداتیں کرو۔ اس کے طول و عرض میں فسق و فجور پھیلاؤ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی یہاں وہی قانون کام کر رہا ہے کہ انہی لوگوں کے حصہ میں ملک کی فرمانروائی آتی ہے جو نیک ہوتے ہیں۔ جو صالح ہوتے ہیں۔ اور حکومت و فرمانروائی محض ایک ورثہ ہے جو ایک گروہ سے نکل جاتا ہے اور دوسرے گروہ کے حصہ میں آجاتا ہے۔ اور وہ اس لئے کہ بروئے قرآن وراثت ارض کی شرط اصلاح و صلاحیت ہے جو صالح نہ رہے ان سے نکل جائے گی اور جو صالح ہوں کے ان کے ورثہ میں آئے گی۔ فطرت ہمیشہ چھانٹی رہتی ہے۔ وہ ہر گوشہ زمین و زندگی میں صرف خوبی اور برتری ہی کو باقی رکھتی ہے۔ فساد اور نقص کو محو کر دیتی ہے۔ اس کارگہ فیضان و جمالیات نیں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو۔ وہ خسران و نقصان گوارا نہیں کرتی۔ اور جس طرح مادیات میں اس اٹل قوت کا تعمیری و تخریبی عمل جاری ہے بعینہ معنویات میں بھی وہی عمل کارفرما ہے۔ جو عمل حق ہوگا باقی رہے گا جو باطل ہوگا مٹ جائے گا۔ تم اس قانون سے کیسے انکار کر سکتے ہو جبکہ زمین و آسمان کا تمام کارخانہ ہی اس اصول پر چل رہا ہے اور اقوام و امم کا عروج زوال بھی اس کی گرفت ہی میں ہے۔ قوموں، امتوں اور جماعتوں کے گزشتہ و پیوستہ اعمال ہی تو ہیں جن سے ان کا حال تشکیل پاتا ہے اور حال کے اعمال ہی تو ہیں جو ان کے مستقبل کو متشکل کرتے ہیں۔ پھر اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدل ڈالے۔ یہ خدا کا قانون ہے اور قانون خدا کا لفاذ کون روک سکتا ہے۔ اگر تم نے صلاحیت عمل کھو دی تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو

اقبال وار تقاکی نعمت عظمٰے سے نواز ے گا۔ اور کوئی نہیں جو اس کو ایسا کرنے سے روک سکے۔ یہ انقلابات و تبدلات جو ملکوں اور قوموں میں ہوتے رہتے ہیں۔ یہ پرانی قومیں مرجاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں یہ تمام حوادث اسی حکمت و قانون الٰہیہ کا نتیجہ ہیں۔

تاریخ شاہد ہے مسلمانوں نے جب تک اپنے عروج کے مقاصد کو سنبھالے رکھا دنیا کے لئے نافع رہے۔ اپنی ذات کے لئے نافع رہے۔ اس لئے ان کو تمکین فی الارض کا اعزاز حاصل رہا اور جب سے انہوں نے اپنے ظہور و عروج کا مقصد دل و دماغ سے محو کر دیا مسلمان وہ نہ رہے جو کہ وہ تھے۔ مسلمانوں کا اصلی مشن اور مقصد تخلیق اور قومی امتیاز و شرف خصوصی اس چیز کو قرار دیا ہے کہ دنیا میں اعلان حق اور صالحیت ان کا سرمایہ حیات ہے اور وہ ہمیشہ قیام عدل کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ جب تک قومیں قیام عدل میں مساعی و جدوجہد کرنے والی ہوتی ہیں فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی ہے۔ بصورت دیگر حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں۔ پھر ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

دور جانیکی ضرورت نہیں۔ تم خود اپنی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔ جب تک تم دنیا میں حق و انصاف کے حامی و مددگار رہے دنیا کی کوئی طاقت تمہارے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ لیکن جونہی تاریخ اسلام کا عہد تاریک شروع ہوا تم نے اجتماعی انتشار کا شکار ہو کر اپنی ہیئت اجتماعیہ کی ہیئت ہی بگاڑ لی۔ اور گھور اندھیروں میں لڑھکتے چلے گئے۔ بدستور اپنی اندھیروں میں لڑھکتے چلے جا رہے ہو۔ بات بات پر آپس میں الجھ رہے ہو۔ الجھا رہے ہو۔ آسیب شب نے تمہیں اس برح طرح دبوچا ہے کہ تم اسے چھٹکارا ہی نہیں پا رہے ہے۔ مجھ سے بیزار۔ اپنے آپ سے بیزار خدا سے بیزار۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا بیزاری Theophobia پاکستان سے بیزاری اور اپنی ذات سے بیزاری بھی ایک عارضہ ہے جو تمہیں لاحق ہو گیا ہے۔ جس کی کسی سرسامی و جنونی کیفیت میں تم خون سے کھیل رہے ہو۔ آگ سے کھیل رہے ہو۔ کہ یہ چمن اس لئے ایجاد ہوا تھا کہ اس کے لالہ گل ہی اس میں آگ لگا دیں۔ اور ہر پتہ اس آگ کو ہوا دینے لگے۔

یہ پربت یہ انسان

ہندوستان میرا دشمن ہے -!

میں اُس کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہوں۔ اُس نے ہمیشہ میری سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اُس کا یہ چھوٹا سا ہمسایہ ملک دنیا کے نقشے میں نظر آئے۔ تخریبی سازشوں کا جال بچھا کر اُس نے مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور پھر تمہاری وہ تخریبی کارروائیاں جو مجھے تباہ کرنے کے لیے نہیں تباہ کرنے کے لیے تمہارا وظیفہ حیات بن گئی ہیں دشمن کو اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمیشہ بڑی سازگار نظر آئی ہیں۔ اُس نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بغیر کسی الٹی میٹم کے ننگی جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں مجھ پر جارحانہ حملہ کر دیا۔ تم پر حملہ کر دیا۔ یہ وقت میرے لیے بڑا کٹھن تھا۔ تمہارے لیے بڑا کٹھن تھا۔ دشمن کو اپنی عددی برتری اور کثرت اسلحہ کے بل بوتے پر ہمیشہ کے لیے مجھے صفحہ دنیا سے مٹا دینے کا پورا یقین تھا۔ اپنے راستے میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو کچلتے ہوئے تمہاری جانوں اور عزتوں کے ساتھ کھل کھیلنے کا اُسے پورا پورا یقین تھا۔ اُس کی سینا اور سینکوں نے بڑے ناپاک عزائم سے مجھ پر دھاوا بول دیا تو میری فوج کے صف شکن سرفروش جیالوں نے میری حفاظت کے لیے بے پناہ عزم و حوصلے کا مظاہرہ کیا۔ جدید حرب و پیکار کی تاریخ میں یہ نظیر قائم کر دی کہ اگر صفوں میں اتحاد اور دلوں میں ولولہ موجود ہو تو ایک چھوٹی سی فوج کے حوصلوں کی پختگی اپنے سے دس گنا زیادہ اور برتر طاقت کے آہن و آگ کو بھی شکست دے سکتی ہے۔

اور میرے جیالوں نے چونڈہ و کھیم کرن کے میدانوں میں دنیا کو بتا دیا کہ اُن کے کردار میں اسلام کے دور اول کے غازیوں کا سا جلال و جمال ہے۔ انہوں نے غازی و شہید بن کر میری

آن دکھا کی معرکہ بدر و حنین کی یاد تازہ کر دی اس سے پہلے میں ایک خواب تھا انہوں نے اپنے خون کی قربانی دے کر مجھے ایک کبھی نہ مٹنے والی حقیقت بنا دیا۔ یہ ہیں میرے سپوت جنہیں بڑے فخر سے اپنے سپوت کہتا ہوں۔ آزمائش کی گھڑی میں دشمن کے راستے میں سیسہ پلائی دیوار بن جانے والے یہ پربت یہ انسان ——— !

یہ کہنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ اگر یہ نہ ہوتے تو آج میں بھی نہ ہوتا۔ میں اب تک ختم ہو چکا ہوتا۔ ۶ ستمبر کو ارض پاک کے صف شکن بیٹے جہاد کرنے کو نکلے تو آسمان کی بلندیاں اور سمندر کی گہرائیاں بھی ان کے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔

۸ نومبر ۱۹۴۷ء قائداعظم نے افواج پاکستان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"میں چاہتا ہوں آپ سب مکمل اتحاد اور باہمی تعاون سے کام کریں۔ ان تمام خطروں کا مل جل کر مقابلہ کریں جو آج ہمیں درپیش ہیں مجھے یقین ہے کہ ہم ان مشکلات اور خطروں سے کامیابی سے گزر جائیں گے۔ پاکستان کی عزت و وقار کو اور بھی بلند کرتے ہوئے۔ اسلام کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے۔ اور اپنے قومی پرچم کو لہراتے ہوئے۔"

میرے جیالے فرزندوں نے جہاد کیا۔ اور جہاد مومن سنت پیغمبری ہے۔ اسوۂ شبیری ہے!!

جہاد نقطہ پرکار حیات ہے۔ جہاد اسلام کی روح اور دین کا نقطہ ماسکہ ہے۔ جہاد ہی وہ رمز حیات ہے جس کو پالینے سے انسان مرد کامل۔ مرد فقیر اور صاحب خودی ہو جاتا ہے صاحب سیف ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت نار خودی اور نور خودی سے ہر اندوز ہوتی ہے۔ اور پھر وہ ایک صاحب دل خانقاہ نشین ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک صاحب دل حکمران ایک صاحب دل سپہ سالار بھی ہوتا ہے۔ پھر وہ سوائے خدا کی ذات کے کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ اس کے مسجدوں میں روح کائنات جنبش کرتی ہے۔!

جہاد دین کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ فقہائے مومن کے لیے فریضہ جہاد کی بجا آوری کے چار طریقے بتائے ہیں۔ جہاد بالقلب۔ جہاد باللسان۔ جہاد بالید اور جہاد بالسیف۔

قلبی جہاد یہ ہے کہ انسان شیطان کا مقابلہ کرے۔ یہ جہاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے نزدیک اس درجہ اہم تھا کہ اسے جہادِ اکبر قرار دیا گیا۔ دوسرا زبان سے جہاد اور تیسرا ہاتھ سے جہاد۔ یہ جہاد بھی حق کی حمایت اور باطل کو مٹانے کے لیے کیے جاتے ہیں چوتھا جہاد، جنگ کے مترادف ہے اس کا تعلق غیر مومنوں اور دشمنانِ دین کے خلاف لڑنے سے ہے۔

اسلام میں جہاد کو نہ صرف مشرکین کی تادیب کے لیے روا رکھا ہے۔ بلکہ صالح سلطنت کے لیے بھی۔ اس لیے عمل جہاد میں، وظیفہ جہاد میں بجائے خود مسلمانوں کی برتری اور تسلط مضمر ہے۔ اور کلمہ حق کی سربلندی کے ساتھ خدا کا سیاسی اقتدار بھی قائم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد اگرچہ بہت اہم ہے لیکن اسے پانچ ارکان اسلام میں شامل نہیں کیا گیا کہ پانچ ارکان اسلام کا نفاذ لازماً حکومت کی طرف سے نہیں ہوتا لیکن جہاد خاص مقاصد کے پیش نظر حکومت وامامت ہی کی طرف سے نافذ ہوتا ہے، فنی اصطلاحات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پانچ ارکان انفرادی فرائض ہیں۔ فرض عین۔ جیسے نماز و روزہ۔ جن کی پابندی ہر مومن پر فرداً وشخصاً فرض ہے۔ اگر وہ ان فرائض کو پورا نہ کرے تو تعزیر کا مستوجب ٹھہرے گا۔ اس کے برعکس جہاد کو تمام فقہا اجتماعی فرض قرار دیتے ہیں۔ جو قوم پر بہ لحاظ قوم فرض ہے۔

مسلمانوں پر اچانک حملہ ہو جائے تو جہاد تمام مردوں، عورتوں اور بچوں پر یکساں فرض ہو جاتا ہے۔ گویا یہ فرض کفایہ ہے جو مسلمانوں پر اجتماعاً واجب ہے۔ اس سلسلے میں دو نکتے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اول یہ کہ یہ فرض تمام مومنوں کے لیے لازماً ادا کرنا ضروری نہیں۔ اس لیے کہ تمام کے تمام مومنوں کی بھرتی فوج میں نہ ممکن العمل ہے اور نہ قرین مصلحت بعض مومنوں کے لیے غذا اور اسلحہ تیار کرنے میں مصروف ہو جانا ضروری ہوتا ہے۔ لنگڑے اندھے اور بیمار جہاد کے لیے بلائے نہیں جا سکتے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جہاد کو شخصی فریضے کی جگہ اجتماعی بنا دینے سے اس بات کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ جہاد پہلے امت اور پھر حکومت کے ہاتھ میں ایک موثر حربہ بن جاتا ہے۔ اور اس اہم فرض عامہ کے ادا کرنے کا جو اجر ہے اس پر بھی مذہب کے دونوں مستند ماخذوں یعنی قرآن و حدیث میں خاص زور دیا گیا ہے۔ اور علمائے دین اپنے خطبات میں یہ حقیقت واضح کرتے رہتے ہیں۔ جہاد میں شرکت کرنے والا مارا جائے تو شہید۔ زندہ رہے تو غازی۔ اور

شریک جہاد کے لیے بہشت کا حاصل ہونا بدرجہا یقینی - شہدا زندہ جاوید ہیں۔ یوم حساب کو حساب کتاب کے بغیر بہشت میں جائیں گے۔

روایت ہے کہ بہشت میں سو درجے ہیں جو اللہ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے مہیا کئے ہیں۔ اور جہاد میں مجاہد کی ایک ضرب کو سو سال کی عبادت سے افضل قرار دیا ہے اور مجاہد کی یہ شان ہے کہ اللہ تعالےٰ اُن چنگاریوں کی قسم کھاتا ہے جو میدان جنگ میں بھاگتے مجاہد کے گھوڑے کے سموں سے پتھروں کے ساتھ ٹکرانے سے نکلتی ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جہاد تشدد کا کوئی وقتی مظاہرہ ہے۔ بلکہ یہ پیچ در پیچ عوامل کی پیداوار ایک ایسا عمل ہے جسے اسلامی عقائد اور فقہ نے تشدد کو ختم کرنے کے لیے تشکیل کیا۔ اس طرح جہاد کو اسلام کے حقیقی مقاصد کی تکمیل کا آلہ کار سمجھنا چاہیئے۔ اسلام کی عالمگیری اور آفاقیت کا ہمہ گیر عقیدہ سمجھنا چاہیئے جسے مومنوں پر ایک مسلسل جنگ کی حیثیت سے واجب کر دیا گیا ہے تاکہ شہر اسلام کی حفاظت کی جائے اور دار الحرب کو جہاد کے ذریعے سے ناپید کر دیا جائے۔

قرآنی مملکت کے قیام و استحکام کے لیے مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے۔ اور اس جد و جہد میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جہاں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اس مسلسل جد و جہد کے لیے جہاد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور جنگ کے لیے قتال کا۔ اس سے واضح ہے کہ اگرچہ قتال بھی جہاد ہی کا ایک گوشہ ہے لیکن ہر جہاد قتال نہیں۔ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے والے دانستہ یا نادانستہ جہاد کو قتال ہی کے معنوں میں لیتے ہیں۔ اور قرآن کریم میں جہاد کی بڑی تاکید آئی ہے۔ بلکہ یوں کہو مومن کی ساری زندگی جہاد ہی سے عبارت ہے۔

نبی اکرم صلعم نے اپنی دعوت کا آغاز مکہ میں کیا۔ اور وہاں جماعت کی تشکیل کی۔ اس میں قوت اور قہر و غلبہ کا استعمال بالکل نہ تھا۔ دین کو دلائل و براہین کی روشنی میں پیش کیا جاتا جو اسے قبول کرتا کامل غور و خوض کے بعد دل کے پورے یقین کے ساتھ قبول کیا۔

ابتدا میں قریش کی طرف سے اسلام کی مخالفت ہوئی۔ اور مخالفت کی حد ہو گئی تو حضورؐ مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ لیکن قریش ایک لشکر جرار لے کر مدینہ کی طرف چڑھ دوڑے۔ اور ایک ایسا وقت آگیا کہ مجاہدین کی یہ جماعت یا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی یا میدان جنگ میں نکل کر اپنی

بغاوِ سلامتی کی آخری کوشش کرتی۔

یہ پہلا موقع ہے جہاں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اسلام دنیا میں مذہبی آزادی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ وہ دنیا کی ہر ملت کو مذہبی آزادی دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی مذہبی آزادی کو بھی برقرار رکھنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ پہلے تو اس کے لیے افہام و تفہیم سے کام لے گا کہ اُس کی دشمن قوتیں باز آ جائیں۔ لیکن انکار کی صورت میں اسلام میدان میں اتر آئے گا۔ کہ اس کے نزدیک حق و صداقت کی مدافعت میں جان دے دینا غیر اللہ کے نظام میں زندگی بسر کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

مردِ مومن انسانی غلامی کی نامساعد فضا میں سانس نہیں لے سکتا۔ خواہ اس میں دنیاوی معیار و میزان کی رو سے کتنا ہی امن کیوں نہ ہو۔ مومن کے دین میں محکومیت صرف خدا کے لیے ہے۔

سورۂ نسا میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو ظالموں کے ظلم و تشدد سے تنگ آکر فریاد کر رہے ہیں۔

ان الفاظ میں قرآن مجید نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ اسلام محض چند مذہبی عقائد اور چند عبادات سے عبارت نہیں۔ اور نہ چند دینی و دنیوی مراسم کا مجموعہ ہے۔ بلکہ وہ ایک احسن و اکمل اجتماعی نظام ہے جو زمین و زندگی کے تمام ظالمانہ و مفسدانہ نظامات کو ختم کرنا چاہتا ہے اور ان کی جگہ ایک اصلاحی نظام و قانون نافذ کرنا چاہتا ہے۔ جس سے تالیفِ معاشرہ اور تالیفِ ذات ہو سکے۔ اسلام اس نظام کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ اور اس تخریب و تعمیر اور انقلاب اصلاح کے لیے وہ کسی ایک قوم یا گروہ کو نہیں بلکہ انسانیت کو دعوت دیتا ہے کیونکہ اسلام ایک مذہب کا نام نہیں۔ مذہب کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ محض ایک مذہبی عقیدہ اور چند عبادات کا مجموعہ ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے تو مذہب واقعی ایک ذاتی معاملہ ہے اور ہر شخص کو کلی اختیار ہے کہ وہ جس عقیدے کو چاہے اپنائے اور جس کی جی چاہے عبادت کرے۔ اسی طرح لفظ قوم جن معنوں میں مشتمل ہے اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ قوم متجانس (Homogenesus) گروہ کا نام ہے۔

لیکن اسلام نہ تو ایک مذہب اور نہ مسلمان ایک قوم - یہی وجہ ہے کہ جہاد کی ساری معنویت جس کی بنا پر اسے افضل العبادات کہا گیا ہے برقرار رہتی ہے -

دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے - جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم و ضبط کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق اُسے تعمیر کرنا چاہتا ہے - اور مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت کا نام ہے جسے اسلام اپنے مقصود و مطلوب انقلابی نظام کو عمل میں لانے کے لیے منظم کرتا ہے - اور جہاد اس انقلابی جد و جہد کا اور اس کے انتہائی صرف طاقت کا نام ہے - جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسلامی جماعت عمل میں لاتی ہے -

تمام مقتدر و برگزیدہ علمائے دین اس پر متفق ہیں کہ دوسرے انقلابی مسلکوں کی طرح اسلام بھی عام مروج الفاظ کو چھوڑ کر اپنی ایک خاص اصطلاحی زبان (Terminology) اختیار کرتا ہے کہ اس کے انقلابی تصورات عام تصورات سے مختلف و ممتاز ہو سکیں - لفظ جہاد بھی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے - اسلام نے حرب، جدال و قتال اور اسی نوعیت کے دوسرے عربی الفاظ جو جنگ کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں جہاد کے لیے قصداً ترک کر دیئے ہیں -

لفظ جنگ قوموں اور سلطنتوں کی ان لڑائیوں کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے اور اب تک ہو رہا ہے جو افراد اور جماعتوں کے اغراض و مقاصد کے لیے لڑی جاتی ہیں - ان لڑائیوں کے محرک محض ایسے افراد و اشخاص یا اجتماعی اغراض و مقاصد ہوتے ہیں جن کے اندر کسی نظریے، نصب العین اور اصول کی حمایت کا شائبہ نہیں ہوتا - ایسی لڑائیوں کا عام مقصد مسلح جارحیت کے بل برتے ہیں توسیع پسندی ہوتا ہے - لیکن اسلام کی لڑائی چونکہ اس نوعیت کی نہیں اس لیے وہ یہ لفظ استعمال ہی نہیں کرتا - اس کے پیش نظر کسی قوم، کسی گروہ کسی ہیئت اجتماعیہ کا مفید نہیں ہے - وہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ زمین پر ایک سلطنت کا تسلط و اقتدار ہو یا دوسری کا قبضہ و غلبہ ہو - اس کی دلچسپی جس مقصد سے ہے وہ تو محض فلاح انسانیت ہے - اور اس اصلاح کے فروغ و فرانہ کے لیے وہ اپنا ایک خاص نظریہ، ایک مخصوص مطمع نظر اور ایک عملی مسلک رکھتا ہے - اس نظریے اور مسلک کے خلاف جہاں جس کی حکومت ہوگی اسلام

قلت وکثرت کا کچھ خیال کئے بغیر اس سے متحارب و متصادم ہو جائے گا۔ اور اس کی یہ حرب و ضرب جہاد ہوگی۔ اور اس کے فروغ و فراز کے لیے اس کی نظر میں زمین کا کوئی ایک ٹکڑا نہیں کرہ ارض ہوگا۔ تاکہ انسانیت کی فلاح کے لیے جس تبلیغ و اشاعت کا نام اسلام ہے اس سے تمام نوع انسانی مستفید و متمتع ہو اور اس مقصد کے حصول کے لیے جو طاقتیں انقلاب انگیز و انقلاب آفریں ہو سکتی ہیں ان سب طاقتوں کے استعمال و عمل کا جامع و احسن نام اس کے پاس جہاد ہے۔ اس ضمن میں زبان و قلم سے لوگوں کے نقطہ نظر کو بدلنا اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے۔ اور اس کی تقویت و استحکام کے لیے مال صرف کرنا اور جسمانی کاوش و کوشش بروئے کار لانا بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اور فی سبیل اللہ کی قید و پابندی اس کے ساتھ اس لیے ضروری ہے کہ اس سے خود کوئی دنیوی فائدہ مقصود نہیں بلکہ محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنا مراد ہے۔ جب کوئی شخص یا گروہ نظام زندگی میں انقلاب پیدا کرنے اور اسلامی نظریئے کے مطابق نیا نظام مرتب و متشکل کرنے کے لیے اٹھے گا تو اس کے قیام میں سرفروش و جاں نثاری کے جو معرکے اور محاربے ہوں ان میں نفسیاتی غرض و غایت نہ ہوگی۔ اس کی سرفروشیوں، جاں نثاریوں اور محنتوں کا مدعا صرف یہ ہوگا کہ بندگان خدا کے لیے زمین پر اور خدا کی عطا کی ہوئی زندگی میں عادلانہ نظام قائم و دائم ہو جائے۔ اور اس کا معاوضہ مختانہ اس کے نزدیک صرف خدا کی خوشنودی ہوگا۔ قرآن حکیم سورۃ نساء میں فرماتا ہے۔

"جو لوگ ایمان لائے ہیں خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔"

اسلام کی دعوت انقلاب کا خلاصہ تو یہ ہے کہ وہ تمام انسانوں کو پکارتا ہے اور اس کا خطاب انسان سے بحیثیت انسان ہے۔ وہ خدائی لب و لہجہ میں بات نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرو۔ خود تمہارے اندر خدائی و کبریائی کا جو داعیہ ہے اسے دماغ سے نکال دو۔ حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے۔ سب حاکموں کا حاکم خدا ہے کسی شخص کو خدا کی صفات کا مالک و مجاز کرنا دراصل اسے خدا کی خدائی میں شریک کرنا ہے۔ اور یہ شرک ہے۔ کفر ہے۔ دنیا میں یہی اصل بنائے فساد ہے۔

اسلام کی دعوت توحید و خدا پرستی ایک مذہبی عقیدے کی دعوت نہیں بلکہ حقیقت میں ایک اجتماعی انقلاب کی دعوت ہے۔ اور انبیا علیہم السلام سب کے سب انقلابی لیڈر۔ اور سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے انقلابی لیڈر۔ لیکن جو چیز دنیا کے عام انقلابیوں اور ان خدا پرست انقلابیوں کے درمیان واضح خط امتیاز اور خط وضاحت کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے انقلابی خواہ کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہوں عدل و توسط کے صحیح مقام کو نہیں پا سکتے۔ وہ یا تو خود مظلوم طبقوں میں سے اٹھتے ہیں یا ان کی حمایت کا جذبہ لے کر اٹھتے ہیں اور سارے معاملات کو انہی طبقوں کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظر غیر جانبدارانہ نہیں ہوتی۔ وہ ظلم کا ایسا علاج سوچتے ہیں جو نتیجۃً جوابی ظلم ہوتا ہے۔ ان کے لیے معتدل و متوازن اجتماعی نظام قائم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن انبیا علیہم السلام خواہ کتنے ہی ستائے ہوئے ہوں ان کی شخصی تحریک میں شخصی ردعمل نہیں ہوتا۔ وہ براہ راست خدا کی ہدایت کے تحت کام کرتے ہیں وہ سفاکانہ قوم پرستی کے علمبردار نہیں ہوتے۔ وہ ایک عادلانہ نظام قائم کرنے آتے ہیں اور تمام انسانوں کو حق کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اسلام بھی اس تخریب و تعمیر اور انقلاب و اصلاح کے لیے کسی ایک قوم یا گروہ کو نہیں بلکہ پوری انسانیت کو دعوت عمل دیتا ہے۔ یہ دعوت جو لوگ بھی قبول کر لیں وہ خواہ کسی طبقے کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک کے ہوں یکساں حقوق اور مساویانہ حیثیت سے اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں۔ اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی وجود میں آتی ہے جسے قرآن حکیم حزب اللہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور جس کا دوسرا نام اسلامی جماعت یا امت مسلمہ ہے۔ یہ حزب اللہ وجود میں آتے ہی اپنے مقصد وجود کی تحصیل کے لیے جہاد شروع کر دیتی ہے اور اس کے وجود کا عین اقتضا یہی ہے کہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی کو مٹانے کی کوشش کرے اور اس کے مقابلہ میں تمدن و اجتماع کے اس معتدل و متوازن ضابطہ کی حکومت قائم کرے۔

اور ارشاد ربانی ہے۔ یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مخالف لوگ تمہارے مقابلہ کے لیے جمع ہو گئے ہیں تم ان سے ڈرو۔ تو بجائے ڈرنے کے ان کا ایمان اور تازہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں۔ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ کتنا اچھا کارساز ہے۔

اور سنو ــــ!

اللہ تعالیٰ مجاہدوں کا دلی دوست ہے۔ کیونکہ وہ اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ اُس کے دین کے لیے جان دیتے ہیں۔ وہ زندہ جاوید ہیں۔

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ جسے خدا نے اپنے دوستوں کے لیے خاص کیا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس ہے۔ جو کوئی اسے ترک کر دیتا ہے۔ خدا تعالےٰ اسے ذلت و خواری کا لباس پہناتا ہے۔

حدیث نبویؐ ہے۔ دو آنکھوں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔ ایک جو الفتِ حق میں اشکبار ہوئی۔ اور دوسری اس مجاہد کی آنکھ جو ساری رات سرحد کی حفاظت کے لیے جاگتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کا نعرہ بوقت جہاد یہ تھا۔ ہم وہ ہیں کہ جنہوں نے نبی کریمؐ کے دستِ اقدس پر اس لیے بیعت کی ہے کہ آخری لمحہ حیات تک جہاد کرتے رہیں گے۔

جہاد کربلا میں ۱۳ سالہ حضرت قاسم بن حسنؓ نے فرمایا۔

"شہادت کا جام شہد کے گھونٹ سے زیادہ شیریں ہے"

اسی معرکہ میں حضرت علی اکبرؓ بن شہید اکبر سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔

"کیا ہی اچھی ہے وہ موت جو راہ حق میں میسر ہو"

مجاہد کی بڑی شان ہے۔ مجاہد کا بڑا اونچا مقام ہے ؎

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدہ افلاک ہے تو
تیرے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

۶ ستمبر کی جنگ میں انہی شاہینوں نے میری آبرو رکھ لی۔ اسلام کی آبرو رکھ لی۔ اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھنے والوں نے مجھے کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اس کی ساری تیاریاں

ہمیشہ اسی پر صرف ہوتی رہی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مجھے مٹا دیا جائے ۔ لیکن میرے غازیوں اور میرے شہیدوں نے بھارتی بھیڑیئے کے خونخوار دانت توڑ دیئے ۔ تو دنیا کو یہ کہنا پڑا پاکستانی مسلح افواج دنیا کی بہترین تربیت یافتہ اور انتہائی جفاکش افواج میں سے ہیں ۔ اس کی قیادت اعلیٰ اور تنظیم عمدہ ہے ۔ وہ اپنے فرائض کی بجاآوری میں تن من دھن سے وقف ہے ۔

میری مسلح افواج کو جفاکش ، ماہر اور وفا شعار ہونا ہی چاہیئے ۔ کیونکہ اس کا مقابلہ ہمیشہ ایک ایسے دشمن سے ہے جو تعداد میں اور اسلحہ میں اُس سے کئی گنا زیادہ ہے ۔ ایسے دشمن کو للکارنا اور پھر اُسے شکست فاش دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر میں جتنا بھی فخر کروں کم ہے ۔

۶ ستمبر کی جنگ میں جارحانہ حملے کی رات کو شمال میں اکھنور سے لے کر جنوب میں راجستھان تک بھارتی فوج کے ۱۱ سے زیادہ ڈویژن میری سرحد پر تیار کھڑے تھے ۔ اکھنور میں دو ڈویژن پیادہ فوج اور ایک ٹینک رجمنٹ صف آرا تھی ۔ یعنی دسواں پہاڑی ڈویژن ، ۲۵ واں پیادہ ڈویژن اور بدویں لانسر رجمنٹ ۔ سیالکوٹ اور چونڈہ کے محاذ پر دشمن کے تین ڈویژن یعنی ۲۶ واں پیادہ ، چھٹا پہاڑی اور چودھواں پیادہ ڈویژن متعین تھے ۔ ایک بکتر بند ڈویژن اور ٹینکوں کی دو رجمنٹیں بھی ۔ ۶۲ کیولری اور دوسری لانسرز اس کے علاوہ تھے ۔

۶ ستمبر کو دشمن نے لاہور کو فتح کرنا تھا ۔ دوسرے دن ۷ ستمبر کو اس بھارتی فوج نے قصور کی طرف سے پیش قدمی کرنے والی بھارتی فوج کے ساتھ جی ٹی روڈ پر مل جانا تھا ۔ بھارت کے جنگی نیتاؤں کو یقین تھا کہ سقوط لاہور سے پاکستانیوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے ۔ پورے ملک میں افراتفری پھیل جائے گی ۔ اور عین اُس موقع پر بھارت کی مکمل فتح پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے سیالکوٹ کی سرحد پر متعین بھارتی فوج آگے بڑھے گی ۔ اور شہر سیالکوٹ کو ایک طرف چھوڑ کر وزیر آباد اور گوجرانوالہ کے مقامات پر جی ٹی روڈ اور ریلوے لائن کو کاٹ دے گی ۔ اس طرح پاکستان کا قصہ پاک ہو جائے گا ۔

بھارتی حکومت نے لاہور کے لیے ایک ناظم بھی مقرر کر دیا تھا ۔ اور انتظام کرنے کے لیے بھاری تعداد میں پولیس بھی مخصوص کر دی تھی ۔ بھارت کی ایک نہایت مقتدر شخصیت لاہور میں فاتحانہ طور پر داخل ہونے اور دربار لگانے کے لیے سرحد پر پہنچ چکی تھی ۔ بھارتی

اخبارات نے اپنے جرنیلوں کی یقین دہانی پر سقوط لاہور کے خاص ضمیمے بھی شائع کر دیئے تھے۔

بھارتی منصوبہ کے مطابق ۶ ستمبر کو رات کے ساڑھے تین بجے لاہور پر دو اطراف سے بھارتی مسلح افواج کی پیش قدمی شروع ہوئی۔ دشمن کا ۱۵ واں پیادہ ڈویژن ایک ٹینک رجمنٹ کے ساتھ اٹاری واہگہ لاہور روڈ پر بڑھا۔ بعدازاں اس کو بھارت کے مایہ ناز ۵۰ ویں چھاتہ بردار بریگیڈ کی کمک بھی پہنچا دی گئی۔ دوسری طرف برکی لاہور روڈ پر ۷ واں بھارتی پیادہ ڈویژن ایک ٹینک رجمنٹ کے ساتھ حرکت میں آیا۔ ۶ بجے صبح تک بھارتی فوج تین میل آگے بڑھ آئی۔ اب اُسے بیدیاں راوی بمبانوالی نہر جسے وہ اچھوگل نہر کہتے تھے، کا کنارہ صاف نظر آ رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں راوی کے کنارے پر قبضہ کر لیں گے۔

لیکن یہاں میرے عساکر نے بھارتی مسلح افواج کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اچانک دشمن پر جہنم کے دروازے کھول دیئے گئے۔ بھارتی فوج پکی ہوئی فصل کی طرح کٹنے لگی۔ اور دشمن کے ٹینکوں، توپوں اور آرمڈ گاڑیوں کے پرخچے اڑنے لگے۔

سترہ دنوں میں پوری دنیا نے حیرت و استعجاب کے ساتھ میرے سرفروش مجاہدوں کی جرأت و شجاعت اور ناقابل تسخیر عزم کا مشاہدہ کیا۔

جدید حربی تاریخ میں کوئی بھی فوج پاکستانی فوج کی طرح بہادری اور بے جگری سے نہیں لڑی۔ تاریخ میں شاید ہی ایسی کوئی مثال مل سکے۔ کسی مٹھی بھر فوج نے اپنے سے کئی گنا بڑی اور طاقتور فوج کے درپے حملوں کا یوں مقابلہ نہ کیا ہوگا۔ میرے شہدا میرے غازی جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ اپنی بے مثال جرأت و شجاعت سے بھارتی فوج کی فتح کے ہر خواب کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔

اس جنگ نے میری زندگی کے، تمہاری زندگی کے دو بنیادی نکات نمایاں کئے۔ ایک یہ کہ پاکستانی قوم کچھ بنیادی اقدار کی مالک ہے۔ جو اسے ایک مخصوص قومیت بناتی ہیں۔ اور قومی آزادی ان اقدار کی بقاء کا جزو لاینفک ہے۔ دوسری یہ کہ میدان جنگ میں میرے عساکر میرے مجاہدین کی فاتحانہ قوت مزاحمت نے یہ حقیقت نمایاں کر دی کہ میرے وجود کے یعنی پاکستان کے وجود کے قطعی و حتمی ضامن یہی عساکر ہیں۔

اگر یہ نہ ہوتے تو شاید میں بھی نہ ہوتا - تم بھی نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو تمہاری نہ جانے کیا ہیئت کذائی ہوتی - سترہ دن کی اس جنگ کا ایک نمایاں ترین پہلو یہ بھی ہے کہ عساکر پاکستان کی پامردی و دلیری نے تمہیں سراسیمگی و لڑکھڑاہٹ کا شکار نہ ہونے دیا - خدانخواستہ اگر ان کے پاؤں اکھڑ جاتے تو تم حقیر و بےمقدار تنکوں کی طرح ذلت و ظلمت کے نہ جانے کن تاریک گڑھوں میں پڑے ہوتے - ان مجاہدوں کے عزم و استحکام نے تمہیں استحکام دیا - اپنے عملِ جہاد سے تم میں وقتی طور پر روحِ عمل پھونک دی - قوم کے منتشر و غیر متوازن خلیوں کو متحد و مکمل کر دیا - میرے سپاہی میرے سرفروش سپوت پر محاذ پر، زمین پر، فضاؤں اور سمندر کے گہرے پانیوں میں برسرِ پیکار تھے - اور قوم کا ہر طبقہ ہر گروہ ان کی امداد کے لیے سرگرم عمل ہو گیا تھا - کاش وہ اتحاد و یگانگت ہمیشہ کے لیے تمہارا قومی شعار بن جاتی -

میرے جیالے میرے صف شکن جنگی قیدی بن کر دشمن کی قید و بند میں بھی گئے - مگر اس شان سے کہ ان کا جسم کا بال بال کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی یہ اعلان کرتا ہے کہ پاکستان کے دشمنو تم نے میدان جنگ سے ہمیں پکڑ کر ہمارے جسم کو قید کر لیا ہے مگر ہماری روح تمہاری قید و بند میں نہیں - ہمارا ضمیر اور ہمارا جذبہ وطن پرستی آزاد ہے، ہمیشہ آزاد رہے گا - خلش و خطرہ سمجھ کر انتہائی عقوبتوں کے ساتھ قتل کر دو یا دنیا کو اپنی بہادری کا ثبوت دینے کے لیے زندہ رکھو - ہم کسی لالچ سے مغلوب اور تکلیفوں سے دہشت زدہ ہو کر پاکستان کے لیے جان دینے سے کبھی گریز نہیں کریں گے -

ذرا سوچو تو سہی —!

اگر یہ ارضِ موعود تم سے چھن جاتی تو تم جن کی تعداد دس کروڑ ہے ایسی غلامی میں گرفتار ہو جاتے جس سے نجات کی تمہیں کوئی راہ نہ ملتی - میرے عساکر نے تمہیں غلامی کی زنجیروں سے بچا لیا - تمہاری ملی آبرو کو شکست کے اس بازار نیلام نہ ہونے دیا جو دشمن تمہاری عظمت کے کھنڈروں میں اس لیے لگانا چاہتا تھا کہ تمہاری قوم کی بہو بیٹیوں کی عفت و عصمت کے دامن کو اپنی خونچکاں سنگینوں سے تار تار کرے اور تمہاری عورتوں کو ننگا کر کے اس جلوس سے کہیں زیادہ طویل و عریض جلوس نکالے جو اس نے ہندوستان کی تقسیم پر نکالا تھا - دشمن

کے ناپاک عزائم کا اس سے کھلا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جو بھارتی سینک پہلے ہی طوفانی ریلے میں جنگی قیدی بنائے گئے ان کے تھیلوں میں فرنچ لیدر بھی تھے۔ اور کیا یہ تمہاری غیرت کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی نہیں؟

اُس سترہ روزہ جہاد میں میرے عساکر نے اپنی حرب و ضرب سے تم پر آشکار کر دیا کہ امم و اقوام کی زندگی کا راز طاؤس و رباب ہی نہیں شمشیر و سناں میں مضمر ہے۔ جو قومیں طاؤس و رباب کی دنیا میں کھو گئیں مٹ گئیں اور جن قوموں نے شمشیر و سناں کو وظیفہ حیات بنایا ہمیشہ زندہ رہیں۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

ارض موعود پر بھارت کے حملے سے یہ واضح ہو گیا کہ بھارت کی فتح سے تم کن محرومیوں اور ذلتوں کا شکار ہو جاتے۔ اور یہ محرومیاں صرف اس ارض موعود تک ہی محدود نہ رہتیں۔ کیونکہ میری ذات صرف تمہارے لئے ہی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ دنیائے اسلام کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ فقط میری ذات ہی تو ہے جو مسلمان ممالک اور بھارت کے درمیان ایک فولادی دیوار بن کر کھڑی ہوتی ہے۔

میرا سپاہی میرے لئے لڑا تھا۔ اسلام کے لیے لڑا تھا۔ میں اور اسلام۔ اسلام اور پاکستان دو باہم مترادف الفاظ ہیں۔ میرے سپاہی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر وہ شکست کھا گیا تو اُس کا ہمہ گیر نقصان ہو گا۔ کیونکہ میں نے یعنی پاکستان نے اُس وقت تک ایک تاریخی وجود کی حقیقت اختیار نہ کی تھی۔ میری زندگی نے ابھی کافی مدت نہ گزاری تھی۔ میری سرحدیں ابھی تک صرف اٹھارہ سال کی ہوئی تھیں۔ بھارت نے صرف میری مسلح افواج پر ہی حملہ نہ کیا تھا بلکہ میرے وجود کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کے لیے حملہ کیا تھا۔

تمہارا جذبہ حب الوطنی مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ تم کتنے بہادر ہو میں نے تمہاری بہادری کے نظارے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ توپیں واہگہ کی سرحد پر گرج چمک رہی تھیں اور تم میں سے بیشتر شہر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ تقریباً آدھا شہر خالی ہو گیا تھا۔ اور پھر تم

ہیں سے وہ بہادر بھی مجھے بھولے نہیں جو اپنے ہی سیبر شاہینوں کی گرج سن کر بار بار بیت الخلا کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ تم بس سترہ دن میں یقیناً بڑے پارسا، بڑے متقی، بڑے مخیر اور پکے اور سچے مسلمان بن گئے تھے اس لئے کہ موت کی گھن گرج سے تمہارے کانوں کے پردوں، تمہارے دل بھی پھٹے جا رہے تھے

میرے سرفروش سپوتوں نے یقیناً یہ محسوس کر لیا تھا کہ اُن کو اپنے وطن کی سرحدوں کا صرف تحفظ ہی نہیں کرنا بلکہ انہیں تاریخ میں غیر فانی بنا دینا ہے۔ میری زندگی و موت کا انحصار صرف میرے عساکر پر تھا۔ خدانخواستہ اگر ان کے قدم اکھڑ جاتے تو دنیائے اسلام کی تاریخ اور قسمت ایک اہم موڑ پر گھوم جاتی۔ وہ صرف ایک سپاہی، ایک ہوا باز، ایک بری و بحری سپاہی کی حیثیت سے نہیں لڑا ارض پاک کے بانی کی حیثیت سے لڑا۔ وہ اپنے جنگ درباب کے متوالے بھائیوں کی گردنوں کو غلامی کے طوق وسلاسل سے بچانے کے لیے لڑا۔ خدا کے آخری پیغام اسلام کے مبلغ کی حیثیت سے لڑا۔ اور یہ اس کے جہاد کا نتیجہ ہے کہ میں آج پوری قوت و توانائی کے ساتھ زندہ ہوں۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے ہلا نہیں سکتی۔ قائداعظم کا مشن میرے مجاہدوں کے ہاتھوں پایہ تکمیل تک پہنچا۔ اس جہاد سے پہلے میں محض ایک تصور و تصویر تھا۔ ایک تخیل تھا۔ ایک نظریہ تھا جسے میرے مجاہدوں نے آگ و خون سے کھیلتے ہوئے اپنی بے مثال قربانیوں سے ایک اٹل حقیقت بنا دیا۔ جب وہ جنگلوں میں، آسمانوں میں، گہرے پانیوں میں جہاد کر رہا تھا تو قائداعظم کا پیغام اُس کے پیش نظر تھا۔

"خدائے بزرگ و برتر کی قسم! جب تک ہمارے دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرہ عرب میں نہ پھینک دیں۔ ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لیے میں تنہا لڑوں گا۔ جب تک میرے ہاتھوں میں سکت ہے۔ اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ موجود ہے۔ مجھے آپ سے کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لیے جنگ لڑنی پڑ جائے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں۔ اور پہاڑوں، جنگلوں، میدانوں اور دریاؤں تک میں جنگ جاری رکھیں۔"

اور میرے جانبازوں نے جنگ جاری رکھی جب تک کہ دشمن پر ضرب کاری لگا کر اُسے اپنی

سرحدوں سے باہر نہ دھکیلی۔ میرے جانباز میرے لیے وجہ افتخار ہیں۔ اسلام کے لیے وجہ افتخار ہیں۔ میرے جانباز عظیم ہیں۔ اور ان کی شجاعت و دلیری کی داستانیں عظیم تر۔ جس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا۔ پھر شہید ہوا یا غالب آکر غازی بنا اللہ تعالیٰ اُس کو اجرِ عظیم عطا کریں گے۔

یونہی منزل کی سمت بڑھتے چلو
شمعِ انسانیت کے پروانو
چھین لو دشمنوں سے تیغِ ستم
قوم کے غازیوں نگہبانو

وہ جو میرے لیے شہید ہوئے اور میرے لیے غازی بنے میری ہر سانس ان کی خدمت میں نذرانہ عقیدت ہے۔ دشمن پران کی ہر ضرب میری تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں محفوظ ہے۔

مجاہدوں کے بازوئے فلک فگن عجیب ہیں
بہادروں کے پنجہ ہائے تیغ زن عجیب ہیں
یہ جسم ہائے خونچکاں و بے کفن عجیب ہیں
مجاہدو شہید کے یہ بانکپن عجیب ہیں

حیات بھی حیات ہے تو موت بھی حیات ہے
تمہیں سے اے مجاہد جہان کا ثبات ہے

وہ جو میرے لیے شہید ہوئے اور میرے لئے غازی بنے انہوں نے معرکہ حق و باطل میں یہ ثابت کر دیا۔ پاکستان کی تاریخ شرف انسانیت اور فتوحات شرافت کا صحیفہ زریں ہے۔ فرونی دپامالی کا افسانہ ذلت نہیں ہے۔ پاکستان اپنی علمی، اخلاقی اور تمدنی قوت کے سامنے اغیار کا سر جھکانے کے لیے پیدا ہوا ہے جھکنے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔

ان کی ہر ضرب ضرب حیدری تھی۔ انہوں نے للکار دشمن کا دندان شکن جواب دینے سے اُسے بتا دیا کہ جنگ کا میدان شاعروں کی بزم خیال، منطقیوں کی مجلس اور خداع و فریب کے

فلسفہ کا مدرسہ نہیں۔ یہاں کی شعریت کا نام زخم اور منطق کا نام طاقت ہے۔ وہ سب دشمن کے زوال کے نقیب۔ اُس کی تخریب و تباہی کے علمبردار۔ اس کی فنا کے پیامی اور اس کی موت کا شعلہ فشاں سانس تھے۔

جنگ ستمبر میں دشمن نے سیالکوٹ پر جو حملہ کیا وہ مجھے ختم کرنے کے لیے دشمن کا سب سے بڑا خوفناک حملہ تھا۔ اس میں گورکھا فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کا نام دشمن نے آپریشن نیپال رکھا تھا۔

دشمن کو پورا پورا یقین تھا کہ اس کی مسلح افواج کا یہ سیل بلا کسی طرح نہیں رکتے گا۔ اور اس کی مسلح افواج چند ہی گھنٹوں میں پاکستانی افواج کی مزاحمت کو تاراج کرتی ہوئیں آگے نکل جائیں گی۔ لیکن دشمن کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے سامنے مرد آہن کی ایک ناقابل تسخیر فصیل کھڑی ہے۔

بھارت کے جنگی نیتاؤں کو یقین تھا کہ پاکستانی افواج اتنے بڑے حملے کی تاب نہ لا سکیں گی۔ دشمن کو عددی برتری پر ناز تھا۔ دشمن کے پاس اسلحہ کی بھی فراوانی تھی۔ دشمن نے یہاں ۵۰۰ سے زیادہ ٹینک میدان جنگ میں جھونک دیئے۔ تاکہ وہ چونڈہ پر اپنا تسلط قائم کر کے جی ٹی روڈ پر قابض ہونے کے بعد لاہور اور سیالکوٹ میں کھل کھیلنے کے لیے اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ختم کر دے۔ دشمن کے منصوبے بڑے بھیانک اور عزائم بڑے خوفناک تھے۔ جنہیں ۲۵ ویں کیولری رجمنٹ کے مرد آہن نے خاک میں ملا دیا۔

۲۵ کیولری رجمنٹ کے مرد آہن جنہوں نے جسراں، ڈوگرانی اور چونڈہ میں اپنی جرأت و ہمت کے بے مثال کارنامے دکھا کر ان محرکوں کی یاد تازہ کر دی جو ۱۲ سال پہلے طبرق، الامین اور بن غازی کے محاذ پر لڑے گئے۔ موت کی وادی میں آگ و خون کے سیلاب میں آگے بڑھتے ہوئے ان کے قدموں کو کوئی چیز نہ روک سکی۔

ٹینکوں کی وہ ہولناک جنگ جو چونڈہ کے میدان میں لڑی گئی بیسویں صدی کی دوسری

سب سے بڑی ٹینکوں کی لڑائی ہے جو صرف ایک دن میں لڑی گئی - جس میں مختصر پاکستانی فوج نے دشمن کے پانچ سو سے زیادہ ٹینکوں کا کچومر نکال کر دشمن پر اپنی بہادری اور حب الوطنی کی دھاک بٹھا دی - اس معرکے میں دشمن نے اپنی پوری قوت میدان جنگ میں جھونک دی تھی -

(۱) پونا ہارس جسے فخر ہند بھی کہتے تھے -

(۲) ۱۰۱ ویں کالا ہاتھی کیولری

(۳) ۴ ویں ہڈسن ہارس

(۴) ۶۲ ویں کیولری

(۵) ۷ کیولری

(۶) دوسری رائل لانسر

(۷) ۱۸ ویں کیولری

(۸) ۱۴ ویں انفنٹری ڈویژن

(۹) ۶ ویں پہاڑی ڈویژن

(۱۰) بکتر بند گاڑیوں کا انفنٹری بریگیڈ - اس کے علاوہ پانچ سو سے زیادہ ٹینک اور ان کی مدد کے لیے آرٹلری - ۳۰۰ میدانی توپیں جو ۲۵ پونڈ سے لے کر ۲۰۰ پونڈ تک گولہ پھینک سکتی تھیں - اس کے علاوہ ۵۰۰،۰۰۰ جدید ترین اسلحہ سے لیس سپاہی -

دنیا نے دیکھا کہ یہ خونریز معرکہ بھارتی فوج کی ایک ذلت آمیز شکست پر ختم ہوا - تاریخ اس کی شاہد ہے انہوں نے دشمن کے ناقابل تسخیر استحکامات کو ویرانہ عبرت اور اس کے ناپاک عزائم کو ان کا مرقد آرزو بنا دیا - دشمن کے پاس پر شکوہ استعاروں اور فصیح و بلیغ پُر پیچ لفظوں کا وافر سرمایہ تھا لیکن اپنی گویائی کے اسراف سے اپنے حوصلوں کی بے مائیگی اور عزم و ہمت کے افلاس پر پردہ نہ ڈال سکا -

فتح کی ایک فوجی تقریب میں اپنے بہادر اور فاتح جوانوں کو اعزازات تقسیم کرتے ہوئے افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف نے کہا۔

Your Valour, heroism and chivalry will illuminate the pages of history. And the deeds you have performed on this battle fleld will be ever-lastingly written in the book of Pakistan thes words are a compelling epitaph of what the Indian Army had fondly baptised "operation Nepal".

یہی لوگ میری عظمت کے نشاں ہیں۔ یہی لوگ جرأت وہمت کے سنگ میل ہیں۔ یہی لوگ نشانِ حیدر۔ ہلال جرأت۔ ستارہ جرأت ہیں۔ یہی وہ سرفروش ہیں جو آگ اور خون کے سیلاب میں یہ کہتے ہوتے بڑھے تھے۔

دہر میں عظمت اسلام کریں گے زندہ
تیرے گلزار تیری صبح بہاراں کی قسم
اپنے اسلاف کا پیغام کریں گے زندہ
تیرے جلووں ترے عارضِ تاباں کی قسم
یوں مریں گے کہ ترا نام کریں گے زندہ
ترے سورج ترے ماہتاب درخشاں کی قسم
یعنی دھندلی تری تصویر نہ ہونے دیں گے
اے وطن ہم تمہیں دلگیر نہ ہونے دیں گے

اور ایک تم ہو کہ میرے وجودِ معنی پر زخم پر زخم لگائے چلے جاتے ہو۔ تم جن کا کوئی ملک نہیں۔ کوئی سرحد نہیں۔ کوئی جذبہ نہیں۔ کوئی نصب العین نہیں۔ تم مجھے

ایک فحشہ عورت سمجھتے ہو اور میری بوٹی، بوٹی کو اپنی حرص و ہوس کے پنجوں سے نوچ رہے ہو۔ میرے حسن و شباب سے کھیل رہے ہو۔ میری حیثیت تمہاری نظروں میں ایک پیشہ ور عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جبکہ تمہارا پیشہ میرا سرمایہ حیات لوٹنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایسی بدکار اور بدچلن اولاد شاید ہی کسی مادر وطن کی ہو۔

عیش و عشرت کے متوالو۔ عقل کی شرکت میں اپنی غلط کار رائے پر نظر ثانی کرو۔ مجھے موت کے جبڑوں میں نہ جھونکو۔ میری اطاعت ہی میں تمہاری زندگی ہے۔ میری بقا ہی سے تمہاری بقا ہے۔ سکاچ وہسکیوں سے لبریز ساغروں اور بیل باٹم لڑکیوں کی نیلی نیلی آنکھوں کی نیلمیں جھیلوں میں ڈوب جانے والو اگر اپنا سراغ پانا ہے تو میری محبت میں ڈوب جاؤ۔ مجھے پاکر ہی تم اپنے آپ کو پا سکو گے۔ بنک بیلنس سے نہیں مجھ سے پیار کرو۔ میں ایک لازوال دولت ہوں۔ ایک ایسی دولت جسے نہ آگ جلا سکتی ہے۔ نہ پانی بہا کر لے جا سکتا۔ مار دھاڑ اور معاشی لوٹ کھسوٹ سے اپنے لئے نگارستان عیش نہ بناؤ مجھے بناؤ۔ میں ہی وہ تاج محل ہوں جس میں تمہاری موت کے بعد تمہاری روحیں نکہت و نور میں آسودہ راحت رہیں گی۔ اگر میں نہ رہا تم بھی نہ رہو گے۔ اپنے چاروں طرف معاشی قدغیں لگا کر سارے معاشرے کی دولت سمیٹنے والے قارون کے بیٹو اگر میں تم سے چھن گیا تو یہ خزانے اور دفینے بھی تم سے چھن جائیں گے جن پر تم دولت کے سانپ بنے بیٹھے پھنکار رہے ہو۔ تم نے مجھے جس لگن سے بنایا تھا تمہیں تو بس میرے ہی دیوانے ہونا چاہیئے تھا دولت کے دیوانے کیوں بنے جاتے ہو؟

آدھا چاند

مجھے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا شیطنی عمل بجائے خود اپنے پیچھے ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ بھارت نے آج تک مجھے ایک حقیقت تسلیم نہیں کیا۔ وہ روزِ اوّل ہی سے مجھے سبوتاژ کرنے کے منصوبے بناتا چلا آ رہا ہے۔ میرے ساتھ اس کا یہ تاریخی بغض و عناد، یہ حقارت و نفرت اس کا مذہبی و قومی سرمایہ ہے۔ اس نے اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر قیامِ پاکستان کے بنیادی نظریے کو ہمیشہ نہ صرف بدنام بلکہ غتر بود کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ پاکستان دراصل بھارت کے لیے نو کروڑ پاکستانیوں کا آئیڈیالوجیکل چیلنج ہے۔

ایک ملک جو صفر سے شروع ہوا اس کے خلاف عالمی سطح پر شروع ہی سے سازشیں شروع ہو گئیں۔ جن کا مکمل اور تفصیلی جائزہ رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک نہایت ہی مختصر سا ملک اپنے نہایت ہی محدود ذرائع و رسائل کے باوجود صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دینے والی کٹھن اور مسلسل آزمائشوں کے تلاطموں سے کیونکہ سینہ سپر گزرا ہے اور ابھی تک زندہ ہے اور یہ وہ عجیب و غریب منطق ہے جو کسی سیاست کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

بھارت کی ریشہ دوانیاں پہلی بار ۱۹۶۷ء میں منظرِ عام پر آئیں۔ جبکہ اگرتلہ سازش کا انکشاف ہوا۔ متعدد گواہوں نے حلفاً بیان کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اس سازش میں ستمبر ۱۹۶۴ء میں ملوث ہو چکے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن جو موافق حالات و واقعات کی رو میں بہتے ہوئے مشرقی پاکستان کی سیاست کا محور بن گئے۔ ایک ایسے سرخ و سفید سامراجی انقلاب کے بانی تھے جس میں مشرقی پاکستان میں شری چانکیہ جی کا ارتھ شاستر رنگ لایا۔ بھائی نے

بھائی کے گلے پر چھری چلائی - اپنوں نے اپنوں کو لوٹا۔ مسلمانوں نے مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کی عصمت لوٹی اور ان کے گھروں کو جلایا پھونکا اور جو نہ ہونا چاہیے تھا مشرقی پاکستان میں برہمن بدھی کی بدولت ہو گیا۔

میرا ایک حصّہ مجھ سے کٹ گیا - میرے آدھے حصّہ جسم پر فالج گر گیا- وہ مفلوج ہو گیا - آدھا چاند گہنا گیا۔

ستمبر ۱۹۶۴ء میں شیخ مجیب الرحمٰن نے سازشیوں کے ایک اجلاس میں شرکت کی تھی جو کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کرنے کے لیے ایک انقلابی تنظیم قائم کی گئی تھی - جس نے آگے چل کر اگرتلہ سازش کو جنم دیا۔

اگرتلہ سازش کا اہم منصوبہ یہ تھا کہ اسلحہ خانوں پر قبضہ کر کے پاکستانی فوجی یونٹ مفلوج و معطل کر دیئے جائیں ۔ یہ کام وہ کمانڈو کے انداز میں کرنا چاہتے تھے اور اچانک اقدام ہی سے افرادی قوت کی کمی پوری کی جا سکتی تھی۔ اپریشن کا کام طے کرنے کے لیے علیحدگی پسندوں اور بھارت کے نمائندوں کا اجلاس اگرتلہ میں ۱۲ر جولائی ۱۹۶۷ء کو ہوا۔ لیکن بروقت اس سازش کا انکشاف ہو جانے سے ان سازشیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں شیخ مجیب الرحمٰن بھی تھے۔

گرفتار ہونے والے سازشیوں میں سے ایک نے انکشاف کیا کہ بھارت نے ہتھیار اور مالی امداد فراہم کرنے کے علاوہ مشرقی پاکستان میں بغاوت منظم کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ بھارت نے کہا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان میں مسلح بغاوت سے پہلے مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان سے ملانے والے بحری اور فضائی راستے بند کر دے گا۔

یہ سازش ——— یہ تحریک جب تک شیخ مجیب اور دوسرے سازشی قید رہے وقت کے تابوت میں کسی خون آشام حنوط ممی کی طرح پڑی رہی۔ لیکن سازشیں اور تحریکیں جب تک انسانوں کے ذہنوں اور دلوں سے کرید کرید کر

اور طرح طرح کر نہ نکال دی جائیں محض ان کے لیڈروں، رہنماؤں اور کارکنوں کو قید کر دینے سے مفقود و محو نہیں ہوا کرتیں۔

ملک میں اقتدار حاصل کرنے کی رسہ کشی کا ایک اور ابتدائی دور شروع ہوا تو شیخ مجیب پھانسی کے تختے سے مشرقی پاکستان میں اقتدار کے تخت پر جا بیٹھے اتفاقات ہیں زمانے کے۔ اس اعتبار سے وہ بڑے خوش نصیب تھے کہ دو بار پھانسی کا پھندا ان کے گلے کو چھو کر واپس لوٹ گیا۔ تو مشرقی پاکستان میں پھر وہ سب کچھ ہوا جو اگر شیخ مجیب نہ ہوتے تو شاید کبھی نہ ہوتا۔

انسانی سوسائٹی میں اختلافات طبعی و فطری امر ہیں۔ خود ہماری اپنی تاریخ میں اختلافات کب نہ تھے۔ ایک چھوٹے سے ملک کے طبعی و فطری اختلافات کو بہانہ بنا کر دنیا بھر کی استعماری طاقتیں اس ملک کی قسمت سے کھیلنے پر تل گئیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلیویژن اور ابلاغ عامہ کے دوسرے ذرائع مشرقی پاکستان میں ایک سوچے سمجھے پلان کے زیر اثر اس لیے استعمال کئے گئے کہ بھائی کو بھائی سے بدظن کر دیا جائے۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے کہے کہ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں جبکہ حقائق کی دنیا میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی اگر وہ کٹ نہ گیا ہو اشد ضرورت ہوتی ہے۔

کسی اور ملک میں علیحدگی پسندی کی تحریک چلے تو عالمی رائے عامہ کے سائرن سو جاتے ہیں لیکن جب مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش۔ علیحدہ دیش کا نعرہ بلند ہوا تو عالمی رائے عامہ کے کسی سائرن کو نیند نہ آئی۔ وہ اس قدر اونچی آواز میں چیخنے لگے۔ کہ اس سے پہلے کبھی اتنی اونچی آواز میں نہ چیخے تھے۔ علیحدگی پسند عناصر مشرقی پاکستان میں اشتراکیت پسند اسٹراٹیجک ریاست کے وجود پر اشتراکی تکنیک کی روشنی میں مختلف سمتوں سے غور کرنے لگے تو بین الاقوامی زیر زمین سیاسی گردابوں کی گونج بھی سنائی دینے لگی۔

اگرتلہ سازش میں بھارت نے سازشیوں کو یقین دلایا تھا کہ جونہی وہ گڑبڑ

شروع کریں گے۔ بھارت مشرقی پاکستان میں مسلح بغاوت سے پہلے مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان سے ملانے والے بحری اور فضائی راستے بند کردے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ فروری ۱۹۷۱ء میں بھارت نے اس منصوبے پر عمل کرنے کا بہانہ تراش لیا۔ اس کے دو ایجنٹ مقبوضہ کشمیر سے ایک بھارتی طیارہ ڈرامائی انداز سے اغوا کر کے لائے۔ انہوں نے ایک بھارتی فوکر Fokker کیا اور لاہور ایئرپورٹ میں اتار دیا اور ایک دن بعد اس کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس طیارے کو اغوا کرنے والے دو ضمیر فروش مسلمان تھے۔ ننگ اسلام۔ ننگ وطن۔۱۱

بھارت نے اس واقعہ کو بڑی ہوا دی اور جب زمین تیار ہو گئی تو پی آئی اے کے طیاروں کو اپنے علاقے پر سے اڑنے سے روک دیا اور اس کے ساتھ ہی مغربی بنگال میں بھارتی فوج کی نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ بہانہ الیکشن کا بنایا لیکن الیکشن ختم ہونے کے بعد مارچ ۱۹۷۱ء میں اس کی مزید فوجیں مغربی بنگال پہنچ گئیں اور مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر مجتمع ہونے لگیں۔ پوری سات ڈویژن فوج نے مشرقی پاکستان کو گھیر لیا۔ بین الاقوامی سازشوں کے پس منظر میں مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

اس اثنا میں بھارتی فضائیہ اور چھاتہ فوج بھی حرکت میں آ گئی۔ نہ صرف یہی بلکہ بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس کی ۲۵ بٹالین مشرقی پاکستان کی سرحد پر پہنچ گئی۔ جیپوں اور گاڑیوں کے فوجی نشانات مٹا کر ان پر سنہری نشان لگا دیئے گئے تاکہ یہ فوجی مشرقی پاکستان میں چوری چھپے گھس کر باغیوں اور سازشیوں کی مدد کر سکیں۔

پھر بھارت نے اپنے چنگل سمندر کی طرف بڑھائے اور مشرقی پاکستان جانے والے بحری جہازوں کو روکنا اور ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ بھارتی بحریہ کے جہاز کھلے سمندر میں پاکستانی جہازوں کا تعاقب کرنے لگے۔ اس آپریشن میں بھارت نے زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل چھوڑنے کی مشق شروع کر دی یہ میزائل جنوبی ساحل پر نصب تھے اور ۱۲۳ میل تک مار کر رہے تھے۔

اس طرح مشرقی پاکستان جانے والے پی آئی اے کے طیارے مزید جنوب کی طرف پرواز کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ادھر بھارتی فضائیہ نے قبل از جنگ فضائی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اس کے ہنٹر طیارے مشرقی پاکستان کے مشرقی ساحل پر لگاتار پروازیں کرنے لگے اور خلیج بنگال میں پاکستانی جہازوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے انہیں کلکتہ کے قریب بارک پور میں متعین کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی بھارتی بارڈر فورس کے سپاہی مشرقی پاکستان میں گھسنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ علیحدگی پسندوں کو اسلحہ اور گولہ بارود بھی چوری چھپے پہنچنے لگا۔ ایشیا پور رائفل فیکٹری کی بنی ہوئی رائفلیں بھاری تعداد میں پکڑی گئیں۔ گولہ بارود اور دوسرا جنگی سامان ان کے علاوہ تھا۔ جن پر کرکی فیکٹری کی مہریں لگی تھیں۔ اس آپریشن میں بھارتی فوج کی متعدد بٹالینوں نے حصہ لیا۔ جن کی قیادت بھارت کے سینئر افسر کر رہے تھے۔

سرحدی علاقوں میں پناہ گزینوں کے کیمپ بھی اعلیٰ فوجی افسروں کے ایما پر قائم کئے گئے۔ جنہیں مداخلت کاروں کے لیے بیس (Base) کیمپ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہیں سے ملک دشمن عناصر کی سپلائی جاری رہی اور یہیں پر شرپسندوں اور گھس بیٹھوں کو فوجی ٹریننگ دی جانے لگی۔

اس دوران میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے رفقائے کار کو عوامی لیگ کے ذریعے ضرورت سے زیادہ اہمیت ملی اور جلد ہی وہ مرحلہ آگیا جس میں وہ مشرقی پاکستان کی سیاست کا محور بن گئے۔

عوامی لیگ نے اس فوجی مہم کا منصوبہ بہت پہلے بڑی احتیاط کے ساتھ بنایا تھا۔ نام نہاد فوجِ آزادی کا پہلا نشانہ چٹاگانگ تھا۔ اس مہم میں بیرونی ذرائع شرپسندوں کو اسلحہ سپلائی کرتے رہے۔ پاکستانی فوج کی کارروائی نہتے اور معصوم شہریوں کے خلاف نہ تھی۔ جیسا کہ بھارتی پریس اور ریڈیو دنیا کو باور کراتے رہے۔ بلکہ وہ اسی قسم کے مسلح باغیوں اور مداخلت کاروں کے خلاف حرکت میں آئی تھی۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ نے چھ نکات کو پارٹی منشور کی حیثیت سے پیش کر کے حصہ لیا اور ۹۸ فیصد نشستیں حاصل کر لیں۔ اس حیرت انگیز کامیابی پر اس سیاسی جماعت کی ہائی کمان جامے سے باہر ہو گئی۔ اس نے میرے جسم کے ایک حصے کو کاٹ کر جلد سے علیحدہ کر دینے کے اعلانیہ بیانات دینے شروع کر دیئے۔

قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا پر عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں متوازی حکومت قائم کر کے سول نافرمانی کی ایسی تحریک چلائی جو اعلانیہ بغاوت کے مترادف تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کی شرمناک مہم چلائی گئی۔ پاک فوج کو مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا راشن بند کر دیا گیا۔ نظام رسد میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ چھاؤنیوں میں دکانداروں نے اشیاء فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ پاک فوج کا کوئی سپاہی افسر تنہا شہر میں چلا جاتا تو اس پر گالیوں کی بارش ہوتی۔ اس کی ذلت و رسوائی کے تمام حربے بروئے کار لائے جاتے۔ بعض مقامات پر ان کو زدوکوب بھی کیا گیا۔ شرپسندوں، دہشت پسندوں، تخریب کاروں کا اصل ہدف پاکستانی فوج تھی اور وہ بتدریج پاک فوج کے اردگرد گھیرا تنگ کیے جا رہے تھے۔ ۲۳ مارچ کے واقعات نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستان کا وجود بڑے خطرے میں ہے۔

پاکستانی پرچم ——— میرا پرچم ——— تمہارا پرچم ——— ہم سب کا پرچم ایک منظم سازش کے تحت پورے مشرقی پاکستان میں جگہ جگہ جلایا گیا۔ چند مقامات کے سوا ہر جگہ بنگلہ دیش کا جھنڈا نظر آنے لگا۔ قائداعظم کی تصویر کی بے حرمتی کی گئی گلی کوچوں میں نعرے لگائے گئے۔

جئے بنگلہ ———!!

آمار شونار بانگلہ ———!!

اے پار بنگلہ او پار بنگلہ۔ روٹی ملی سونار بنگلہ ———!!

پورے صوبے میں دہشت پسندوں، علیحدگی پسندوں نے کہرام مچا دیا۔ ان کی دست درازیاں محبان وطن کی عزت و آبرو تک جا پہنچیں۔ ایسے مخدوش حالات میں فوجی آپریشن کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔

اس عسکری عمل کے وقت مشرقی پاکستان کے ۵۴ ہزار مربع میل میں سے فوج مشکل سے ۲۰ مربع میل پہ قابض تھی۔ پاک فوج کی تعداد دس بارہ ہزار سے زائد نہ تھی بلکہ لڑنے والی نفری اس سے بھی کم تھی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں پونے دو لاکھ مسلح افراد تھے۔ جن کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ اس کے علاوہ بھارتی فوجیں مختلف مقامات سے پاکستانی سرحدوں میں بہت دور تک گھس آئی تھیں اور باغیوں نے متوازی حکومت بنا لی تھی۔

۲۱ر نومبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر اعلان جنگ کئے بغیر زبردست حملہ کر دیا اور پھر ۳ر دسمبر کو بھارت نے مغربی پاکستان پر جارحانہ حملہ کر دیا۔

پاک فوج کے جیالے جن کا ذکر زبان پر آتے ہی ہمیشہ میری گردن فخر سے بلند ہو جاتی ہے، قدم قدم پر ڈٹ کر لڑے۔ انہوں نے وطن عزیز کی حفاظت کرتے ہوئے زخم پر زخم کھائے۔ اس خیال سے کہ میرے جسم کا ایک حصہ نہ کٹ جائے انہوں نے اپنے بازو اور ہاتھ کٹوائے۔

اعضا صرف گھمسان کے معرکوں ہی میں کٹا کرتے ہیں وہ ہر معرکے میں آتش نمرود میں کود ے۔ جل بھومی ٹینکوں سے ٹکرائے۔ انہوں نے دس ہزار پیرا ٹروپر زکو چھاتہ برداروں کو بے بس کر دیا۔ حالانکہ انہیں کوئی ہوائی / فضائی تحفظ (Air cover) میسر نہ تھا۔ جبکہ دشمن طیارے ہر پانچ منٹ کے بعد ڈھاکہ اور دوسرے شہروں پر ہوائی حملے کرتے رہے۔

وہ گھنے گنجان جنگلوں، دریاؤں، ندیوں اور جھیلوں پر لڑے، میدانوں میں لڑے اور آخری دم تک لڑے۔ وہ تنہا لڑے۔ وہ کسی بیرونی امداد کے بغیر لڑے۔ انہوں نے قدم قدم پر قربانیاں دیں۔

انہوں نے میری آزادی، میری عظمت کی قسم کھا کر عزم کر لیا تھا کہ وہ لڑیں گے۔ لڑتے رہیں گے۔ آخری دم تک لڑتے رہیں گے۔ لڑتے لڑتے شہید ہو جائیں گے مگر دشمن کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں گے۔ لیکن اچانک انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے جبکہ بڑی طاقتوں کے ایٹمی بحری بیڑے مشرقی پاکستان کے ساحل سے دور کھڑے راک اینڈ رول میں مصروف رہے۔ عالمی رائے عامہ کا کوئی سائرن نہ چیخا۔ ان سب پر سناٹا طاری تھا۔ سکوت مرگ طاری تھا۔ جب کبھی کوئی قوم کسی دوسری قوم کی جارحیت کی چتا کے شعلوں میں دھڑ دھڑ جل رہی ہوتی ہے۔ عجیب بات ہے عالمی رائے عامہ کا کوئی سائرن نہیں چیختا۔ مشرقی پاکستان کے سقوط کا سانحہ مختلف عالمی سازشوں کے رسوا کن واقعات سے مربوط تھا۔

سقوط ڈھاکہ کے فوراً بعد بنگلہ دیش میں غنڈے اور قاتل غراتے اور اپنے خونخوار دانت تیز کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ کیونکہ لوٹ مار، قتل و غارت اور ظلم و ستم کا اندھیرا سارے ملک پر چھا رہا تھا۔ قاتلوں اور درندوں کی رسوائے زمانہ تخریبی تنظیم مکتی باہنی کئی باہنیوں میں بٹ گئی۔ مکتی باہنی ۔ چکتی باہنی ۔ سولہ باہنی ۔ لال باہنی ۔ اور ایسی ہی کئی باہنیاں بنگلہ دیش کے گلی بن اور سندر بن سے نکل آئیں۔ بنگلہ دیش کے بن مانس، چیتے اور تیندوے ہنستے انسانوں کو چیرنے پھاڑنے لگے۔ ان غنڈوں اور قاتلوں نے ہزاروں مسلمانوں کو نہایت بے دریغی سے قتل کیا۔ سینکڑوں مسلمان خواتین کو اغوا کیا۔ میں اس وقت بھی خون کے آنسو رویا تھا جبکہ تقسیم پر ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تھا جبکہ ہزاروں مسلمان عورتیں اغوا ہوئیں اور ان کو چیرا پھاڑا گیا اور پھر چھبیس سال بعد اس وقت بھی میری آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپک رہے تھے جبکہ یہ سب کچھ اس صوبے میں ہو رہا تھا جس کو کچھ مشترکہ طاقتوں کی جارحیت نے میرے جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا اور یہ قتل عام، اغوا کی یہ وارداتیں میرے لیے اس لیے زیادہ تکلیف دہ تھیں کہ اس قتل عام اور وسیع تر زنا بالجبر میں کافروں کے ساتھ مسلمان بھی شانہ بشانہ شریک

تھے اور اپنے بھائیوں ہی کی عزت کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ اپنے بھائیوں ہی کا خون اپنے ہاتھوں سے بہا رہے تھے۔ اپنی بہنوں ہی کو Rape کر رہے تھے معلوم نہیں اس خونی انقلاب کے بانیوں کو تاریخ انسانیت کن ناموں سے موسوم کرے گی۔

فوجی آپریشن کے دوران جو لوگ انخلا میں مشرقی پاکستان سے فرار ہو کر سرحدی ریفیوجی کیمپوں میں پہنچے تھے ان کے ساتھ بھارتی فوج کے سپاہیوں نے یہ سلوک کیا کہ مسلمان پناہ گزینوں کی لڑکیوں کو حاملہ کر دیا اور جب یہی پناہ گزین معافی مل جانے پر واپس لوٹ رہے تھے بھارتی پراپگنڈے کے سارتوں نے یہ شور مچانا شروع کر دیا کہ ان لڑکیوں کو پاک فوج کے سپاہیوں اور مشرقی پاکستان میں مقیم پنجابیوں نے حاملہ کر دیا ہے۔ حاملہ ہونے والی لڑکیوں کی تعداد چھ سات ہزار سے زیادہ تھی۔

میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور رو رہا تھا اور افسوس کر رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ میگھنا اور پدما کی دھرتی پر راونوں کا راج تھا۔ کالی بیساکھی، پانی کا طوفان جب بھی آتا ہے۔ بنگلہ دیش میں سینکڑوں زندگیاں سمیٹ کر لے جاتا ہے لیکن اس سے خوفناک سیاہی کال بیساکھی نہ اس سے پہلے کبھی آیا اور شاید نہ آئندہ کبھی آئے گا۔

پاکستانی افواج کے ہتھیار پھینکتے ہی مشرقی پاکستان میں قتل و غارت کا بازار پھر سے گرم ہو گیا تھا۔ ہر طرف آگ برسنے لگی تھی۔ موت کے گھاٹ اترتے ہوئے بے گناہ انسانوں کی دردناک چیخوں اور دھماکوں اور سنسناتی ہوئی گولیوں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ خاص کر ڈھاکہ میں تو ایک قیامت برپا تھی۔

گلیوں اور بازاروں میں غیر بنگالیوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ جا بجا خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کے انبار لگے تھے۔ محب وطن پاکستانیوں کا قتل عام کیا جا رہا تھا۔ رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں پاک فوج کے

جنرل نے بھارتی فوج کے جنرل کو اپنا ریوالور اور پیٹی دیتے ہوئے شکست کے کاغذات پہ دستخط کئے تو میرے دل سے ایک چیخ نکل گئی لیکن تم نہ چونکے بدستور اس آسیب زدہ بیند میں ڈوبے رہے۔

پاک فوج کے قیدی سپاہیوں کو سنگینوں کے کچوکے دے دے کر بھیڑ بکریوں کی طرح ڈھاکہ کے بازاروں میں ہانکا گیا۔ ان پہ گولیاں چلائی گئیں۔ وہ زخمی بھی ہوئے اور شہید بھی۔

دنیا کی کسی فاتح فوج نے مفتوح جنگی قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا ہوگا جو بھارتی فوجوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا۔

۹۰ ہزار پاکستانی سپاہی جنگی قیدی بن گئے۔ میرے ۹۰ ہزار سپوت، میرے سرفروش جیالے بیٹے دشمن کے جنگی کیمپوں میں چلے گئے تو میرا چین و قرار بھی انہی کے ساتھ چلا گیا۔ وہ جب تک قید رہے میرا ہر سانس ان کی یاد میں ٹپکتا ہوا ایک پھوڑا بن گیا۔ جس کی ٹیسیں مجھے کسی پہلو چین نہ لینے دیتی تھیں۔ ان کے بغیر مجھے یہ زندگی، زندگی نہیں فریب زندگی معلوم ہو رہی تھی۔ میری اٹھائیس سالہ مدت حیات میں میرے ہلال کو دو بار گرہن لگا ہے۔ ایک بار ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء میں جس دن میرے معمار اعظم بابائے ملت کا انتقال ہوا اور دوسری بار سقوط ڈھاکہ پر جبکہ میرے ۹۰ ہزار جیالے سپوت جنگی قیدی بنائے گئے۔

ایک جنگ ——————!

جو جیتی جا رہی تھی لیکن ایک ذلت آمیز شکست بن کر رہ گئی۔ جس کے اسباب تمہیں جانباز و سرفروش عساکر کی معرکہ آرائیوں میں نہیں، ان حالات و واقعات کے مد و جزر میں تلاش کرنا ہوں گے جن پہ ہنوز دھندلکے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور ان بجلیوں کی ہولناک صدائے بازگشت سے ابھی تک گونج رہے ہیں۔ جو ایک آشیانے کو جلا کر راکھ کر چکی ہیں۔

ایک المیہ ——————!

جو ایک فرد ایک گروہ کا المیہ نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کا ایک روح فرسا المیہ ہے۔ یہ المیہ کیوں اور کیسے رونما ہوا یہ سوچنے سمجھنے کے لیے تمہیں ملکی و ملی سطح پر یہ بھی سوچنا سمجھنا ہوگا کہ قوم اس گرہن کے اندھیرے میں کدھر چلی جا رہی ہے اور اس کی منزل کہاں ہے اور کہ میں، تمہارا وطن عزیز اس وقت جن سنگین مسائل سے دوچار ہے ان کا حل کیا ہو سکتا ہے؟

اور میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ عساکر پاکستان کے بے مثال عسکری کارناموں کے ساتھ ساتھ ملک و ملت کو درپیش الجھے ہوئے مسائل اور تلخ حقائق پر غور و فکر کرنے کی دعوت فکر و عمل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

بس ایک تحریک بیداری —!

اور پوری قوم کے لیے ایک انتباہ بھی۔ کیونکہ مغربی پاکستان میں بھی بدستور وہی کچھ ہو رہا ہے جو مشرقی پاکستان کے ہاتھ سے نکلنے سے پہلے ہوا تھا۔ قوم میں خلفشار و انتشار، اختلاف و تفرقہ بازی اور ملک دشمن سرگرمیاں اپنے پورے عروج پر ہیں۔ یوں جان پڑتا ہے جیسے انہوں نے اس المیے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اس شکست سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ اپنی بقا اور ملک کی سالمیت کے لیے کوئی لائحہ عمل تجویز نہیں کیا۔ جبکہ وقت کا تقاضا ہے کہ تم سب ایک ہو کر باہمی اختلافات یکسر مٹا دو۔ اور تباہی و بربادی کے اس طوفان کا رخ بدلنے کے لیے سینہ سپر ہو جاؤ جو مغربی پاکستان کے دروازے پر اپنی جملہ ہولناکیوں کے ساتھ اپنی پوری شدت سے دستک دے رہا ہے۔

یہ دنیا ایک رزم گاہ ہے۔ یہ فلسفہ کسی فلسفی کی فکری و نظری اختراع و ایجاد ہی نہیں بلکہ حقیقت و واقعیت ہے کہ کائنات بسیط و بیکراں میں ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک مختلف قوتیں برسرپیکار ہیں اس رزم گاہ حیات میں تنازع البقاء Strugle for Existance کا تعمیری و تخریبی عمل جاری ہے۔ تعمیری کم اور تخریبی زیادہ۔ اس کائنات میں زندگی کی بنیاد تھی تو موافقت پر

لیکن اس کو نزاع پر قائم کر دیا گیا۔ قوی ضعیف کو نگل جانے پر تلا ہوا ہے۔
ہر بڑی قوت چھوٹی قوت کو اپنے اندر سمو لینے پر تلی ہوئی ہے۔ اس ہنگامہ
کشت و خون میں فقط وہی زندہ رہ سکتا ہے جو دوسروں کے مقابلے میں
زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بقائے اصلح کا فطری ضابطہ ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

شبنم شبنم پھول کھلے

خالق کائنات نے فرمایا ہے۔

"یقیناً ایماندار تمام بھائی بھائی ہیں۔ اے ایمان والو۔ مذہب اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پہ نہ چلو۔ کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اللہ کی رسی کو سب مل کر تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑنا۔ اور ان کی طرح نہ ہونا جو فرقے بن گئے۔ اور اختلاف میں پڑے جب کہ ان کے پاس کھلی ہدایات آئیں اور وہ ایسے ہیں جن کے لئے عذاب عظیم ہے۔"

میرے تاریخی شہر لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہ کانفرنس کے تاریخ ساز موقع پر بتیان رنگ و بو کو توڑ کر ایک ملت میں گم ہونے کا مژدہ جانفزا سنانے کے لئے عالم اسلام کی مقتدر ہستیاں جمع ہوئیں۔ اور تمام اختلافی مسائل کو یکسر فراموش کر کے اتحاد عالم اسلام، باہمی افہام و تفہیم اور محبت و اخوت کے جذبے کے فروغ کے لئے سر جوڑ کر بیٹھیں۔ بہت سے اجتماعی اور انقلابی فیصلے کئے گئے۔ میں اسلامی اتحاد و ارتباط کے اسی عظیم اجتماع کا ذکر کر رہا ہوں۔

زچاک سینہ آہے می نویسم
کتابم حرف ماہے می نویسم
محبت نامہ پرواز است امروز
شرر بر برگ کاہے می نویسم

میرے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ مجھے ملت اسلامیہ کے برادر ملکوں کے سربراہوں، رئیسوں، حکمرانوں، سلطانوں، شہنشاہوں اور لیڈروں کی میزبانی کا

شرف حاصل ہوا۔ یہ اسلامی کانفرنس میرے لئے انتہائی مسرت و محبت کا باعث تھی۔ مجھے اپنے معزز و برگزیدہ مہمانوں سے مل کر جو خوشی ہوئی اس کا اظہار کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ موجود نہیں۔

اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک نشان ضرور تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو وہ کسی انسانی، تفریق و تقسیم کی حد قرار نہیں دیتا۔ تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق سے متصل کرتا ہے۔ جو ایک ہے۔ پس اس کو ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو ایک دوسرے سے جدا ہی کیوں نہ کر دیا ہو۔ ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک کتاب۔ یہی اسلام کی وہ عالمگیر اخوت اور داعی اسلام کی دعوت تھی۔ جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کر دیا تھا۔ اسلام نے حجاز کے لق و دق ریگستانوں میں ظہور کیا، مگر صحرائے افریقہ میں بھی اس کی آواز بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبل بوقبیس کی گھاٹیوں سے اٹھی مگر دیوار چین سے لا الہ الا اللہ کی بازگشت گونجی۔ یہ تمام دنیا کی مختلف قومیں زمین کے دور دراز گوشوں میں بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کا چراغ تھیں۔ یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی تھی۔ ہر وہ انسان جس نے کلمہ طیبہ کا اقرار کیا اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ وہ مصری ہو، خواہ نائیجریا کا سیاہ فام حبشی، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ اگر وہ مسلم ہے تو خاندان توحید کا ایک فرد ہے۔ ایک عضو ہے۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ لیکن یہ رشتہ اسلام کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے روٹھ جائے۔ بعید نہیں کہ ایک ماں اپنی گود سے بچے کو الگ کر دے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے خون اور نسل کے باندھے ہوئے تمام پیمان وفا ٹوٹ جائیں مگر جو رشتہ مسلمان کو مسلمان سے پیوست و یک جان کرتا ہے دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں توڑ سکتی۔ اور یہ اس زنجیر اخوت کو کاٹ سکتی ہے۔ جس میں خدا کے ہاتھوں نے

انسانوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا ہے۔ جب تک اسلام دنیا میں موجود رہے گا یہ وحدت و اخوت بھی موجود رہے گی۔ اور یہ اخوت و وحدت خون نشاں ہلال کی صورت میں اسلام کے معرض وجود میں آنے سے لے کر اب تک یہ اعلان کرتی چلی آ رہی ہے کہ اگر کسی ایک مسلمان پر بھی تلوار اٹھائی گئی تو دنیا کے چالیس کروڑ مسلمانوں کی تلواریں اس کی حمایت میں یکایک اٹھ جائیں گی۔ یہ اخوت مسلمان کی میراث ہے۔ اس کا ورثہ ہے۔

۲۲۔ فروری ۱۹۷۴ء کو دنیائے اسلام کے جو زعماء میرے معزز مہمان بن کر تشریف لائے وہ بلاشبہ مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا سیاسی و اقتصادی نظام جدا جدا ہے۔ ان کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ رنگ اور نسل کے اعتبار سے بھی وہ مختلف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب ایک ہیں۔ ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں ان کا ماضی مشترک ہے ان کے مستقبل کے عزائم یکساں ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ سب ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے رشتہ اخوت میں منسلک ہیں جو تمام امتیازات اور اختلافات سے بالاتر ہیں ایک ابدی رشتے میں منسلک ہیں۔

یہ سربراہی اسلامی کانفرنس میری تاریخ میں ایک عظیم تاریخ ساز واقعہ ہے۔ یہ برصغیر میں مسلم عوام کی احیائے اسلام کی اس تحریک کا حصہ ہے جس کا خواب سید جمال الدین افغانی نے دیکھا۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے اس کی تعبیر پیش کی اور قائداعظم محمد علی جناح نے اس کے لئے برصغیر میں ایک ایسی ریاست تشکیل کی جس کی بنیاد و اساس لا الہ اللہ الا ہے۔ اور بنیادی مقصد اتحاد عالم اسلام۔

اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کے لئے پاکستان کے کسی اور شہر کو بھی منتخب کیا جا سکتا مگر لاہور کو یہ اعزاز اس لئے حاصل ہوا کہ یہ شہر صدیوں اسلامی تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کا مرکز رہا۔ اس شہر میں ۲۲، مارچ ۱۹۴۰ء کو بابائے ملت حضرت قائداعظم علیہ الرحمتہ کی زیر صدارت وہ انقلاب انگیز و انقلاب آفریں قرارداد منظور ہوئی جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان یعنی میرے قیام

کی نہج وہ اساس بنی جس کی یادگار کے طور پر مینار پاکستان اقبال پارک میں ایستادہ ہے جہاں ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کا ایک انقلابی اجلاس ہوا۔

عالم اسلام کا یہ مبارک اتحاد مسلمانان عالم کے لئے ایک نیک فال تھا۔ اس اتحاد سے مسلمانوں کے لئے کامیابی اور عظمت کی راہیں کھل گئیں۔ مسلمان حکومتوں کا اجتماع مسلمانوں کے لئے بڑا مبارک اور باعث خیر و برکت ثابت ہوا۔ وہ اپنے مشترک مسائل کو حل کرنے اور ایک دوسرے کی ترقی میں مددگار بننے کے لئے باہم مجتمع ہوئے اور پھر مزید ایک مفید ترین پہلو اس اجتماع سے یہ بھی نکلا کہ دنیا بھر کے مسلمان بڑی طاقتوں کی بین الاقوامی کش مکش کے تباہ کن اثرات سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے متحد ہو گئے۔ طاقت ور کا قائم رہنا اور کمزور کا مٹ جانا ایک فطری ضابطہ ہے۔ اور اسی ضابطہ کے مطابق دنیا میں زندگی کے لائق انواع کا انتخاب ہو رہا ہے۔ یعنی کمزور کا مٹ جانا اور طاقتور کا باقی رہنا ہی فطری انتخاب (NATURAL SELECTION) ہے۔ اور اس فطری انتخاب میں قوت و حیات کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کے لئے مسلمانوں کے پاس اسلام کی قوت ہے۔ اور اسلام کا اساسی میثاق جس کو شریعت کی زبان میں کلمہ طیبہ کہا جاتا ہے ارتقاء کے ہنگامہ فنا و بقا میں ہمیں اپنی حفاظت کے لئے اتحاد کا حربہ دیتا ہے۔ اگر یہ حربہ ہمارے ہاتھ میں ہے تو دنیا کی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی یورش و یلغار ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہمارے ہاتھوں میں ہی وہ عصائے موسوی ہے جس کے ہوتے ہوئے ہمیں طلسم سیاسیات کے کسی سامری اور اس کے طلسمی سانپوں کا ہمیں کوئی خوف نہیں۔

قرآن نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ہر انسان کے لئے ایک جامع و اکمل قانون حیات لے کر آیا ہے اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لئے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی تعلیم توحید میں نہایت غیور ہے۔ اور یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کو ماننے والے کسی اور کے حکم کو مانیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ وہ اپنے اندر ایک اکمل ترین قانون رکھتی ہے۔ اور اسلام کے سوا ایسا کوئی نظریہ نہ اس سے

پہلے کبھی تھا نہ اب ہے جو ضعیف کو قوی اور مظلوم کو ظالم کی تباہ کاریوں سے بچا سکے۔ اسلام ایک عظیم و جلیل قوت کا نام ہے اور ہر شخص کو یہی درس دیتی ہے۔

"زمین پر رینگتے ہوئے حقیر کیڑوں کی طرح صرف حرکت کرنے اور سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔ آزادی اور اختیار سے محروم ہو کر پامال گھاس کی مانند جینا انسانیت کی موت ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے تم جیو لیکن غلام بن کر نہیں آقا بن کر۔ کتے کی طرح نہیں شیر کی طرح۔"

عالم اسلام اپنی جگہ پر ایک مستقل دنیا ہے۔ اس کی اپنی قدریں اور اس کا اپنا اخلاقی ضابطہ ہے۔ اس کے اپنے حرام اور حلال کے اصول ہیں۔ اس کے اپنے جائز و ناجائز کے قوانین ہیں۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جو عقیدہ، اعمال، آئین اور ضابطہ کے نقطہ نگاہ سے ایک منفرد دنیا ہے۔ عالم اسلام بحر الکاہل سے بحر متوسط تک مختلف ممالک پر مشتمل ہے۔ اس کی جغرافیائی ساخت پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ساری دنیا کو کمر سے پکڑ رکھا ہے اس وسیع و عریض رقبہ ارض میں تقریباً ۴۰ ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ایکاون فی صد سے سو فیصد ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں بیشتر ممالک ایسے ہیں جہاں ۳ سے لے کر ۴۵ فیصد تک مسلمان آباد ہیں۔ ان ممالک میں مختلف رنگ و نسل اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ شامل ہیں۔ لیکن رنگ اور نسل اور زبانوں کے مختلف ہونے کے باوجود وہ سب کے سب کلمہ طیبہ کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ یعنی ان کا عقیدہ ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب پر ہے۔ اس اعتبار سے سارا عالم اسلام ایک وسیع و عریض گھر ہے اور یہ اسلامی ممالک اس گھر کے مختلف کمروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن آج کا عالم اسلام دشمنان اسلام کی فکری و نظری سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ مخالف طاقتوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔ اور مسلمان اسلام کے بتائے ہوئے راستے سے مسلسل ہٹتے جا رہے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ آج مسلمان متحد ہونے کی طرف پھر متوجہ ہو رہے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عالم اسلام کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے حالات انتہائی دلسوز اور تکلیف دہ ہو گئے تھے۔ اس وقت تک ترکی، ایران اور یمن

کے علاوہ کوئی علاقہ آزاد نہیں تھا۔

اس پر آشوب دور میں جبکہ عالم اسلام کے مرکز یعنی خلافت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ اسلامی ممالک کے بعض مسلم اکابرین ان حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ اور اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانان عالم ایک مرتبہ پھر کسی ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ حضور رسالت مآب کے زمانے میں فطرتاً مسلمانوں کا مرکز ذات اقدس ہی رہی تھی۔ آپؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کا مرکز خلافت میں منتقل ہو گیا تھا۔ گو یہ مرکز بڑا کمزور تھا۔ لیکن اس کے باوجود پوری دنیا کے مسلمان خلیفہ ہی کو اپنا قائد و رہبر تسلیم کرتے تھے۔ مگر ۱۹۱۴ء کی جنگ عالمگیر کے بعد یہ مرکز بھی برائے نام تھا بلکہ نیست و نابود ہو گیا تھا اور پورا عالم اسلام ایک مہیب تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ ایسے میں چند مسلمان رہنما جن میں انڈونیشیا کے عمر شوکرو سینوتو، مراکش کے عبدالکریم خطابی، مصر کے محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا، ہندوستان سے مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال میدان عمل میں اتر آئے۔ تاکہ مسلمانوں کو ایک بار پھر متحد کر سکیں، آخر ان اکابرین اسلام کی نیک خواہشوں نے جو اتحاد کا خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر سامنے آئی اور دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں مسلمانان عالم کا پہلا اجتماع آنجہانی شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی دعوت پر مکہ معظمہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر مسلم رہنما سر جوڑ کر بیٹھے تاکہ اتحاد کے لئے کوئی مؤثر کاروائی کی جائے۔

مسلمانان عالم کی دوسری عالمی موتمر مفتی اعظم فلسطین کی دعوت پر بیت المقدس میں منعقد ہوئی۔ اس طرح موتمر عالم اسلام کا ساتواں اجلاس اسرائیلی مملکت کے قریب ترین ملک اردن کے شہر عمان میں اس وقت ہوا جبکہ اسرائیل کے ساتھ چھ روزہ جنگ میں بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس موقعہ پر اسرائیلی رہنما موشے دایان کے وہ دعائیہ الفاظ پڑھ کر سنائے گئے جو اس نے دیوار گریہ کے سامنے کہے تھے۔ موشے دایان نے دیوار گریہ کو تھام کر کہا تھا۔

"ہم خیبر کا بدلہ لیں گے۔ اے خدا تو نے ہم کو یوروشلم تو دلا دیا ہے۔ لیکن یثرب اور بابل پر ابھی دشمنوں کا قبضہ ہے۔"

لاہور میں منعقد ہونے والی سربراہی اسلامی کانفرنس قائداعظم کے خوابوں کی تعبیر بھی تھی۔ وہ اسلامی اتحاد کے بہت بڑے داعی تھے۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کے حقوق کی ہمیشہ ہی حمایت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ تمام دنیا کے مسلمان متحد ہو جائیں اور ہر معاملے میں یک زبان ہو کر ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ میں اس اسلامی سربراہی کانفرنس کی صورت میں قائداعظم کے خواب کی بھی تعبیر دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ یہ کانفرنس ایک ایسے ملک میں منعقد ہو رہی تھی جسے قائداعظم نے خود بنایا تھا۔

اس اسلامی کانفرنس میں جب زعمائے اسلام سر جوڑ کر بیٹھے اور عالم اسلام کے مختلف مسائل سامنے آئے تو ان میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مسئلہ بھی تھا۔ سب نے متفقہ طور پر یہی فیصلہ کیا کہ ماضی کا ماتم کرتے رہنا اچھا نہیں۔ بلکہ ماضی سے سبق حاصل کر کے حال کے مسائل پر قابو پانا چاہیئے اور مستقبل کے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیئے انہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے کی تجویز پیش کی جو باہمی اتفاق سے تسلیم کر لی گئی۔ اس طرح میرا ایک حصہ جغرافیائی طور پر مجھ سے علیحدہ ہو گیا لیکن جسمانی و روحانی طور پر نہ وہ مجھ سے علیحدہ ہے اور نہ میں اس سے علیحدہ ہوں۔ توحید واخوت کے رشتے میں ہم ابھی تک ایک ہیں، وہ بدستور میرا ایک حصہ ہے اور میں اس کا ایک حصہ ہوں۔ ہم میں کوئی خلیج حائل نہیں ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم ایک ہیں۔ ہمیشہ ایک رہیں گے۔ اسے کوئی برہمنی سیاست جدا نہیں کر سکتی۔

بنگلہ دیش تسلیم کر لینے کی صورت میں میرے ۹۰ ہزار جگر کے ٹکڑوں کا فیصلہ بھی ہو گیا جو بھارتی سامراج کے جنگی کیمپوں میں تشدد کے دیوتاؤں کے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بن رہے تھے۔ بھارتی جنگی کیمپوں میں وہ کونسا ظلم وستم تھا جو ان پر نہ توڑا گیا۔ وہ کون سی اذیت تھی جو انہیں نہ پہنچائی گئی۔ لیکن انہوں نے یہ سب کچھ میرے لیئے برداشت کیا۔ آسمان دیکھ چکا ہے۔ یہ زمین خوب جانتی ہے کہ میں ان کی جدائی میں خون کے آنسو بہاتا رہا ہوں۔ میں یہاں تھا لیکن میرا دل ان کے پاس ہوا کرتا تھا۔ میری آنکھیں جنگی کیمپوں کے گھور اندھیروں میں ان کے پاس تیرا کرتی تھیں۔

آخر وہ وقت آیا کہ ان کے قافلے واہگہ کی سرحد سے ارض موعود میں داخل ہونے لگے۔ میں لہو کی لکیر پر کھڑا تھا اور ان کا انتظار کر رہا تھا۔ میں دفورِ محبت میں اپنے ایک ایک جیالے سے لپٹ لپٹ گیا۔ میں نے اپنے جگر کے ایک ایک ٹکڑے کو سینے سے لگایا۔ اپنے دل کی پوری محبت سے انہیں چوما۔ میں نے ان کے ایک ایک زخم پر اپنی محبت کے شبنمی پھاہے رکھے۔ میں ان کے قدموں تلے جدھر دیکھتا تھا شبنم شبنم پھول کھلے تھے۔ وہ جہاں جہاں قدم رکھ رہے تھے راستوں پر کاہکشائیں بچھتی جا رہی تھیں۔ ذرے ذرے میں چراغاں ہو رہی تھی۔

مجھے ان کی عظمت کی قسم! وہ سب اس وقت اتنے جسیم اتنے قد آور ہو رہے تھے کہ آسمان کی رفعتیں ان کے سامنے مجھے بڑی پست دکھائی دے رہی تھیں۔

سراب اندر سراب

اٹھائیس برس کی اندھیروں کی مسافت کے بعد تم ایک ایسی منزل تک آپہنچے ہو جہاں دو ٹوک بات کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جہاں دوست اور دشمن کی تمیز نہایت ضروری ہے۔ تم اگر مجھے اب تک نہیں پہچان سکے تو اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش تو کرو۔ خود شناسی کی تلقین سب سے پہلے اسلام نے کی۔ لیکن تم نے جہاں اور بہت سی اسلامی باتیں فراموش کردیں اور توہمات پرستی میں الجھ کر رہ گئے وہاں اسے بھی طاق نسیاں کی زینت بنا دیا۔ یہی تو وقت ہے غور و فکر کا !

غور و فکر سے بہت سے بگڑے کام بن جاتے ہیں۔ کئی تاریک پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ مختلف پوشیدہ چیزوں کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ زندگی میں بے شمار الجھنیں ہیں بہت سے بکھیڑے اور جھمیلے ہیں، جنہیں سوچے سمجھے بغیر زندگی کے رات دن اندھیرے میں پورے کئے جانا کچھ اچھا نہیں ہے۔

چلو ان الجھنوں کو جانے دو۔ ان جھمیلوں کو چھوڑو۔ اپنے متعلق تو سوچو۔ ان خرخسوں اور وسوسوں کو کوئی اہمیت نہ دو، تمہاری تو اہمیت ہے۔ تم نہ ہوتے کچھ نہ ہوتا۔

تم ایسی آسیب زدہ رات میں جو تم نے روشنیوں کے جیتے جاگتے شہر میں اپنے آپ پر مسلط کی ہوئی ہے۔ زندگی سے فرار حاصل نہیں کر سکے۔ زندگی سے فرار ممکن نہیں ہے، تم چاہو نہ چاہو۔ موت آنے تک زندہ تو رہنا ہی پڑتا ہے۔ موت سے پہلے زندگی سے فرار ممکن نہیں ——— موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔

لیکن یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ تم تنکوں کی طرح اندھیروں میں بہے جا رہے ہو۔ خزاں زدہ پتوں کی طرح اندھیروں میں اڑے پھرتے ہو۔ اندھیروں کا ایک جھونکا آتا ہے اور تم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہو۔ اور سخت پریشان ہو۔ تمہارے ہر سانس کے ساتھ ایک حادثہ

جنم لے رہا ہے۔ تمہیں ایک لمحہ بھی سکون نہیں۔ قرار نہیں۔ چین نہیں۔ بھاگم بھاگ مچی ہے تمہاری زندگی میں۔ آخر ایسی افراتفری کا مقصد کیا ہے۔ یہ ہنگامے کیوں۔ زندگی کیا ہے؟ جانتے ہو تم؟

چلو اگر یہ زندگی تمہارے نزدیک تجارت ہے تو اسے ایک تاجر کی طرح سود مند طریقوں پر چلاؤ۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرو۔ لین دین کے کچھ اصول وضع کرو۔ کچھ راہوں کا تعین کرنا ضروری ہے۔ ترازو۔ بٹے۔ اور دونوں پلڑوں میں پاسنگ۔ کم کو زیادہ اور زیادہ کو کم کرنے کے لئے جھوک مارنے کے ہتھکنڈے۔ اچھی خاصی ادھیڑ بن ہے۔ لیکن تم میں سے بہتوں کے لئے اتنی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہتے ہیں زندگی کے متعلق پریشان ہونے کی بات ہی کیا ہے۔ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گرتے پڑتے زندگی اپنے آپ گزر جاتی ہے۔ زندہ رہنا بھی کوئی بات ہے۔ سال، مہینے، ہفتے۔ دن۔ گھنٹے۔ منٹ سیکنڈ بس آنکھ جھپکنے میں نکل جاتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے اتنے صدمے کیوں اپنے آپ پر سے گزاریں۔ زندگی کے بنک کی وقت کے سیف لاکر میں جمع شدہ یہ دولت ایک دن خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اور تم میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ کچھ اس طرح جی رہے ہیں کہ ایک بہت بڑی میز پر بیٹھے ہیں۔ جس پر انواع و اقسام کے ماکولات و مشروبات چنے ہوئے ہیں۔ جتنا جی چاہتا ہے کھاتے پیتے ہیں۔ لیکن یہ میز الہ دین کے طلسمی چراغ کو گھسا کر جادو سے بنائی گئی ہے۔ گھومنے میں خود کار ہے۔ آپی آپ گھومتی جا رہی ہے ذرا نہیں رکتی۔ لمحہ لمحہ نئی نئی لذتیں نئے نئے کھانے۔ نئے نئے مزے مل رہے ہیں۔ نئے نئے رنگ دیکھنے میں آتے ہیں۔ رنگوں کا ورائٹی شو۔!

رنگوں سے اشیاء میں رونق آجاتی ہے۔ اگر رنگ نہ ہو تو کتنی بے رونق ہو جائے یہ دنیا جیسے اشیاء کے لیے رنگ اور رنگوں کے لیے اشیاء لازم ملزوم ہیں۔ یہ دنیا رنگوں سے کتنی حسین بن گئی ہے رنگوں کو نکال لو۔ دنیا بے کیف و بے رنگ ہو جائے گی۔ لیکن جب رنگ نہ تھے۔ رنگوں سے پہلے دنیا شاید کالا دھبہ ہوگی۔ اندھیرا جو تمہارا مرغوب رنگ ہے۔ پھر روشنی آئی۔ اور روشنی کے ساتھ رنگ اور رنگوں کے ساتھ اشکال اور اشیاء تو معلوم ہوا یہ دنیا رنگوں کو اپنے گرد لپیٹے ہوئے ہے یہاں جتنی بھی چیزیں ہیں ان

سب پر رنگ چڑھا۔

اگر ایسا ہی ہے تو تمہیں یہ دنیا بے کیف و بے رنگ کیوں نظر آنے لگی ہے شاید تم میں کوئی رنگ موجود نہیں۔ یہ رنگ تم میں دم توڑ چکے ہیں اور دنیا کی رنگا رنگی تمہارے لئے ختم ہو گئی ہے۔ کیا واقعی تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو، کچھ جان بھی سکتے ہو۔ اگر نہیں جان سکتے تو اس کے جاننے کی کوشش کرو یہ تم میں سب رنگوں سے زیادہ شوخ رنگ ہے اس رنگ کا دوسرا نام نفس ہے، اور حقیقت میں اندھیرا تو اسی وقت چھاتا ہے جب یہ رنگ بجھ جاتا ہے۔ اس کے بجھ جانے سے یقیناً پھر اندھیرا ہے۔ پھر واقعی کچھ نہیں سجھائی دیتا۔ تم شاید اسی لئے اندھیرے میں گم ہو گئے ہو۔ یہی وہ رنگ ہے جو زندگی کا احساس دلاتا ہے۔ نفس کے بغیر نہ تو جسم کا کوئی وجود ہے نہ زندگی کا۔

چونکو نہیں۔ گو یہ بات ایسی ہے کہ ضرور چونکا دینے والی ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ نفس ایک ایسا ذخار سمندر ہے جس میں تمہارے افعال، تمہارے جذبات اور تمہارے خیالات تیرتے پھرتے ہیں۔ نفس ہی تمہاری ابتدا و انتہا ہے۔ یہی تو وہ زمین ہے جس پر تم اندھیرے میں قدم جمائے کھڑے رہتے ہو۔ جو کچھ کرتے ہو۔ جو کچھ سوچتے ہو۔ جو کچھ محسوس کرتے ہو۔ اس کا نفس سے براہ راست تعلق ہے۔

اور نفس کیا ہے؟

تم نفس کے متعلق کیا جانتے ہو؟

لیکن تم اس کا کوئی جواب نہ دے سکو گے۔ تم نفس کے متعلق بہت کم سوچتے ہو۔ خارجی دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے تم اس میں اتنی دلچسپی سے منہمک رہتے ہو کہ اپنی ذات کے متعلق سوچنے کی زحمت ہی نہیں اٹھاتے۔

نفس کو جاننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم جسے جانتے ہو اس سے نفس کا مقابلہ کرو۔ مثلاً جسم اور نفس کو لے لو۔ جسم اور نفس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں گہرا رشتہ ہے۔

جسم کہتے ہیں آنکھوں کو۔ کانوں کو۔ انگلیوں کو۔ جسم کے ان تمام حصوں کو جن کو تم دیکھ سکتے ہو چھو سکتے ہو۔ محسوس کر سکتے ہو۔ لیکن نفس تمہارے حواس کی پہنچ سے باہر ہے۔ جسم کی ایک شکل ہوتی ہے، وزن ہوتا ہے۔ نفس کی نہ شکل ہوتی ہے۔ نہ وزن اور نہ جسامت۔ جسم لاتعداد چھوٹے چھوٹے

اجسام کا مجموعہ ہے جن کو تمہاری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ جسم کے یہ کروڑوں خلیئے بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ لیکن نفس جیسا ہے ویسا ہی رہتا ہے۔ نفس نظر نہیں آتا جس کا نہ کوئی جسم ہے نہ دماغ لیکن دونوں میں رہتا ہے۔ اس اعتبار سے تم نفس بھی ہو۔ جسم بھی ہو۔ دماغ بھی ہو۔ نفس ہی تمہاری حقیقت ہے۔ اور اہمیت تو صرف حقیقت کی ہے۔ اس حقیقت کو پہچانو۔ اپنے نفس کو پہچانو۔ جس نے نفس کو پہچان لیا اپنے آپ کو پہچان لیا۔ خدا کو پہچان لیا۔

پرفریب چیزیں۔ سراب اندر سراب۔ نفس کی تسکین کا باعث نہیں بن سکتے۔ اگر تم حقیقی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو نفس کے فلسفۂ حیات کو اپناؤ۔ اپنی تمام بصیرت نگاہ کو یکجا کر کے حقیقت کو اس اندھیرے میں تلاش کرو جو تم پر کہر و دھند کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ حقیقت شناسی کے بعد ہی زندگی کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

اندھیرے کے سراب تمہاری آنکھوں کو خیرہ رکھتے ہیں۔ جبھی تم یہ پہچان نہیں پاتے کہ زنگ آمیزی کر کے ان چیزوں کی ہیئت کو چھپا دیا گیا ہے۔ یہ سراب تمہاری پیاس نہ بجھا سکیں گے۔ تمہاری گلا گھونٹ کر تمہیں انہی اندھیروں میں ہلاک کر دیں گے۔

خود اپنے نفس کا مشاہدہ کرنا بڑا دلچسپ بڑا دلکش عمل ہے۔ جیسے ایک نئی وسیع دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں جس کی وسعتیں نامعلوم حدوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ نفس ہی زندہ رہنے کا فن سکھاتا ہے۔ اور زندہ رہنا ایک عظیم فن ہے۔

نفس تو دماغ اور جسم کے بغیر بھی اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ لیکن جسم دماغ اور نفس کے بغیر اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتا۔ جسم کا براہ راست تعلق دماغ سے ہے۔ کیونکہ یہیں سے زندگی کی برقی رو دوڑتی ہے۔ تو دماغ کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ نفس کے سرچشموں کو بہنے دے ان کو نہ روکے۔ لیکن جسم کے اپنے بھی تو دھارے ہوتے ہیں۔ اس کے اپنے تقاضے جو ہلچل مچاتے ہیں۔ اسی لئے تمہارے اعمال و افعال نفس کی مطابقت میں نہیں۔

نتیجہ ـــــ؟

کشمکس ـــــ گمراہی ـــــ تاریکی ـــــ!

اپنے دماغ کے منہ زور گھوڑے کو لگام ڈالو۔ جسمانی تقاضوں کے دھاروں کو روک

دو۔ نفس کے سرچشموں کے راستے ہیں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرو۔ لیکن یہ کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہے۔ جس کا تم کو علم نہیں۔ افق اب بھی اتنا ہی دور ہے جتنا پہلے تھا جب تم اس کی تلاش میں نکلے تھے۔

خودشناسی و خوددانی بڑی چیز ہے۔ اس سے ایک نیا زاویہ نگاہ ملتا ہے۔ یہ دنیا ہی بدل کر رہ جاتی ہے۔ یہ دنیا اپنی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جو اسے بنایا جائے بنتی چلی جاتی ہے۔ جو شکل اس کو دی جائے قبول کر لیتی ہے۔ بنائے جاؤ بنتی جائے گی۔ مٹائے جاؤ مٹتی جائے گی۔ اسے جس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے ویسی ہی نظر آئے گی۔ اگر جسم کی آڑ لے کر دیکھا جائے گا تو یہ دنیا جسم کی لذتوں سے بھرپور نظر آئے گی۔ کھانے پینے کی چیزوں سے مزین۔ آسائشوں سے سجی ہوئی۔ اگر دماغ کے زاویہ سے دیکھی جائے گی تو یہ دنیا بڑی پراسرار نظر آئے گی۔ لیکن جسم کی کوئی حیثیت نہیں ہے نہ دماغ کی۔ اور پھر انسان صرف جسم اور دماغ ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ کچھ اور —— جو زیادہ اہم ہے —— انسان پہلے نفس ہے۔ ذات ہے۔ روح ہے۔ پھر کچھ اور ہے۔ نفس کے نقطہ نظر سے بینائی پیدا ہوتی ہے۔ نئی ساعت ملتی ہے۔ ہر چیز کی اصلیت سامنے آجاتی ہے۔ جن کی امارت و ثروت پر رشک کیا جاتا ہے وہ مفلس نظر آتے ہیں۔ جسے غیر اہم سمجھا جاتا ہے نہایت اہم بن جاتا ہے۔

نفس کے نقطہ نظر سے جن کو بینائی ملی ہے وہ اس اندھیرے میں بھی صاف صاف دیکھ رہے ہیں۔ سرکاری محکموں میں رشوت ستانی عام ہے۔ کنبہ پروری اور انصاف کشی عام ہے۔ بے روزگاری، مفلسی اور بیماری بڑھ رہی ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی گرتا جارہا ہے۔ محنت کشوں کو بہت کچھ مل چکا ہے لیکن وہ قانع اور مطمئن نہیں ہیں سٹرائیکیں تالہ بندی، بھوک ہڑتال، جلوس جلسے، گھیراؤ اور جلاؤ کر رہے ہیں۔ زرعی پیداوار پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن اناج ہے کہ سستا ہونے کی بجائے پہلے سے کہیں مہنگا بک رہا ہے۔ سمگلنگ اور گراں فروشی اپنے پورے عروج پر ہے۔ درسگاہیں پہلے سے کہیں زیادہ کھل گئی ہیں لیکن تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ طلبا کالجوں اور اسکولوں میں پستول اور خنجر چلاتے

ہوئے غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور ملکی سیاست میں بھی حصہ لیتے ہیں، پڑھتے کم اور فلمیں زیادہ دیکھتے ہیں۔ مادی زبوں حالی کے ساتھ تہذیب کے سرچشمے میں سوکھ رہے ہیں۔ سرمایہ داروں، نوابوں، جاگیرداروں، ملوں اور کارخانوں کے مالکوں اور دوسرے غیر تخلیقی عناصر کی لوٹ کھسوٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

میں اکیلا ہوں اور تم نے میرے لیے سیکڑوں محاذ کھول دیئے ہیں۔ بیک وقت مجھے بہت سے محاذوں پر لڑنا پڑ رہا ہے۔ ملک کی زرعی زندگی خاندانی منصوبہ بندی کے دشمنوں کی یلغار سے سخت متاثر ہے۔ دیہی زندگی سرمایہ داری نظام کے شکنجے میں بدستور کسی جا رہی ہے۔ زندگی کی تمام اعلےٰ قدریں آرٹ، ادب، صحافت، اخلاق، مروت بھائی چارہ بازاری جنس بن گئی ہے۔ نہایت سختی و شدت سے سکہ بند ہونے کے باوجود بد دیانت اور راشی افسر محکموں میں ابھی تک موجود ہیں، محنت و مشقت کر کے ملک کی دولت پیدا کرنے والے بدستور پیچ رہے ہیں۔ ان کے حقوق و مطالبات کو بری طرح پامال کیا جا رہا ہے ان کا استحصال کیا جا رہا ہے، آدمی آدمی کا غلام بن رہا ہے۔ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بجائے زندگی کی تگ و دو اور اس کے ارتقائی عوامل کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صنعتی و فنی اداروں میں مونا پلیاں قائم ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں میں، ملوں اور فیکٹریوں میں ہزاروں کی تعداد میں مزدور کام کرتے ہیں۔ اپنا لہو مشینوں میں گھول کر تخلیق پہ تخلیق کئے جاتے ہیں اور ان کی تخلیقات و مصنوعات اب بھی مٹھی بھر افراد کے قبضہ میں چلی جاتی ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو گلبرگ، سمن آباد اور شادمان کالونی کے شاہانہ ایوانوں اور الف لیلوی شبستانوں میں رین بسیرا نہیں کرتا۔ یہ اب بھی روشنیوں کے شہر کی پسماندہ بستیوں اور گندے غلیظ علاقوں میں گھاس پھوس کے چھپروں کھپروں اور ٹوٹے پھوٹے کچے مکانوں میں زندگی کے سانس لے رہا ہے۔ اس طبقہ کے لوگ دن بھر کی مشقت شاقہ کے بعد رات کو کلبوں، بال رومون، سینک باروں، قہوہ خانوں، ریستورانوں اور ہوٹلوں میں کیبرے اور ڈانس کے پروگراموں میں نظر نہیں آتے۔ بلکہ اپنے چھپروں کھپروں، جھونپڑوں ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے دھواں دھواں ماحول میں کیچڑ بھری گلیوں اور تعفن بھری نالیوں کی بو بساند پھانکتے ہیں۔ ان کیچڑ بھری

گلیوں اور دھواں دھواں بستیوں میں، ان پسماندہ علاقوں میں زندگی اور موت کی آویزش میں مزدور اور سرمایہ دار کی طبقاتی کشمکش اپنے پورے عروج پر ہے۔ ایک طرف محل پر محل تعمیر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور دوسری طرف بھوکے ننگے بے گھر بے زر لوگوں کا شور و شغب دھرتی کا سینہ چیرے دے رہا ہے۔

تعمیر کی ہر اینٹ پہ لکھا ہے میرا نام
دیوار کسی اور سے منسوب ہوئی ہے

مگر یہاں ایک نہیں کئی دیواریں ہیں۔ جو دھواں دھواں ماحول میں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ گر رہی ہیں۔ کھڑی ہو رہی ہیں۔ کھڑی ہو رہی ہیں۔ گر رہی ہیں۔ ہر طرف ملبے کے ڈھیر لگتے جا رہے ہیں۔ اور اس نازک دور کے قلم کار، گیت کار، نغمہ نگار، تہذیب و تمدن کے ضامن اور تمدن کے محافظ فن کار معلوم نہیں کس کے ساتھ ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

وہ کچھ کہہ بھی رہے ہیں یا کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔ کچھ معلوم نہیں۔

پاکستان کا ادبی ذہن استحصالی سانچوں میں ڈھل رہا ہے۔ ادب و صحافت ایک موثر ہتھیار ہے ایک کارگر ذریعہ ہے۔ انسانوں کی خدمت کا۔ مجبوروں اور لاچاروں کی خدمت کا۔ معاشرے کی اصلاح کرنے کا۔ معاشرے کی برائیاں دور کرنے کا۔ جبر و استبداد کی چکی میں پسے ہوئے عوام میں زندگی کا نیا جوش نیا ولولہ پیدا کرنے کا۔ مگر اس موثر ہتھیار کو زنگ لگ چکا ہے۔ لکھنے والوں کی انجمنیں چند شاعروں اور ادیبوں کا تفریحی ادارہ نہیں بلکہ امن کے پیامبروں، تہذیب کے محافظوں اور دکھی عوام کے دوستوں کا وہ دستہ ہیں جنہیں علم اور یقین کی روشنی میں انسانیت کی بہتری کی جد و جہد میں ہر لمحہ مصروف رہنا ہے۔ سامراجی اثرات۔ سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ، حاکمانہ جبر کی موجودگی میں امن و تہذیب کے تحفظ کی کوشش ان کے لئے ایک مشکل و صبر آزما چیلنج بن گئی ہے۔ انہیں اس چیلنج کو قبول کرنا چاہیئے۔ خود غرضی، نفع اندوزی اور طبقاتی برتری کے بھوت چھلاوے بھیس بدل بدل کر عوامی ترقی کی راہوں میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ حکومت سے وفاداری، فرقہ پرستی اور فطرت انسانی

کے نام پر ان طاقتوں کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ قلمکاروں کو اپنی تخلیقات کی بے مقصدیت کو دور کرنا چاہیئے۔ انہیں اپنے رشحات قلم کو بامقصد بنانا چاہیئے۔ اور ملک دشمن، اسلام دشمن عناصر کے خلاف ملک دوستی اسلام دوستی کے محاذ کو نظریاتی و عملی حیثیت سے مضبوط بنانا چاہیے۔ کیونکہ صرف اسی ادب کو کامیاب ادب، صرف اسی علم کو علم اور صرف اسی فن کو حقیقی فن کہا جا سکتا ہے جو انسانیت کے شجر کو سیراب کرے۔ جو سرمایہ دارانہ وحشت و بربریت، امیرانہ خود پرستی، ریاکاری و سیاہ کاری کے خلاف برہنہ شمشیر ہو۔ جو اس آسیب زدہ اندھیرے میں مظلوم محنت کشوں اور جفاکشوں، شریف شہریوں، محب الوطن پاکستانیوں کے دلوں کو نئے جوش اور ولولوں سے بھر کر معاشرتی ارتقا اور جمہوری انقلاب کی رفتار کو اور تیز کرے۔ جو سیاسی و تہذیبی دونوں میدانوں میں ظلم و استبداد، معاشی لوٹ کھسوٹ، جہالت کے سرمایہ دارانہ اور جاگیرداری نظام کو شکست دے۔ دانشوروں اور فنکاروں کی لامحدود مادی و روحانی صلاحیتوں کو اس آن بان سے ابھرنا چاہیئے جس طرح رات کے اندھیرے کو چیر کر افق پر صبح کا آفتاب ابھرتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں پاکستان کے مسلمہ ادیبوں، چابکدست نقادوں، سنسنی خیز افسانہ نگاروں، راتوں کی نیند حرام کر دینے والے اسرار نویسوں، شعلہ بکیر شاعروں، طوفان بقلم مدیروں اور صحافت کے لوح و قلم اپنے بریف کیس میں لئے پھرنے والے احسن الکلاموں کے قلم قتلے قتل کیوں ہو گئے ہیں۔ کیا ان کے کان معاشرے میں سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں سر بازار قتل ہوتی ہوئی معصوم عصمتوں کے کفن کی سرسراہٹ نہیں سن رہے، کیا فقیہہ و مفتی شہر کے فتووں کے کوڑے سمگلروں، بلیک ملروں ملاوٹ کرنے والوں، گراں فروشوں، ملک و ملت کے غداروں، ذخیرہ اندوزوں منافع خوروں کے ناپاک جسموں کو چھوتے ہوئے تھراتے ہیں۔ کیا وہ اس آسیب زدہ اندھیرے میں اسلامی کلچر و تہذیب کے قافلوں پر ڈاکے ڈالتے ہوئے لیٹروں کے سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نہیں سن رہے۔ کیا ان کے پاس قلم نہیں، ذہن نہیں۔ دل نہیں اور اس دل میں عوامی جمہوری انقلاب کی لگن نہیں۔ کہ وہ تمام عوام دشمن، جمہور دشمن، ملک دشمن نظریات کا جواب اپنے قلم سے دیں۔ تنقید سے دیں، ایسی تنقید جو عوام کے شعور کو اور تیز کر سکے۔ جو انقلابی جذبے کو اور ابھارے

جو پاکستان دشمن قلمکاروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، حاکموں اور ان کے نقارچیوں کے خلاف نفرت کو اور شدید کر دے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ان کے قلم، ان کے ذہن اور قوت عمل پر جمود و تعطل طاری ہو رہا ہے۔ ان کے ذہن کو پھپھوندی لگ گئی ہے۔ ان کے قلم کو رعشہ ہو گیا ہے۔ ان کی قوت عمل کو بے عملی کے مارفیئے اور مار جوآنا گانجے نے گہری نیند سلا دیا ہے

جو بحران اس عوامی دور میں سرمایہ داری پر طاری ہے وہ ثقافت و صحافت کے نقارچیوں کی صحافت و ثقافت ادب میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کا ذہنی انحطاط اور ذہنی پراگندگی ان کی تحریروں میں بھی صاف جھلکتی ہے وہ کسی عظیم صحافت کی تخلیق سے قاصر ہیں۔ کیونکہ وہ انسانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کی خواہشوں، کلفتوں اور مسٔلوں کی ترجمانی نہیں کرتے۔ اور نہ ان کی جد و جہد کو اپناتے ہیں۔ ان پر قنوطیت طاری ہے۔ ان کا ادب مکاری، جھوٹ اور دغابازی کا ادب ہے۔ انسانیت، جمہوریت اور امن کے دشمنوں کا ادب ہے۔ عوام سے غداری کرنے والوں کا ادب ہے۔ پست ہمتی، یاسیت، وہم پرستی ملک و قوم سے غداری اور اخلاقی پستی کی تلقین کرنے والوں کا ادب ہے۔ ادب و صحافت زندگی کا آئینہ ہی نہیں زندگی کو بدلنے، بہتر بنانے کا ذریعہ اور وسیلہ بھی ہے۔ ان کو پاکستانی ادب و صحافت، ادب و صحافت برائے زندگی، ادب برائے جد و جہد اور ادب برائے انقلاب کے نظریے کو اپنی قلمی تحریکوں کا سنگ بنیاد خیال کرنا چاہیئے۔ ان کی فکری اساس مطلب براری، موقع پرستی و موقع شناسی پر نہیں حقیقت پسندی پر ہونی چاہیئے۔ ان کو اس تضاد کو مٹانا چاہیئے جو آج انکے معاشرے اور عام انسانی ضرورتوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ان کا نصب العین ایک ایسا نظام زندگی قائم کرنا ہونا چاہیئے جس میں ہر شخص کو اپنے جمالیاتی ذوق کی تربیت کا موقع مل سکے ان کی تخلیقی و فنی صلاحیتیں ابھر سکیں۔ وہ اپنی شاندار مذہبی و تہذیبی روایات کو فروغ دے سکیں۔ ان کی زندگی مصائب سے پاک ہو۔ زیادہ حسین اور زیادہ صحت مند ہو۔ ان کو اس ملک کے مزدوروں، کسانوں، دبے ہوئے انسانوں کی زندگی کو اپنے فن کا موضوع بنانا چاہیئے۔ پاکستان کو سچے دل سے پیار کرنے اور اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی لگن دل میں رکھنے والوں پر لکھنا چاہیئے۔

اور پھر اندھیروں کی مخلوق میں ایک وہ فیشن ایبل طبقہ ہے، وہ گھرانے ہیں، جن کا ہر فرد اپنے آپ کو بیسویں صدی کا جدید انسان سمجھتا ہے۔ اور ان کی جدیدیت کی تشکیل میں سگمنڈ فرائڈ کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ جس کا فلسفہ ہے کہ جدید انسان وہ ہے جو دنیا میں غیر محفوظ اور اپنے آپ سے غیر مانوس ہے۔ جو تشویش کا شکار ہے۔ اور ان گنت اجتماعی روابط میں اسیر ہے۔ جو طاقت ور ہے اور اپنی طاقت سے آپ ہی خوف زدہ ہے۔ جو کامیاب ہے لیکن اپنی کامیابی سے غیر مطمئن ہے۔ جو بیسویں صدی کی جدیدیت میں اس قدر کھو گیا ہے کہ اپنے آپ کو تلاش نہیں کر پاتا۔ اور اس تلاش میں وہ اتنا جذباتی ہو گیا ہے کہ اس کے فکر و ادب میں جذبہ کا انتشار ہے۔ وحدت فکر اور تدبر کا تسلسل و تواتر موجود نہیں۔ یہ وہ انسان ہے جو خواب کو حقیقت کی بگڑی ہوئی صورت نہیں سمجھتا بلکہ حقیقت کو خواب کی بگڑی ہوئی شکل تصور کرتا ہے۔ وہ ایک قسم کے ذہنی مریض ہوتے ہیں اور اس ذہنی مرض کی علامتوں کے اسباب ان کی شخصیت میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی محور نہیں ہے۔ اور نہیں جانتے کہ دنیا کی ہر چیز گھومتی ہے۔ اور اس کا اپنا اپنا ایک محور ہے۔ سائیکل کے پہیے سے لے کر خود دنیا تک کا۔

اور پھر کچھ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کی اندھی آنکھیں، آسیب زدہ اندھیروں کی تہہ میں اجالے کے لئے بیکل ہیں۔ لیکن وہ خود جیسے اندھیروں میں گھل گئے ہوں۔ اور کچھ وہ لوگ جن کی آنکھیں ان کے شعور پر مسلط ہو چکی ہیں۔ اوہے کا ایک ہاتھ ان کے دل کی دھڑکنوں کو ٹٹولتا رہتا ہے۔ اور وہ اندھیرے میں اپنی ہی دھندلی پرچھائیوں کو پکڑتے رہتے ہیں۔ ان کے شب و روز یوں گزر رہے ہیں جیسے تیز رفتار آندھی دھوپ اور اندھیرے میں سے گزر رہی ہو۔ ان کی آنکھوں میں بھی ہر وقت نیند رچی رہتی ہے۔

اور کچھ وہ جو حادثات و واقعات کے کینوس پر اپنی زندگی کے دکھ پینٹ کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کے چہرے پر کالی لکیریں کھینچتے رہتے ہیں۔ جبکہ زندگی بھی ان کے خیال میں ان کے خوبصورت چہرے پر ایک لکیر ہے۔ وہ اندھیروں میں حادثات و واقعات کی کرچیاں چننے کو تو صحیح اوقات نہیں سمجھتے۔ اور یادوں کو خیالوں کی لڑی میں پرونا بھی ان

کا مشغلہ ہے۔ ہر شخص اپنا ایک تشخص رکھتا ہے لیکن ان کا کوئی تشخص نہیں۔ کوئی ہمزاد نہیں۔ یہ لوگ صداقت پسند کہلاتے ہیں۔ ان کو حقیقت و صداقت کی تلاش ہے۔ دن رات اسی میں لگے رہتے ہیں۔ خود چین سے نہیں بیٹھتے۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے۔ اپنی پوری زندگی اسی کے لئے وقف کر دی ہے۔ لیکن صداقت کی تلاش و جستجو بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اور کچھ وہ جو نہیں جانتے زندگی کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ اپنی قوت ارادہ کے ساتھ کیا کر رہے ہیں وہ بالکل نہیں جانتے یہ قوت ان کی ترقی و کامرانی میں مددگار ثابت ہو رہی ہے یا اس کو روکے ہوئے ہے۔

اور ایک میں ہوں جو اس آسیب زدہ رات کے اندھیروں میں ہر دروازے پر دستک دیتے ہوئے۔ ہر سوئے ہوئے کو جگاتے ہوئے۔ ہر راہ چلتے کو روکتے ہوئے چیخ چیخ کر یہ کہہ رہا ہوں۔ اس ملک کی معاشی و سیاسی زندگی اسلام کے اصولوں کی بنیاد پر استوار کرو۔ اسلامی نظام کی بڑی خصوصیت عدل ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

"ہم نے اپنے رسول کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ بھیجے۔ اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ تم لوگوں کے درمیان عدل قائم کرو"

عدل سے مراد ہے انسان اور انسان کے درمیان عدل۔ کمزور اور طاقتور کے درمیان عدل۔ غریب اور امیر کے درمیان عدل۔ فرد اور ریاست کے درمیان عدل۔ ایک ریاست اور دوسری ریاست کے درمیان عدل۔ اگر ہم انسانوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد قوت کی بجائے عدل کو قرار دے لیں تو پوری معاشرتی عمارت اخلاقی بنیادوں پر استوار ہو جاتی ہے۔ منصفانہ نظام اسی وقت بروئے کار آ سکتا ہے جب انسان خدا کی کتاب اور انبیاء کرام کے اسوۂ حسنہ سے حکمت اور دانائی کا سبق لینے اور اپنے اعمال کو خیر و شر کی میزان میں تولنے کے لئے تیار ہو جائے۔ یہ عدل ایک ایسے خدائی قانون کے تحت بروئے کار آتا ہے۔ اور قائم رہتا ہے جس کے سامنے سب کا مفاد یکساں ہوتا ہے۔ اور تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی اور ایک ہی خاندان کی حیثیت دیتا ہے یہ قانون حاکم و محکوم، عوام و خواص سب پر یکساں نافذ ہوتا ہے۔ اور اس کی نظر میں

سب کی حیثیت مساوی اور ایک جیسی ہوتی ہے۔ ملوکیت اور آمریت کے برخلاف یہاں کسی فرد کی حکمرانی نہیں بلکہ قانون کی حکمرانی ہوتی ہے۔ ایک شہری جب تک قانون کا پابند ہے ہر طرح آزاد ہے۔ اس کا ضمیر آزاد ہے۔ وہ مسائل عامہ پر اظہار خیال میں آزاد ہے خیر و فلاح کے لئے دوسرے شہریوں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں آزاد ہے۔ اپنی صوابدید کے مطابق کوئی جائز پیشہ یا ذریعہ معاش اختیار کرنے میں آزاد ہے اس کے باعث انسان کی شخصیت جبر و اکراہ سے نجات حاصل کرتی ہے۔ اور ایک ایسی فضا میسر آتی ہے جہاں وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان کو منتہائے کمال تک پہنچا سکے۔

یہ ایسا نظام معاشرت ہے جس میں نہ ظلم وجود کے لئے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے نہ ایک دوسرے سے جبری استحصال کی۔ قرآن کریم نے باطل طریقے پر کسی کا مال کھانے اور ظلم و تشدد کے رویہ کی شدید مذمت کی ہے۔ انسانی تعلقات میں عدل کی اہمیت ایسی ہے کہ امت مسلمہ کے ہر فرد پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے۔ کہ عدل قائم کرنے والے اور خدا کے لئے گواہی دینے والے بن جاؤ۔ اگر وہ گواہی خود تمہارے، تمہارے والدین، تمہارے اقربا کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ دشمنوں سے برتاؤ کے بارے میں بھی یہ کہا کہ دیکھو کسی کی عداوت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل نہ کر سکو۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ ذاتی مفاد، خاندانی روابط اور قومی عصبیتیں تمہارے فکر و عمل پر غلبہ نہ حاصل کر پائیں بلکہ ان کے اعمال کا رخ متعین کرنے میں عدل کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو۔ کیونکہ عدل تقویٰ کے قریب تر ہے۔

اسلامی معاشرہ میں حق و صداقت کا وہ تصور جو خدا کے خوف اور معاشرتی ذمہ داری کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اساسی خوبی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں انسانی عظمت کا معیار دولت و منصب نہیں بلکہ انسانی تقویٰ و انسانی نیکی ہے۔ جیسا کہ سرور کونین نے فرمایا کہ تم سب آدم کی اولاد ہو۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی تفضیلت نہیں۔ نہ گورے کو کسی کالے پر۔ اگر کسی کو کوئی فضیلت ہے تو محض تقویٰ کی بنا پر۔ نسلی، قومی، لسانی تمام امتیازات باطل ہیں۔ ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ نوع انسانی کی رنگا رنگی کے مظاہر ہیں۔ اور سیاتیاتی

اور ثقافتی نقطۂ نظر سے یہ تنوع بنی نوع انسان کی بقا و ارتقا کے لئے بہت اہم ہے۔ لیکن ان کی بنا پر کسی فرد یا گروہ کو تفوق و برتری کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

انسانی اخوت بہترین مظاہر اسلام کے شعائر میں نہ صرف ایک حیاتیاتی حقیقت ہے بلکہ ایک اخلاقی نصب العین بھی ہے۔ اگر تم اسے سچے دل سے اپنا لو تو یہ تمہارے لئے بہت مناسب ہے۔ جس چیز نے تمہیں اس قدر پراگندہ اور منقسم کر رکھا ہے وہ نظریات کا تصادم نہیں بلکہ قومی وقار و اقتدار کی مجنونانہ کشمکش ہے۔

تم قومیت کے تصور سے اس لئے چپاں ہوئے جاتے ہو کہ تمہیں معاشرتی شیرازہ بندی کی کوئی اور محکم صورت نظر نہیں آتی۔ قومیت میں انسانیت کے ابتدائی دور کی جو جبلتیں ہیں اور عہد حاضر نے قومیت کے تصور میں جو رنگ آمیزی کی ہے اس کے سراب سے تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہی وہ واحد قوت و تنظیم ہے جو معاشرتی اصلاح کر سکتی ہے۔

اسلامی معاشرے میں شیرازہ بندی ہئیت اجتماعیہ میں یقیناً ضروری ہے، لیکن اسلامی معاشرے میں افراد معاشرہ کو یکجا کرنے اور متحد رکھنے والی قوت خدا کی اطاعت اور انسانوں کی فلاح و بہبود ہے۔

اسلام اس کے سخت خلاف ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے، اپنے اہل و عیال کے لئے رزق پیدا کرنا اور بغیر کسی غرض و لالچ کے قوم کی خدمت کرنا اس کا ایک جزو ہے۔ اور پھر اسلام میں تمام وفاداریاں احکام الٰہی اور حق کے اعلان کے نفاذ کی جدوجہد کے تابع ہیں۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ان امور کی انجام دہی کے سلسلے میں نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں، اور برائی اور گناہ کے کاموں میں عدم تعاون۔

اسلامی اخوت و مساوات میں یہ بات نہایت وضاحت سے موجود ہے کہ سب کو جدوجہد کے یکساں مواقع میسر ہوں۔ فطری صلاحیت کے اعتبار سے یقیناً دو بھائیوں کے درمیان بھی فرق ہوتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ذہنی و جسمانی خصوصیات میں بھی کچھ بہت زیادہ اشتراک مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن وہ بجا طور پر اس کا استحقاق حق رکھتے ہیں کہ انہیں

اکتساب معاش اور اپنی جسمانی قوتوں کو بروئے کار لانے کے یکساں مواقع ملیں۔ ترقی کے مواقع ہی انسانی قوتوں کو فعال بناتے ہیں۔ ترقی پذیر معاشرے میں فعالیت پائی جاتی ہے اور اس کے سامنے ہر لمحہ زندگی کی نئی راہیں کھلتی رہتی ہیں۔ مایوسی، کم ہمتی، غیر فعالیت مردہ معاشروں کا شعار ہے۔ یہ تعطل و جمود، یہ بے حسی، یہ کم ہمتی کسی تفکر و استدلال کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ناسازگار حالات کے آگے سپر ڈال دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں جن میں عام انسانوں کے لئے ترقی اور سربلندی کی راہیں مسدود ہوں اور ترقی کے امکانات نہ ہوں، اور جہد و عمل کے مواقع میسر نہ آئیں وہ معاشرہ اسلام کے معیار پہ پورا نہیں اترتا۔

اگر تم کو اسلام اور شعائرِ اسلام سے دلبستگی ہے تو اس کا جائزہ لو کہ تمہاری سیاسی معاشرتی اور معاشی زندگی میں یہ نظریہ حیات کس حد تک دخیل اور موثر ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو تمہارا ملک غریب اور کم ترقی یافتہ ملک ہے، اس کی اوسط فی کس آمدنی بہت قلیل ہے ضروریات زندگی کی محتاجی ہے، تعلیم و صحت کی سہولتیں کمیاب ہیں۔ بڑے اور چھوٹے شہروں میں غریب طبقہ افلاس و نکبت کا شکار ہے۔ تمہارے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی اقتصادی ترقی کو سماجی انصاف کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کرو۔ یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور تمہارے مستقبل کا انحصار اس کے صحیح حل پر ہے۔

اقتصادی ترقی کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ اشیائے صرف اور کام کاج کی فراوانی ہو سب لوگ روزگار میں لگ جائیں۔ کوئی بیکار نہ رہے۔ کسی قوم کی پیداوار کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے پاس قدرتی اور انسانی وسائل کتنے ہیں۔ سائنس اور فنی مہارت ٹکنالوجی کا علم کتنا ہے۔ پس اندازی و سرمایہ کاری کی کیا کیفیت ہے۔

جہاں تک اقتصادی ترقی کی ضرورت کا تعلق ہے۔ یہ تو تمہارے وجود و بقا کا مسئلہ ہے۔ تنازع للبقا میں زندگی کا انحصار علم۔ توانائی، تنظیم، اتحاد اور اخلاقی روح پر ہے یہ تمام عوامل یقیناً ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن تجربہ کی خاطر ان عوامل کو علیحدہ علیحدہ دیکھنا چاہیئے۔ کوئی قوم یا تہذیب اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکتی اگر وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کوتاہی کرے۔ جہالت ایک ایسا اندھیرا جس میں موت یا

غلامی ہے۔ اندھیرے میں رہنا ذہنی خودکشی کے مترادف ہے۔ اور خودکشی کی کئی شکلیں ہیں۔ انسان زندہ ہوتا ہے لیکن وہ خودکشی کر چکا ہوتا ہے۔ زندہ ہوتا ہے لیکن زندہ نہیں ہوتا۔ وہ ذہنی طور پر خودکشی کر چکا ہوتا ہے۔ قلبی طور پر خودکشی کر چکا ہوتا ہے۔ اقتصادی طور پر ختم ہو چکا ہوتا ہے اسی طرح کئی قومیں بھی بظاہر زندہ ہوتی ہیں لیکن زندہ نہیں ہوتیں۔ ان کے لئے دوسری قوموں کا سہارا لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا سہارا تھوڑے عرصہ کے لئے ناگزیر ہو سکتا ہے۔ لیکن طویل عرصہ تک دوسروں کا سہارا لینے سے آزادی کی اپج و خواہش مردہ ہو جاتی ہے۔ جن قوموں کا سہارا لیا جائے گا ان کو معاشی صلاحیت، فوجی طاقت اور مادی اشیا میں یقیناً برتری حاصل ہو گی۔ ایسی صورت میں سہارا لینے والی قوم جب تک برتر قوموں کے ان سائنسی علوم کو جن کے ذریعہ ان کو یہ برتری حاصل ہوئی ہے اپنا نہ لیں اور ان علوم میں اضافہ کرنے کی کوشش نہ کریں ان کی حیثیت مستقل طور پر ان سے کمتر رہے گی۔

قرآن مجید میں بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ خدا کی نعمتیں حاصل کرو۔ اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کی نعمتیں خشکی پر اور سمندر کی تہوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر اگر پسماندہ قومیں زمین کی معدنیات اور پانی کے قدرتی وسائل کو پورے طور پر استعمال نہ کریں تو وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہ ہوں گی۔ قرآن مجید نے مسلمانوں پر یہ فرض بھی عائد کیا ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لئے دفاعی ساز و سامان سے لیس ہو کر پورے طور پر تیار رہیں۔ طاقتور مسلمان کمزور مسلمان سے اور دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ کی نسبت بہتر ہے۔ اگر مسلم قوم ان صنعتی فنون سے عاری ہو جو اس کی بقا کے لئے ضروری ہیں ان فنون کا حاصل کرنا پوری قوم پر فرض ہو جاتا ہے۔

معاشی ترقی کے فقدان کی وجہ سے لوگ غربت، جہالت اور بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں حالانکہ محنت شاقہ سے ان چیزوں کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔ اسلام ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جن کو جب ضرورت مندوں کی امداد کے لئے کہا جائے تو وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوتی تو وہ خود ان کو کھانے کے لئے دیتا جن کے پاس کھانے کے لئے نہیں ہے۔ لیکن خدا ایسا ہرگز نہیں کہتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خدا مسلمانوں کو زکواۃ دینے کا حکم

ہرگز نہ دیتا۔ وہ ضرورت مندوں کی حاجتیں خود ہی پوری کر دیتا جیسے کہ وہ کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ زکواۃ دینے کا حکم بھی صادر کرتا ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اقتصادی ترقی کے لئے بس یہ کافی ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے کچھ فنون و اسلوب مستعار لے لئے جائیں اور ان کے معاشرے کا روایتی ڈھانچہ جوں کا توں رہے اور کام کرنے کے بارے میں ان کی روش اور ان کے تصورات بھی بدستور قائم رہیں۔

اس طرح کے خیالات و تصورات حقیقت سے بہت دور ہیں۔ جو لوگ اس نہج پر سوچتے ہیں ان کو مطلوبہ تبدیلی کی ہمہ گیری اور وسعت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ دینی اور قومی دونوں نقطہ نظر سے یہ ناگزیر ہے کہ ایک جامع منصوبہ بنا کر اقتصادی ترقی کے لئے کام کیا جائے۔ چاہے اس میں ایک طویل مدت تک کے لئے سخت اور مسلسل محنت و مشقت کی ضرورت کیوں نہ پڑے۔

اس وقت تمہاری معاشی ترقی کی رفتار تمہاری آبادی کے اضافے کی رفتار سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ لیکن اگر تم رجائیت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہ بھی تسلیم کر لو کہ کچھ عرصہ کے بعد تمہاری ترقی کی رفتار بڑھ جائے گی اور آبادی میں اضافے کی رفتار کم ہو جائے گی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشی ترقی کی رفتار کی نسبت سے ترقی کے معیار تک پہنچنے کے لئے ایک صدی لگ جائے گی۔ اور خود کفیل ہونے کی منزل مستقبل قریب میں بھی دور رہے گی۔

غیر ترقی یافتہ ممالک کے لئے بے حد ضروری ہے کہ وہ اپنے وسائل کی نگہداشت اور ان کے صحیح استعمال میں پوری احتیاط اور توجہ سے کام لیں۔ ترقی کے اس سارے عمل کا دارومدار صحیح تعلیم پر ہے۔ اس لئے کہ صحیح تعلیم اور عمدہ افکار کے حامل افراد و کردار ہی طریق پیداوار اور معاشرتی ماحول میں مطلوبہ تغیرات پیدا کر سکتے ہیں۔ ساری معاشی ترقی کی نہج اس پر ہونی چاہیئے کہ اس سے عمرانی عدل کو فروغ ہو۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ عوام کا معیار زندگی بلند کیا جائے۔

عمرانی عدل کا فلسفہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند الفاظ میں اس طرح سمیٹ دیا

حضور سرور کائناتؐ نے ایک صحابی کو زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے مقرر کرتے ہوئے فرمایا۔

"اسے امیروں سے لے کر غریبوں میں بانٹ دو۔"

معاشی و عمرانی عدل کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

محنت کی عظمت اور حق کا احترام اسلامی قدروں کے عین مطابق ہے۔ مقاصد کے بارے میں اسلام نے واضح رہنمائی کر دی ہے۔ اب اسلامی اقدار کی روشنی میں یہ سب کچھ طے کرنا تمہارا کام ہے۔ اور ان کو اپناتے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کی روشنی میں پہلے ان کو اچھی طرح پرکھ لیا جائے۔

تعلیم کا مقصد ہے کہ انسان کے اندر جو صلاحیتیں ہیں ان کو ابھارے نکھارے ان کو ترقی دے اور ہر فرد کو مفید و کارآمد شہری بنائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تعلیم کی اساس میں ایک طرف تو سائنس اور فنی مہارت کا پورا لحاظ رکھا جائے اور دوسری طرف اسلامی تعلیمات کا۔ اس اعتبار سے یہ نظام تعلیم اس نام نہاد آزادانہ تعلیم سے بہت مختلف ہوگا جس کا سارا انحصار مغربی ادب، ثقافت اور فلسفہ پر ہے۔ مغرب میں اس کا مقصد آرام طلب اور آسودہ حال افراد کی ذہنی تربیت ہے لیکن تمہارے معاشرے میں اس انداز تعلیم نے بڑے پیمانے پر پڑھے لکھے لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اس طرح تمہاری تعلیم دو حصوں میں منقسم ہو گئی جس نے دو تعلیم یافتہ طبقوں میں تصادم و کشمکش کی صورت پیدا کر دی ہے۔ جب تک اس نظام تعلیم کو بنیادی طور پر از سر نو ترتیب نہ دیا جائے ان دونوں طبقوں کے درمیان اتحاد فکر و نظر اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اسلامی معاشرے میں تعلیم ہر بچے کا پیدائشی حق ہے، خواہ اس کے والدین کے ذرائع آمدنی کچھ ہوں۔ عدل عمرانی اور ترقی کے مواقع کی یکسانی اس وقت تک بے معنی ہے جب تک ہر بچے کی تعلیم کی سہولت فراہم نہ کی جائے۔

اس وقت تمہارے ملک کے بیشتر افراد ناخواندہ اور ان پڑھ ہیں۔ اس لئے نہ تو وہ قرآن کریم پڑھ کر اس کی تعلیمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ نہ زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت میں ترقی کر سکتے ہیں اور نہ ملکی و ملی مسائل کو ٹھیک طرح سمجھ سکتے ہیں۔ روشنیوں کے شہر سے

جہالت کے اندھیروں کو دور کرنے کے لئے زبردست مہم کی ضرورت ہے۔

بنیادی تعلیم کے مرحلہ پر اسلام کی تعلیم کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو محور بنانا بہت ضروری ہے۔ اس کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے سرور کائنات آنحضرت صلعم کو کیا کام تفویض کیا گیا۔ اور حضورؐ نے اس کو پورا کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے اور کن اوصاف کا مظاہرہ فرمایا۔ اس کے بغیر یہ ناممکن ہے کہ ان ہدایات کو سمجھا جا سکے جو خدا نے اپنے پیغمبر کو اور اپنے پیغمبر کی وساطت سے پوری انسانیت کو قرآن کی شکل میں دیں۔

حضور سرور کائنات کی ذات گرامی انسانیت کا بہترین نمونہ ہے۔ جنگ میں بھی اور صلح میں بھی۔ رنج میں بھی اور خوشی میں بھی۔ ناکامی میں بھی اور کامیابی میں بھی۔ اپنے اہل و عیال کے درمیان بھی اور زندگی کی ہر آزمائش میں بھی۔ بہت مناسب ہوگا کہ حضور کی مطہر و اطہر زندگی اس وقت بچے کے ذہن پر نقش ہو جائے جبکہ اس کا ذہن تشکیل پذیر ہو۔ تشکیل پا رہا ہو۔ آگے چل کر یہی نقوش اس کے ذہن سے کوئی طاقت نہ مٹا سکے گی۔ لیکن یہاں تو بچوں کو ابتدا ہی میں عیسائی مشنری اسکولوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے مواقع کا انحصار والدین کی دولت و وسائل پر نہیں بچے کی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے صلاحیتوں سے نوازتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ خداداد صلاحیتیں رکھنے والے بچے صرف امیروں کی اولاد ہوتے ہیں۔ آبادی کے ہر شہر ہر قصبے میں ایسے جواہر ریزے بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی ذہنی نشوونما اور ترقی کے ذرائع پیدا کرنا تمہارا فرض ہے۔ پھر جب یہ پروان چڑھیں گے تو ان کی خداداد صلاحیتیں ملک و ملت کی خدمت میں صرف ہوں گی۔ انہی سے سرسید، اقبال اور قائداعظم پیدا ہوں گے۔ نشان حیدر، ہلال جرأت، ستارہ جرأت پیدا ہوں گے۔ انہی سے خالد بن ولیدؓ، طارق اور محمد بن قاسم پیدا ہوں گے۔ انہی سے معرکہ بدر حنین کے غازی و شہید پیدا ہوں گے۔ اسی بھٹی سے وہ کوہ نور اور دریائے نور نکلے گے وہ کندن نکلے گا جسکی چمک دنیا کو خیرہ کر دے گی۔

ایسے پبلک اسکول بنانا جن میں صرف دولت مند افراد اپنے بچوں کو بھیج سکیں اور غریبوں کی تنگدستی اس کی اجازت نہ دے کہ ان کے بچے ان معیاری درس گاہوں تک نہ پہنچ سکیں

اسلامی اخوت و مساوات اور انسانی فلاح و بہبود کے اسلامی تصور کے بھی خلاف ہے اور قومی و ملکی مفاد کے بھی منافی۔

اسلامیات کی تعلیم میں ان تاریخی تلخ حقائق اور عقائدی بحثوں سے اجتناب کرنا نہایت ضروری ہے جنہیں دشمنان اسلام نے غیر جانب دار مستشرقین کا نقاب ولبادہ اوڑھ کر تم میں نفاق و تفرقہ پھیلانے اور پھوٹ ڈالنے کے لئے پھیلا دیا ہے۔ جنہیں اغیار نے خواہ مخواہ ہوا دینے کے لئے تشہیر کیا ہے۔ تمہارے اصل مسائل زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ اسلامیات کی تعلیم کا مرکز و محور قرآن و حدیث، فقہ اور عمرانیات کو ہونا چاہیئے تاکہ معاشی و سیاسی امور میں تمہاری آئندہ آنے والی پود، روشنیوں کے شہر کی اولاد اپنی راہیں متعین کر سکے۔ تعلیمی نظام کی اصلاح مخلص اور قابل قدر اساتذہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جن میں یہ صلاحیت اور لگن ہو کہ وہ طلبا میں تعمیری فکر اور ملکی و ملی مسائل حل کرنے کا ذوق اور اس کی استعداد و قابلیت و اہلیت پیدا کر سکیں۔ اور اس عظیم پیشہ کی طرف ملک کے بہترین دماغوں، روشنیوں کے شہر کے درخشندہ و تابندہ چراغوں کو اس کے بغیر متوجہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو معاشرے میں بلند مقام دیا جائے۔

جن بچوں کے بارے میں یہ خیال ہو کہ وہ اعلیٰ تعلیم سے کچھ زیادہ مستفید نہ ہو سکیں گے انہیں زراعت، تجارت و صنعت کے مختلف پیشوں کی ایسی تعلیم دی جانی چاہیئے کہ آگے چل کر وہ اپنی روزی بھی کما سکیں اور قومی وقار میں بھی اضافہ کریں۔ یہ تمہارا ایک اہم ترین قومی مسئلہ ہے جو اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک تمہارے تعلیمی نظام میں دور رس تبدیلیاں نہ کی جائیں۔ اس وقت طلبا میں جو خلفشار و ہیجان پایا جاتا ہے وہ اس بات کی نمایاں علامت ہے کہ نظام تعلیم اور مواقع روزگار میں ہم آہنگی نہیں۔ اس سے نہ صرف ایک بڑا اہم انسانی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے بلکہ تمہارے قومی وسائل کا نقصان ہو رہا ہے۔

تعلیم و صحت کے سلسلہ میں جو کچھ حکومت کرے اس کے علاوہ نجی و ذاتی طور پر بھی بہت کچھ کرنا چاہیئے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیم و صحت کے ترقیاتی کاموں میں نجی و غیر سرکاری فیاضی کا بہت بڑا ہے۔ اس آسیب زدہ اندھیرے میں تعلیم بالغاں کے لئے

قومی کارکن رات کے وقت درس گاہیں چلا سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے نہ تو کسی عمارت کی ضرورت ہو گی اور نہ کسی خاص تربیت کی۔

معاشی تنظیم کے سلسلہ میں ایسے سازگار حالات پیدا کرو کہ ایمانداری کے ساتھ کھلے بازار میں مسابقت ہو۔ اس طرح افراد کی استعداد کار اور ان کے حوصلے کو پوری طرح آگے چلانے کا موقع ملے گا۔ امارت و غربت کے درمیان اتنا تفاوت باقی نہ رہے گا۔ ترقیات کو مربوط کرنے کے لئے معیشت میں منصوبہ بندی درکار ہوتی ہے۔

روشنیوں کے شہر میں اندھیروں کی چادریں اوڑھ کر دولت کے تعاقب میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگو ــــــــ!

تمہاری مہارت اور رسائی کا اظہار اپنے منصوبوں اور مشینوں سے زیادہ ارباب اقتدار کو قابو میں کرنا ہے۔ تم اپنی اس مہارت و رسائی پر اپنے منافع کے بل بوتے پر ایسی حیثیت حاصل کر لیتے ہو کہ تمہیں اپنے صنعتی اداروں اور ان کی مصنوعات کو پھیلانے کی خاطر خواہ سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ تمہاری فرموں، کمپنیوں، ایجنسیوں کی ظاہری شکل خواہ جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کی کیوں نہ ہو ان کے بیشتر حصص سرمایہ کاروں کے ہاتھوں ہی میں ہوتے ہیں۔ کاروباری معاہدوں اور دستاویزوں کے ذریعے تمہارے صنعتی اداروں پر تمہاری پوری کاروباری گرفت ہوتی ہے۔ پھر یہی سرمایہ کار ادارے بنک اور بیمہ کمپنیاں قائم کر کے سٹاک ایکسچینج سٹہ بازار کو بھی اپنے حسب منشا متاثر کرتے ہیں۔ اس صورت میں وہ قوم کی پس انداز رقموں کو استعمال کرتے ہیں اس کے ذریعے اپنے کاروبار کو مزید وسعت دیتے ہیں۔ حصول قرض کے وسائل پر ان کا انحصار ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ اپنی اقتصادی حیثیت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے کمزور حریفوں کو میدان سے بھگاتے ہیں اور نئے آنے والوں کو اپنے کاروباری مفادات کے تاج محلوں کی طرف بڑھنے سے روکتے ہیں۔ معاشی اقتدار حاصل کرنے کے لئے اپنے ذرائع کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ ذخیرہ اندوزی بھی کرتے ہیں۔ وہ مشتاق کاروباری مداری اور شعبدہ باز ہیں۔ ذخیرہ اندوزی کر کے دو لاکھ کی مالیت کی جنس کو بس ایک رات میں دس لاکھ کی بنا لیتے ہیں۔ ایسے ہتھکنڈے ایسے گر ایسے فارمولے

ان کی جیب میں پڑے ہیں۔ ایسے منافع کو ہتھیانے کے لئے قوانین مبادلہ کی خلاف ورزی اور محاصل سے فرار کے چور راستے بھی انہیں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ امیر سے امیر تر بنتے چلے جاتے ہیں۔ وہ الہ دین کا طلسمی چراغ پا لیتے ہیں۔ ادھر اسے گھساتے ہیں ادھر وہ جوچاہیں ہوجاتا ہے۔ اور پھر اگر اس معاشی قتل عام، معاشی سیوناڑ میں اگر قیمتوں پر کنٹرول لگایا جاتا ہے تو چور بازاری شروع ہوجاتی ہے۔ رشوت اور نفع اندوزی کے بازار گرم ہوجاتے ہیں۔

اور پھر سرمایہ کاروں کے طلسمی چراغ کے کرشمے اور کارنامے دیکھ کر کاروباری محاکمہ کرنے والوں میں رشک پیدا ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں اور پوری شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ دولت کی اس فسوں سازی و طلسم کاری کا اصل منبع تو ان کی ذات ہے لہذا دولت کی بہتی گنگا سے ان کو بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ پانی تو بس پانی ہے۔ گنگا کا ہو یا گھڑے کا۔ اگر پی سکتے ہو تو خوب پیو۔ اس طرح ایک رات میں لکھ پتی بننے والوں اور انہیں لکھ پتی بننے کی ڈھیل دینے والوں میں ایک ایسے باہمی تعاون کی راہ نکل آتی ہے جو دونوں کے لئے سودمند ہو۔ اور پھر اگر ان میں سے کوئی ایمانداری اور اصول پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے فرسودہ خیال سمجھا جاتا ہے۔ اسے کریک کہا جاتا ہے۔ اس کو اس کی زندگی پر ایک طنز سمجھا جاتا ہے غبی کہلاتا ہے۔ اور پھر سیاست دان اور روشنیوں کے جیتے جاگتے شہر کو اسلامی مملکت بنانے والے بڑے بڑے زعمائے ملت اور ارباب اقتدار بھی پر پرزے نکالتے ہیں۔ اور دولت کے ان دولت کدوں میں کھل کھیلنے کے لئے کھل کھیلنے والوں کے ہم قدم ہوجاتے ہیں اور پھر وہ جینئس کہلاتے ہیں۔ نابغہ کہلاتے ہیں۔

اور جینئس وہ ہے۔ جو اس جاگتے شہر میں بھوک اور بیکاری کی تاریخ کو ایک سگریٹ کیس میں بند کردے۔ جو سارے شہر کی دولت کو کوکٹیل اور شمپین کے ایک گلاس میں گھول کر پی جائے۔ جو کسی انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کے کسی کمرے میں کسی پلاٹینم بلانڈ سے، کسی ٹیڈی گرل، کسی ہپی گرل کے اور اپنے ننگے جسم کو چھپانے کے لئے اس شہر کے اندھیروں کی بروکنڈی چادر بنا کر اوپر تان لے۔ جو ملک و ملت کے کروڑوں روپے کا غبن کرکے بھی غنی کہلائے۔ جو سیاہ دست یعنی بہت بڑا کنجوس ہو لیکن مشہور ہو سخی ہے۔ جو بہت بڑا فراڈ ہو لیکن فرشتہ سمجھا جائے۔

جو ایک بہت بڑا اسکینڈل ساز ہو اور اس کی سیکنڈل سازی کو ملکی تعمیر و ترقی کی سنہری سرنوشت و سرنامے کا درجہ دیا جائے۔ جو روشنیوں کے اس شہر کو ہر سٹیج، ہر منبر، ہر پلیٹ فارم پر اسلامی مملکت بنانے کے چیختے ہوئے سائرن بجاتا ہو لیکن اس کی عملی زندگی میں اسلامی مملکت کی حیثیت ایک قحبہ خانے سے زیادہ نہ ہو۔ جس کی زندگی کے سب دروازے چور دروازے ہوں ـــــ بند دروازے ہوں۔ اور آسیب زدہ رات کے اندھیروں میں کھلتے ہوں۔ اور ان دروازوں کے پیچھے دھواں ہی دھواں، گھٹن اور بساند سے بھرے ہوئے بند کمرے ہیں۔ جن کا کوئی تالا نہیں۔ کوئی چابی نہیں۔ کیا کہتے ہیں ایسے کمروں کو ـــــ کھولی۔ یعنی جس نے چاہا کھول لی ـــــ!

ان کمروں کے مکین خود تو جا چکے ہیں اور اپنے پیچھے اپنی ننگی پرچھائیاں لہراتی چھوڑ گئے ہیں۔ جو ان کمروں کا آسیب ہیں۔ بد روحیں ہیں۔ خبیث روحیں ہیں۔ بھوت چھلاوے ہیں۔ جو دھواں دھواں فضائیں، گھٹن ہیں۔ بساند ہیں حشرات الارض کی طرح کلبلاتے ہوئے سایوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب سے گزر رہے ہیں۔ ان سایوں کا کوئی نام نہیں۔ یہ سائے دھواں دھواں خاکے ہیں۔ جو ان میں رنگ بھرے وہی اس آسیب زدہ رات کے پُراسرار اندھیروں کا جنئیس ہے۔ عبقری ہے۔ [illegible]!! جس کے جسد کا ایک ایک ٹانکا پراسراریت کے سناٹے میں بولتا ہے۔ جو ساری رات شراب اور سگار کے ساتھ ایک رات کی بیوی کو بھی پیتا ہو۔ جس کے بے شمار جانے پہچانے نام ہوں لیکن اس کا کوئی خاص نام نہ ہو۔ میکس فیکٹر میں چھپی پسی اس کی چھبی پر بے شمار داغ ہوں لیکن رسالوں اور اخباروں میں چھپنے والی اس کی کسی بھی تصویر میں اس کا کوئی داغ دکھائی نہ دیتا ہو۔ پریس یا تو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی ملکیت ہوتا ہے یا اشتہارات کی آمدنی کے باعث ان کے قابو میں ہوتا ہے۔ موجودہ صنعتوں میں بڑی بڑی تنخواہیں دینے کی گنجائش ہوتی ہے۔ بلکہ سرکاری ملازمتوں کو چھوڑ کر باقی تقریباً تمام آسامیاں جن کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوتی ہیں بڑے بڑے صنعت کاروں کے اختیار میں ہوتی ہیں۔ یہ ملازمتیں اثر و رسوخ بڑھانے کا مزید ذریعہ بنتی ہیں۔

اس طرح ملکی صحافت بھی ایک سراب بن کے رہ جاتی ہے۔ زلف و رخسار

کی بات ـــــ

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تیری زلفیں پریشاں ہو گئیں

صحافت کے نہ مٹنے والے نقوش بھی یوں مٹ جاتے ہیں جیسے ربر سے پنسل سے کھینچے ہوئے خطوط، جیسے نقش بر آب۔ جیسے صحرا میں کھلے پھول۔ جیسے پرتوِ خورشید سے ستارے۔ بقول غالب۔

کیسی کیسی صورتیں ہونگیں کہ پنہاں ہو گئیں

اس گول مارکیٹ میں صحافت بھی تازہ اخبار کی طرح بک جاتی ہے۔ لوح و قلم کا ضمیر بک جاتا ہے۔ لیکن ایسی صفائی سے کہ لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ دھچکا لگنے سے لوگوں کے دل دھڑدھڑاتے نہیں۔ صحافت کے دلہناپے کا سنگار اس چابکدستی سے کیا جاتا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا صحافت کی دلہن یکا دُگرہ یا بن گئی ہے۔ قارئین حضرات، اخبار بین حضرات اس حادثے سے بولاتے نہیں۔ اخبار کا چیچک سے سارا جسم کھد جاتا ہے لیکن اس متعدی مرض کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔

کئی جریدوں کو کالرا ہو جاتا ہے۔ ابکائیاں لیتی کثرت اسہال سے ٹھنڈی برف خبروں کے ذریعے بستی بستی گلی گلی چھوت چھات کے جراثیم پہنچ جاتے ہیں، اور خبروں کے کئی ریبا برف کی سل بن کر نہایت خاموشی اور سیدھے سادھے طریقے سے زمانے کی دھول میں دب جاتے ہیں۔ سفید سفید ان کی آنکھیں جھپاک سے جھک جاتی ہیں۔ پھر وہ سیدھے سپاٹ پڑے ہوتے ہیں سر جھکائے۔ بھیجا وچی نہیں کرتے۔

جنہوں نے صحافت کو گرگٹ بن کر رنگ بدلتے دیکھا ہے۔ خوب جانتے ہیں کہ صحافت کے بھی کئی رنگ ہیں۔ یعنی رنگیلی صحافت۔ رنگیلے ہونے کا شرف محمد شاہ رنگیلے ہی کو نہیں صحافت کو بھی کبھی کبھار اتفاقات زمانہ سے حاصل ہو جاتا ہے اور میر تقی میر کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

میرے تغیر حال کو مت دیکھ
اتفاقات ہیں زمانے کے

چراغ پر پھونک مار کر بجھا دیا ہے۔ کانپتی ہوئی ٹمٹماہٹ خاموش ہو کر سیہ پوش ہو چکی ہے۔ صحافت مہیب سایہ بن کر ڈول رہی ہے۔ جس کی کوئی شکل نہیں ہے۔ بے شکل سایہ۔

لیکن یہ اس صحافت کی بات نہیں۔ جو نہ خود کبھی بکی ہے اور نہ اس نے ملک و ملت کو کبھی بکنے دیا ہے۔ جس نے لاکھوں بھوکے ننگے برائے نام انسانوں کی بھوک و افلاس کا کبھی سودا نہیں کیا۔ جس نے لاشوں کے ڈھیر پر ڈکٹیٹری و آمریت کے کسی محل کو تعمیر کرنے کی کبھی حمایت نہیں کی۔ جو دار و رسن کی ہر آزمائش میں مظلوموں کے شانہ بشانہ دار و رسن سے کھیلتی آرہی ہے۔ جس نے سونے چاندی کے سکوں کے عوض کبھی اپنے ضمیر کو فروخت نہیں کیا۔ جس کا مطمع نظر، لائحہ عمل، نصب العین ملک و ملت کی خدمت کرنا ہے۔ خلق خدا کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قلم کو پلا دینا ہے۔ جس کے قلم کار، نمائندے، کارندے مدیر، ایڈیٹر، علمبردار، بے ضمیر، بدطینت، بدنظر، بداخلاق، بھیڑیئے اور گدھ نہیں سانپ نہیں۔ وہ روشن ضمیر ہیں۔ نیک نیت ہیں۔ نیک نظر ہیں۔ بااخلاق ہیں، انسان ہیں۔ انہوں نے ساری انسانیت کے دکھ درد کے استروں کی مالا اپنے گلے میں ڈالی ہوئی ہے۔ وہ سیاست کے غلام نہیں سیاست ان کے در کی غلام ہے۔ انہوں نے آج تک کسی سیاسی جوڑ توڑ سے کسی آسامی کسی کرسی، کسی ادارے پر قبضہ کرنے کے لئے کبھی کوئی نقلی چہرہ اپنے اصلی چہرے پر نہیں لگایا۔ وہ صاف باطن ہیں ان کو اپنا باطن چھپانے کی ضرورت ہی نہیں ان کے چہرے پر کوئی داغ نہیں وہ نقلی چہروں کو نہیں اپناتے۔ ان کے چہرے پر کوئی ایسے نقوش نہیں کہ تصنع و ملمع کی اوٹ لیتے پھریں۔ ان کے چہرے پر ان کے اپنے نقوش ہیں۔ اپنے خد و خال ہیں۔ کاغذی نقوش کے مینار پر بیٹھ کر ادب و صحافت کی مجاوری نہیں کرتے انہوں نے اپنے چہرے پر سچائی کی عینک لگائی ہوئی ہے۔ مکر و فریب، جعلسازی، مطلب برآری، موقع شناسی، ابن الوقتی، چاپلوسی، خوشامد، اثر و رسوخ کی گاگل آنکھوں پر لگا کر عظیم بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی آواز ان کے حلقوم میں کسی گھٹن کی وجہ سے گھٹی گھٹی نہیں۔ ان کی آواز نتھری ستھری اور ان کے ضمیر کی آئینہ دار ہے۔ وہ انسانوں کی عظمت کے

دکھ درد کے، ان کے مسائل کے، ان کی الجھنوں کے ترجمان ہیں۔ وہ رسالوں، ماہناموں اور جریدوں میں آپ اپنے ترجمان بنتے ہوئے لاؤڈ سپیکر نہیں بنتے۔

سیاست معاشی زندگی کا سب سے اہم عمل ہے جب ملک میں فوج سیاست میں دخیل ہونے لگتی ہے۔ تو وہاں فوجی جرنلوں کرنلوں کو فائدہ پہنچنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ان فوجی افسروں اور دیگر عناصر کے باہمی گٹھ جوڑ اور اثر و رسوخ سے ایک ایسا گروہ وجود میں آتا ہے کہ بس قیامت ہی آجاتی ہے۔ سیاسی گٹھ جوڑ سے کوئی فیلڈ مارشل کوئی ائر مارشل عنانِ حکومت سنبھال لیتا ہے یا کوئی سیاسی ہلچل و سیاسی ابتری خود ہی ملک کی عنان اس کے ہاتھ میں تھما دیتی ہے۔ آنے والا ابتدا میں تو جمہوریت کے ترانے الاپتا ہوا قصرِ امارت میں آتا ہے لیکن رفتہ رفتہ تنندوے کی طرح اپنے قہر و غلبہ اور قوت و اقتدار کے تار چاروں طرف پھیلاتے ہوئے آمرِ مطلق بن جاتا ہے اور اپنی آمریت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے انسانوں میں سے جسے چاہے مکھی یا مچھر سمجھتے ہوئے چٹکی میں مسل دیتا ہے۔ اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ہولناک جنگ میں آگ اور خون کے طوفانوں میں تیرتے ہوئے حاصل کی ہوئی فتح کسی بالادست طاقت کے دباؤ میں آکر میز پر کاغذ کے ایک پرزے کی صورت میں شکست میں بدل جاتی ہے ——— انا للہ و انا الیہ راجعون ———!

ایسے ملکی و ملی حادثات کو کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایسے قومی سانحوں کی تفسیر و تعبیر کیا ہو سکتی ہے جن میں ملک کا ایک حصہ اس کے جسم سے کٹ چکا ہوتا ہے لیکن اس کا سربراہ ساغر و شراب میں غرق ہوتا ہے۔ کڑکتی چمکتی بجلیاں نشیمن کے ایک حصے کو جلا کر خاک کر چکی ہوتی ہیں اور شراب کے نشہ میں بہکی بہکی بڑبڑاہٹ کسی ناظورہ جمال کے آغوش میں مدہوش عمر خیام کے ہونٹوں سے یوں نکل رہی ہوتی ہے جیسے خواب میں بول رہا ہے نیند میں بڑبڑا رہا ہے۔

چلو تسلیم کئے لیتے ہیں کہ شراب کے عادی ہیں۔ پیتے ہیں۔ پی لیتے ہیں۔ پری چہرہ و پری زاد پلا دیتے ہیں۔ پی لی ہے۔ پینا ہی پڑی ہے۔

میں تو نہیں پیتا ہوں میں نے تو نہیں پی ہے\
ساقی کا اشارہ ہے ساقی کی خوشی کی ہے

اور یہ بھی تسلیم کہ شکست بس شکست ہی تو ہے۔ شکست ہونی تھی، شکست ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کسی طرح تسلیم نہیں کہ اعلان شکست میں شکست کا اعتراف کم لیکن شراب کی بو زیادہ ہو۔ شکست کی کی بو کھلاہٹ تو کم ہو لیکن ہکلاہٹ و لکنت اس قدر زیادہ ہو کہ بولنے والا شکست خوردہ سربراہ کی بجائے وہسکی کی خالی بوتل معلوم ہو۔ Still going Strong Like Scotish Brewery

وجاہت وحیثیت اور معاشی اقتدار کے باعث دیہی علاقوں میں زمیندار طبقہ انتخابات کے معاملے میں بہت با اثر ہوتا ہے۔ اس طبقے کے ہوشیار افراد دیکھتے ہیں کہ صنعت کاروں کے زمرے میں شریک ہو جانا کس درجہ سود مند ہے۔ اس طرح ہوشیار تاجروں، زمینداروں اور سیاسی اقتدار رکھنے والوں کا ایک مختصر سا گروہ ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ معیشت کے سب سے زیادہ نفع بخش حصے پر اس کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ اور وہ پوری معیشت کو جس طرح چاہتا ہے استعمال کر لیتا ہے۔ قرض دینے والے اداروں اور پریس پر اس کی گرفت ہوتی ہے۔ نظم ونسق کے شعبوں سے اس کے گہرے روابط ہوتے ہیں۔ روپے کے اثر سے سیاست کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اور ان سب حربوں سے لیس ہو کر انتخابات جیتے جا سکتے ہیں۔

اگر کوئی ملک باہر سے قرض لیتا ہے تو قرض دہندہ ملک اپنی شرح سود اس پر عائد کرتا ہے جبکہ ایک غریب ملک رفتار ترقی بڑھانے کے شوق میں اتنا قرض لے لیتا ہے جسے ادا کرنے کی استعداد ہی اس میں نہیں ہوتی۔ اس میں یہ خطرہ بھی ہوتا ہے کہ غریب ملک بیرونی قرضے لے کر روزمرہ کی ضروریات میں صرف کر لیتا ہے۔ اور عارضی طور پر ملک میں نمائشی ترقی وخوشحالی کی فضا پیدا کر دیتا ہے اور چونکہ ہر بیرونی قرضے کے لئے پانچ سات سال کی مدت ایسی ہوتی ہے جس کے اندر ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت وقت ان دشواریوں پر پوری طرح نظر نہیں رکھ سکتی جن کا سامنا چند سال کے عرصے میں اس کے بعد آنے والی حکومت کو کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قرضے غیر اہم منصوبوں پر صرف کر دیئے جائیں۔ اور ان کے ذریعے وہ وسائل بروئے کار نہ لائے جائیں جن کی مدد سے ان قرضوں کی ادائیگی ہو سکتی ہو۔ غیر دانش مندانہ قرض گیری یا اس کا غیر دانش مندانہ مصرف کسی بھی ملک کو چند سال بعد شدید اقتصادی وسیاسی ابتری میں مبتلا کر سکتا ہے۔

جن قوموں میں جمہوری قوتیں کمزور ہیں اور دولت مند کو موروثی حیثیت سے زیادہ اہمیت و قوت حاصل ہے وہاں نفع اندوزی کی حرص حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہ صورت حال ان تمام پسماندہ ممالک میں پائی جاتی ہے جہاں ترقی یافتہ ممالک کی طرح سرمایہ داری میں نہ تو بالغ نظری پیدا ہوتی ہے اور نہ اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس و شعور پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم پلک جھپکتے میں وہ معاشی، سیاسی، اور معاشرتی حالات پیدا نہیں کر سکے۔ جو ترقی یافتہ ممالک میں موجود ہیں۔ جہاں تک اقتصادی ترقی کی ضرورت کا تعلق ہے یہ تمہارے وجود و بقا کا مسئلہ ہے تنازع البقا میں زندگی کا انحصار علم، توانائی، تنظیم، اتحاد اور اخلاقی روح پر ہے۔ یہ تمام عوامل یقیناً ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن تجربہ کی خاطر ان عوامل کو علیحدہ علیحدہ دیکھنا چاہیئے۔ کوئی قوم یا تہذیب اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکتی اگر وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کوتاہی کرے۔

غیر ترقی یافتہ ممالک کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے وسائل کی نگہداشت اور ان کے صحیح استعمال میں پوری احتیاط اور توجہ سے کام لیں۔ پیداوار اور درآمد پر اگر قابو نہ رکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ عوام اور ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کی ضروریات پوری کرنے کی بجائے دولت مندوں کے سامان تعیش فراہم کرنے کا ذریعہ بن جائیں محض مالیاتی پالیسی یا دوسرے بالواسطہ اقدامات ان رجحانات کی روک تھام کے لئے کافی نہیں ہیں، اس کے لئے منصوبہ بندی ناگزیر ہے۔ کیونکہ قومی مساعی کو وہی مربوط کر سکتی ہے۔

سماجی عدل اور معاشی ترقی کے لئے سب سے پہلی ضرورت ایک دیانت دار اور منصف مزاج انتظامیہ ہے کسی نااہل اور غیر دیانت دار بیوروکریسی کے لئے سماجی تعمیر کا کام ممکن نہیں۔ اس سلسلہ میں تمہاری اصل پریشانی یہ نہیں کہ پڑھے لکھے لوگ نہیں ملتے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ایسے لوگ کم نظر آتے ہیں جن کی سیرت و کردار پر بھروسہ کیا جا سکے۔ اس معاملہ میں جو چیز حارج ہے وہ تمہارے اندر فنی واقفیت اور سوجھ بوجھ کی کمی نہیں بلکہ کردار کا فقدان اور فیصلہ کی خود سری ہے۔ بے جا مداخلت اور کنٹرول نوکرشاہی کی بری یادگاریں ہیں۔ پھر وہ نہیں بولتے کرسی بولتی ہے۔ پیچیدہ ضابطوں سے لوگوں کے ہاتھ

پیر باندھ دیتے ہیں۔ عملی اقدام کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ کنٹرول نافذ کرنے کے لئے محکموں میں توسیع ہوتی ہے۔ مصارف بڑھتے ہیں۔ محصول میں اضافہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی قوت خرید گھٹ جاتی ہے۔ اس سے سعی د جہد کے جذبہ، مواقع کی یکسانی اور معاشی ترقی کو ناقابل بیان نقصان پہنچتا ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمتہ کی بصیرت ناقابل تسخیر عزم اور دیانت داری نے ملت میں اتحاد، تنظیم اور یقین پیدا کیا۔ اور ان ہی خصوصیات کی بنا پر ملت اسلامیہ نے ان کی رہنمائی میں پاکستان حاصل کیا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ پاکستان ایک ایسا جمہوری ملک ہوگا جس کی بنیاد سماجی عدل کے اسلامی اصولوں پر ہوگی۔ جدید جمہوریت ایک ایسا نظام حکومت ہے جس میں عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں۔ اور ان نمائندوں کو قومی امور کے فیصلہ کا اختیار دیا جاتا ہے۔ اور ان امور کو صحیح طور پر بجا لانے میں عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔

یہ ساری باتیں اسلامی نظریات کے مطابق ہیں۔ خلافت راشدہ کے دور میں بیعت کے معنی یہ ہوتے تھے کہ لوگ اس شخص کی خلافت پر راضی ہیں۔ یہ چیز آج کل کے عام انتخابات ہی کی طرح تھی۔ خلیفہ بھی اسلامی قانون کا اتنا ہی پابند تھا جتنا کوئی دوسرا شہری۔ اور اسکی اطاعت صرف اس وقت تک واجب تھی جب تک کہ وہ قانون کی بالادستی قائم رکھتا اور بڑے فیصلے صحابہ رسول کے مشورے سے کئے جاتے اس لئے کہ فطری طور پر یہی لوگ اس معاشرے کے رہنما تھے۔

عدلیہ کو پوری آزادی تھی اور خود بسا اوقات خلیفہ کو عدالت کی طلبی پر قاضی کے سامنے حاضر ہونا پڑتا تھا۔ خلیفہ اور اس کے مقرر کردہ عامل عوام کے سامنے اپنے انتظامی افعال اور ذرائع آمدنی کے لئے جوابدہ تھے۔

خلیفہ کو بیت المال سے صرف اتنا ملتا تھا کہ ایک عام شہری کی طرح زندگی بسر کر سکے۔ وہ عوام کی دولت اور ان کی بھلائی کا ذمہ دار تھا۔ وہ ان کا آقا نہ تھا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خلافت راشدہ مطلق العنانی کی حکومت تھی وہ بالعموم یہ بھول جاتے ہیں کہ

صدر مملکت کے پاس جابرانہ فرمانروائی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ حکومت کے خزانے پر کوئی باقاعدہ فوج قائم نہ تھی۔ جب کبھی کسی مہم پر جانا ہوتا تو رضا کاروں کا تعاون حاصل کیا جاتا۔ اسوقت کوئی پولیس یا بیورو کریسی نہ تھا۔ خلیفہ کے پاس نہ محافظ ہوتے تھے اور نہ ہی وہ خود کسی طاقت سے کام لے سکتا تھا۔ اس کا اختیار صرف اخلاقی نوعیت کا ہوتا تھا۔ اس وقت کی معیشت زراعت مویشیوں کی پرورش اور تجارت پر منحصر تھی۔ اور ان چیزوں پر ریاست کا کچھ زیادہ کنٹرول نہ ہوتا تھا۔ ٹیکس بہت کم تھے۔ اور ان میں سب سے اہم زکواۃ تھی۔ جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ قوت خرید امیروں سے غریبوں کی طرف منتقل ہوتی رہے۔ دوسرے شہریوں کی طرح خلیفہ بھی بازار میں جاتا تھا۔ عوام کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ اور کبھی کبھی ان کی پوچھ گچھ۔ احتساب اور تنقید کا نشانہ بھی بنتا تھا۔ اور یہ سب کچھ عین جمہوری ہے۔ اسی کو جمہوریت کہتے۔ چنانچہ پاکستانی ہونے کے اعتبار سے اور مسلمان ہونے کے اعتبار سے بھی جمہوریت تمہارا پیدائشی حق ہے۔ لیکن جمہوری روح کے بغیر محض جمہوری مظاہر نہ عوام کو مطمئن کر سکتے ہیں اور نہ ہی دیر تک چل سکتے ہیں۔ اور نہ جمہوریت کا مطلب لاقانونیت ہے۔ کوئی منظم کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ پابندی کے لئے کچھ قوانین نہ رائج ہوں۔ کیونکہ حکومت میں مضبوطی کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔

عوام کے رہنما کی حیثیت سے علما کی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر ان کی اخلاقی وذہنی پستی کی وجہ سے اسلام کی رسوائی ہے تو اس کے لئے وہ جواب دہ ہوں گے۔ علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی خیر خواہی، خلوص، حب الوطنی، نظریہ پاکستان سے لگاؤ پاکستان میں اسلامی جمہوریت کے قیام کی خواہش شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ انہیں اپنے اس نیک عمل کو بدستور جاری رکھنا چاہیئے۔ اسلام ایک اکائی ہے۔ اور وہ زندگی کے تمام معاملات یعنی مسجد کی نمازوں سے لے کر میدان جنگ تک اعلائے کلمتہ الحق کی جدوجہد پر حاوی ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے لئے منظم کوششوں کی ضرورت ہے۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر اس اسلامی معاشرے میں نئی نئی چیزیں، نئی نئی بدعتیں جنم لے رہی ہیں۔ فحاشی و شہوانیت کا عروج، بداخلاقی کا زور، منشیات

کی کثرت، جوا، رقص وسرود، قتل وغارت، اغوا کی وارداتیں، ڈکیتی کی وارداتیں۔ ایک ایسا ماحول پیدا کررہی ہیں جس میں اسلامی اخلاقی اقدار کا پروان چڑھنا ناممکن ہوگیا ہے۔ انسان کی جنسی جبلت فطری طور پر اتنی منہ زور اور بیباک ہے کہ اسے مزید مشتعل کرنے یا ابھارنے کی بجائے اس پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے، آرٹ، تفریحات اور اشتہار بازی میں جنس کو تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کرنا تمہاری تہذیب پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ اس لئے کہ اس طرح جو جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں وہ جنسی کجروی و بے راہ روی، فحاشی و بدکاری جرائم ولاقانونیت کا سبب بنتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ تاریخ کے باپ ابن خلدون نے بہت پہلے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"غلام قومیں بے روح ہو جاتی ہیں۔ اپنی اچھائیوں کو اچھائیاں سمجھنا چھوڑ کر فاتحین کی برائیاں اپنانا شروع کردیتی ہے۔"

لہذا وہ برائیاں جو فاتحین پیچھے چھوڑ گئے ہیں ابھی تک یہاں موجود ہیں اور رفتہ رفتہ پورے معاشرے میں پھیل کر تباہی و بربادی کی طرف رہنمائی کررہی ہیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

"جب کسی قوم کسی ملک کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہم اتمام حجت کرتے ہیں۔ بس پھر اس کے بعد اس قوم کو ہلاک کردیتے ہیں اور وہ ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔"

تالیف معاشرہ اور سماجی بہبود کا کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد قومی تعمیر نو کے لئے اپنا وقت اور اپنی توانائی صرف نہ کرے۔ بجائے اس کے فرصت کے اوقات میں تم لوگ جنسیت زدہ فلمیں دیکھو یا گپ سپ لڑاؤ سماجی اصلاح کے کام کرو۔ جیسا قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

"تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے اٹھایا گیا ہے۔ تم اچھائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔"

تم اس عالمگیر برادری کا ایک حصہ ہو جو انسانیت کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ تم کو اسلامی دنیا کی آزادی، قوت، خوشحالی اور اتحاد کی جدوجہد میں ساتھ دینا چاہیئے۔ ہر اسلامی ملک سے قریبی رشتہ قائم کرنا چاہیئے۔ اور اس دن کیلئے جدوجہد کرنا چاہیئے جبکہ تمام اسلامی ممالک اسلامی دولت مشترکہ کی تشکیل پالیں۔ اگرچہ اسلامی دنیا نے استعماری حکومت کی غلامی سے نجات پالی ہے لیکن اب بھی اس کے جسم پر فلسطین اور کشمیر کے دو گہرے گھاؤ ہیں۔ ایک پر اسرائیل نے اور دوسری طرف ہندوستان غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے اور وہاں کے مسلمانوں پر مظالم توڑتے ہوئے ان کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ ان علاقوں کو استعمار پرستوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے تمام اسلامی دنیا کو متحد ہو کر جدوجہد اور قربانی دینی چاہیئے۔ ہر ظلم کا خاتمہ کرنے کے لئے قربانی سے بڑھ کر کوئی موثر ہتھیار نہیں۔

تنازعہ کشمیر کی تاریخ جھوٹے وعدوں اور طفل تسلیوں کی تاریخ ہے۔ ہندوستان کشمیر میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ہزاروں وعدے کر کے مکر چکا ہے۔ کشمیری عوام کے ساتھ بہیمانہ سلوک ابھی تک جاری ہے۔ کشمیری عوام کو حق خود اختیاری کا مسئلہ ہنوز بین الاقوامی ادارہ حقوق آزادی انسان کے کولڈ سٹوریج میں ایک مردہ لاش کی طرح پڑا ہے۔ انسانی حقوق کے منشور کی آنکھیں ابھی تک اس کے مکر و فریب کا پول نہیں کھول سکیں۔ ہندوستان پاکستان کا آدھا حصہ بہ زور شمشیر اس سے چھین کر لیا گیا ہے لیکن تم یا کشمیری عوام اس سے کشمیر کو ابھی تک بہ زور شمشیر نہیں چھین سکے، وہ کل بھی تمہارے لئے چیلنج تھا اور آج بھی تمہارے لئے چیلنج ہے۔ تلوار کے مسائل باہمی افہام و تفہیم اور کاغذی کارروائیوں سے حل نہیں ہوا کرتے۔ اور یاد رکھو انسان کی آزادی کی تاریخ تلوار و خون کی تاریخ ہے۔ جنگ و جدل کی تاریخ ہے۔

شب گزیدہ لوگو ——— !

میں مسلسل تم سے کہتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن تم ہو کہ میری آواز پر کان ہی نہیں دھرتے۔ میری ہر لکار، ہر آواز صدا بصحرا ہے۔ جیسے تمہارا مجھ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ تم مجھے جانتے

پہچانتے ہی نہیں۔ اور یہ تم سے کچھ بعید نہیں۔ تم جس سماج میں رہتے ہو خود غرضی اس کا دستور اور حق تلفی اس کا رواج ہے۔ جبکہ بے جان چیزوں سے اس قسم کا جذباتی لگاؤ محسوس کرتے ہوئے مجھے بھی اپنے آپ سے اب شرمندگی ہو رہی ہے۔

تم زندگی کے اس فرسودہ پیٹرن کے عادی ہو گئے ہو۔ تم نے اپنی زندگی کا کوئی پیٹرن اب تک نہیں بنایا۔ تم میرے پاس آکر بھی کہیں دور رہ گئے ہو۔ میں ہی تمہارے لئے اجنبی نہیں ہوں۔ تم اپنے لئے بھی ابھی تک اجنبی ہو۔ تمہیں تلاش ذات ہے اور نہ شعور ذات۔ تم سراب اندر سراب بھٹکتے چلے جا رہے ہو۔ مگر میں سراب نہیں حقیقت ہوں۔ گرداب نہیں ساحل ہوں۔ پھر یہ سراب اور گرداب کیوں ہیں ؟

ننگی رات ننگے لوگ

شب گزیدہ لوگو ——— !

تمہاری نئی نسل۔ نئی پود۔ پاکستان کی نئی پود مغرب کی تقلید کرتے ہوئے جنس و جرائم کی بھول بھلیاں میں تباہ ہو رہی ہے۔ وہ یکدم عریاں ہو کر اپنے سامنے آگئی ہے۔ تمہارے سامنے آگئی ہے اور اپنی عریانی و برہنگی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتی ہے۔ ان کی زندگی لنگڑی ہوگئی ہے۔ اور جنسیت و شہوانیت کی بیساکھی لئے چل رہی ہے۔ اپنی ملی حمیت و عزت کو خود فریبی کے کھلونوں سے نہ بہلاؤ۔ نائٹ کلبوں اور ہوٹلوں میں جا کے دیکھو جہاں تمہاری عزت بہی بنی شراب پیتے ہوئے گٹار اور وائلن کی سریلی آوازوں کے بھنور میں غضب کا ٹوسٹ کرتی ہے۔

لپ سٹک سے بھیگے ہوئے ہونٹ۔ بکھرے بکھرے بہے بہے لانبے بال۔ شراب کے نشے میں فضائے نغمہ و نور میں پھریریاں لیتی تمہاری تہذیب کی سنہری تتلیاں جب نشے میں بہک کر ڈولنے ڈگمگانے لگتی ہیں۔ تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگتی ہیں۔

"ڈارلنگ۔ سویٹ می۔ یوں نہ ڈگمگاؤ میری ساری زندگی ڈگمگانے لگے گی۔"

اور پھر وہ جب ساری رات نائٹ کلبوں کے بال رومز اور پرائیویٹ کمروں میں گزار کر صبح کو واپس لوٹتی ہیں تو ان تصویری پیکروں کا کوئی نقش فریادی نہیں ہوتا بلکہ رات کو بے تحاشا پی ہوئی کے اترتے ہوئے خمار میں یہ شعر گنگنا رہا ہوتا ہے۔

یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
میری صبح کہہ رہی ہے میری رات کا فسانہ

اور پھر آنے والی رات کا جس بیقراری سے انتظار کیا جاتا ہے۔ اس کی تصویر کشی کے لئے یہ شعر ہی کافی ہے۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

معصیت، نفس پرستی، جسم فروشی کے ہجوم وہنگامے میں قوم کی ہپی ازم کی پرستار لڑکیوں نے اپنے آپ کو ایک جنسی چٹخارہ بنا لیا ہے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ نئے عشاق کی تلاش میں گزرتا ہے۔ وہ اپنی روح کے تعفن کو ڈھانپنے کے لئے اپنے جسم کے ہر رونگٹے کو دلکش و دلفریب لونڈروں اور سینٹوں سے سرابور کرکے گھر سے نکلتی ہیں۔ شرم وحیا کی ایک دھجی بھی انہوں نے اپنے وجود پر نہیں رہنے دی۔ وہ عریاں ہیں، شیطان کی طرح عریاں۔ منشیات ومسکرات کے استعمال اور جنسی میل جول کی کثرت نے ان کی زندگی کو اس قدر مسخ کر دیا ہے کہ شاید وہ خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکیں۔ تمہاری تہذیب کے گندے انڈے یعنی مغرب زدہ لڑکے اور لڑکیاں اپنی نفس پرستی میں مسلسل منہمک ہیں۔ جو ایک بیماری کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اور اتنی سرعت سے پھیل رہی ہے کہ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آرہا ہے، اسکول، کالج، سینما، سیرگاہیں، ہوٹل، نائٹ کلب، گلیاں، محلے سب اسی کی لپیٹ میں ہیں۔

فحش فلمیں، بے پردگی، ہوٹل، نائٹ کلبیں، فحش ناول، جنسی کہانیاں، جنسی ڈائجسٹ، جنسی فعل کی ننگی تصویریں اس مرض کے جراثیم پھیلانے میں ممد و معاون ہیں۔ اس قسم کا فحش لٹریچر آنہ لائبریریوں سے درپردہ مل جاتا ہے۔ ایسی لائبریریاں ہر گلی محلے میں موجود ہیں۔ شریف گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں ان لائبریریوں کی مستقل گاہک ہیں، یہ کتابیں، یہ تصویریں چوری چھپے دیکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ غریب اور متوسط کنبوں کے علاوہ اونچے گھرانے کی شریف زادیاں، پردہ نشین خواتین اور شریف زادے ان سے جنسی تسکین حاصل کرنے کے لئے ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ پس پردہ یہ فحش

ناول یہ فحش تصویریں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی وساطت سے اسکولوں اور کالجوں کی یاترا بھی کرتی ہیں۔ ایک شریف گھرانے کی لڑکی لڑکے کو ہپی، ٹیڈی سے طوائف اور عیاش بنانے میں جادو کا اثر رکھتی ہیں۔ قانون نے فحاشی کے اڈے بند کر دیئے ہیں۔ چکلے بند کر دیئے ہیں لیکن بدکاری پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس آسیب زدہ رات کے اندھیروں میں وہ کونسی جگہ ہے جہاں بدکاری نہیں ہوتی۔ ایک گٹر ایک بدرو بند کر دینے سے معاشرے میں گلی گلی محلے محلے گٹر اور بدرو بننے لگے ہیں نئی تہذیب کے پردوں میں بدچلنی و بدکاری نے پراسرار کہانیوں کی طرح بڑے پراسرار راستے نکالے ہیں جنسی و جرائم کے۔ بڑے پراسرار اور طلسماتی دریچے کھولے ہیں بدکاری کے۔ اپنے آس پاس کھلے ان دریچوں سے شریف گھروں میں جھانک کر دیکھو۔ کالجوں سکولوں اور کیمپس میں جھانک کر دیکھو۔ ہوٹلوں اور سیر گاہوں اور نائٹ کلبوں کے پرائیویٹ کمرں اور تہہ خانوں میں جھانک کر دیکھو۔ سنسان سڑکوں پر اندھیرے میں کھڑی کاروں میں دیکھو تمہیں اسلامی مملکت کی گمراہ اور بہکی ہوئی برائے نام کنواریاں بڑے بڑے قوم پرستوں، ملت سازوں، ملک کے رکھوالوں، رہنماؤں، لیڈروں، کامریڈوں، غلاموں بلنغ الملکوں، نوابوں، جاگیرداروں، وڈیروں، شہزادوں، ایڈیٹروں، کالم نگاروں، فنکاروں کے ساتھ شراب پی کر ٹوسٹ کرتے اور فلاش و برج کھیلتے نظر آئیں گی۔ بلند بام حویلیوں میں، بنگلوں میں، عالی شان تاج محلوں میں، شالاماروں میں، گلبرگوں میں، نائٹ کلبوں میں۔ جن کی دھواں دھواں فضاؤں میں منشیات کی بو رچی ہوتی ہے، ان کلبوں سے باہر آ کر جوا کھیلا جائے تو جرم لیکن ان کے اندر سرمایہ داروں کی گیم ہے کوئی قانون کوئی خاکی نیلی وردی ادھر آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ باہر شراب بند، ممنوع لیکن ان ہوٹلوں اور کلبوں میں امتناع شراب کے باوجود شراب دن رات چوبیس گھنٹے ملتی ہے۔ چرس کوکین، مارفیا، ہیروئن اور امریکن گانجا، ماریجوانا خفنا چاہو اور جس وقت چاہو لے لو۔ کنواری مائیں اور کنوارے باپ آج کل چرس اور ماریجوانا کو جنون کی حد تک پیار کرتے ہیں اور پیتے ہیں۔ کالجوں اور سکولوں کی کئی لڑکیوں کو تو ان نشوں کی لت پڑی ہے

کہ ان کی عادی ہوگئی ہیں اور ان نشوں کو استعمال کرنے کی انہیں کچھ تکنیک آتی ہے کہ جب وہ جھولتی گھر میں قدم رکھتی ہیں تو ڈیڈی اور ممی کو بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی لاڈلی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ LOVE SPOT سے آئی ہے۔ اور مارجوانا کے اڑن کھٹولے میں بیٹھی ہے۔ چرس کے طلسمی گھوڑے پر سوار ہے۔ اور اگر معلوم ہو بھی جائے تو Never Mind صاحبزادی کو بڑی سوشیل۔ ایڈوانس اور الٹرا ماڈرن سمجھا جائے گا۔ لیکن اسے کوئی یہ نہیں کہے گا کہ تو بدچلن ہوگئی ہے۔ بدکار ہوگئی ہے۔ تو چلتا پھرتا چکلا بن گئی ہے۔ تو اب اسلام کی بیٹی نہیں۔ پاکستان کی بیٹی نہیں۔ تو ہماری بیٹی نہیں۔ تو نئی تہذیب کی بیٹی ہے۔ تو نئے اجالوں کی تاریکی ہے۔ تو اس آسیب زدہ رات میں اپنا شکار ڈھونڈتی ہوئی چڑیل ہے۔ تو نسوانیت کی گردن پر سانس لیتا ہوا کاربنکل ہے۔ تو اس قوم میں سے نہیں ہے جس نے حضرت خولہ اور حضرت ام سلمیٰ ایسی برگزیدہ عورتیں پیدا کیں۔ تو اس ملت کی بیٹی نہیں جس نے ایسی عظیم مائیں بھی پیدا کیں جنہوں نے خالد، طارق اور محمود غزنوی ایسے سپوت پیدا کئے۔

شب گزیدہ لوگو!

اپنے اعمال و افعال کے اس آئینے میں جھانکو۔ اور اپنے ننگے جسم ہی نہیں ننگے ضمیر بھی دیکھو۔

یہ تمہاری نئی پود ہے۔ عورت نما مرد۔ جو زنانہ اور مردانہ دونوں صنفوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو بیک وقت مردانہ اور زنانہ خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مرد کی ایک عورت کی۔ جیسے عہد عتیق کے بعض دیوتا مردانہ اور زنانہ دونوں خصوصیات رکھتے تھے۔ اس لئے وہ جنسی تسکین کے لئے کسی کے محتاج نہ تھے۔ اس زمانے کے لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ ایسے دیوتا دوسرے دیوتاؤں اور انسانوں کو خود ہی پیدا کرتے ہیں۔ تمہاری اس نئی پود کا شاید یہی اعتقاد ہے۔ اور اس قسم کے اعتقادات ایک دو ملک میں نہیں بلکہ اکثر ممالک میں دیوتاؤں کی جنسی پرستش کسی نہ کسی طریقہ پر ہوتی تھی۔ کچھ ایسے دیوتا بھی تھے جو سامنے انسانوں کا جسم رکھتے تھے اور پیچھے جانوروں کا۔ بھارت میں شیوا نامی دیوتا نصف عورت کے جسم کا ہے۔ ہندوستان میں اب بھی دھرتی۔ چاند اور سورج کی پوجا کی جاتی ہے۔ ان میں بھی جنسی اشاریت

ملتی ہے۔ مثلاً سورج کو زندگی بخشنے والا مرد اور دھرتی سورج سے زندگی حاصل کرنے والی عورت متصور کی جاتی ہے۔ چاند اور پانی کی بھی پرستش کی جاتی ہے اور انہیں مونث سمجھا جاتا ہے۔ آگ کی پوجا بھی بحیثیت ایک مرد کے کی جاتی ہے۔ اجنٹا اور ایلورا کے غاروں میں ایسی ایسی حسین و جمیل مورتیاں کھدی ہوئی ہیں جن کے ہاتھ اور انگلیوں سے بڑی صفائی اور خوبی سے جنسی اشارے مترشح ہیں۔ بلکہ ہاتھوں اور انگلیوں کی حرکت سے ایک جنسی زبان وجود میں آگئی تھی۔ ہاتھوں اور انگلیوں کی مختلف حرکات و سکنات مختلف معنی رکھتی تھیں۔ آج بھی آسیب زدہ رات کی نائٹ کلبوں میں جا کر اپنی جنسی کٹھ پتلیوں کو دیکھو کہ جب وہ ٹوسٹ کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی بڑی انگلیوں کو اٹھا کر باہم ملاتی ہیں عورت کی جنسی تصویر بنتی ہے۔ اس طرح مرد کے عضو کی تصویر انگوٹھے کو سیدھا کر کے باقی انگلیوں کو ہتھیلی سے لگا کر بنائی جاتی ہے بڑی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی کو ملا کر گول دائرہ بنا کر عورت کے عضو مخصوص کی شکل بنائی جاتی ہے۔ ہندوستانی کلاسیکی رقص منی پوری، کتھا کلی اور بھرت ناٹیم میں یہ تمام شکلیں اب بھی جلوہ گر ہیں۔ جب دونوں ہتھیلیوں کو رقص کرتے ہوئے ملایا جاتا ہے اور بڑی انگلیوں کو اٹھا کر دوسری انگلیوں میں جکڑا جاتا ہے تو اس سے مرد اور عورت کا جنسی ملاپ ہوتا ہے۔ سواستیکا ہندوؤں کا ایک متبرک نشان ہے۔ سواستیکا میں بھی جنسی اشارات ملتے ہیں۔ اگر اس کے سرے بائیں جانب بڑھے ہوئے ہوں تو وہ صنف نازک کی اور دائیں جانب ہو تو مرد کی جنسی نمائندگی کرتا ہے۔ بدھ مت والے سواستیکا کو افزائش نسل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ برما میں ایک بت زمین سے کھودا گیا جس کے عضو مخصوص کے پاس سواستیکا کا نشان لگا ہوا تھا۔

ہندوستان کے دور افتادہ علاقوں میں گونڈ بھیل ایسے قبیلے درختوں، ٹیلوں، پہاڑوں کی چوٹیوں کو مردانہ اور پہاڑی دروں وغیرہ کو زنانہ نشانیوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مچھلی مذہبی نشان کی حیثیت سے ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کو جنسی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بعض ہندو فرقوں نے مچھلی کے منہ کو عورت کے رحم یا اس کے عضو مخصوص کے منہ سے مشابہ متصور کیا ہے۔

سانپ بھی ایک اہم اور قدیم نشانی ہے۔ بعض دفعہ تصاویر میں سانپ کو اپنی دم کھاتے ہوئے دیکھایا گیا ہے۔ یہ جنسی طور پر خود مکتفی ہونے کی علامت ہے۔ مرد اور عورت دونوں کی خصوصیات کا نشان ہے۔ قدیم یونانی مندروں میں زندہ سانپ لے جاتے تھے۔ جن کی پوجا یونان کی دوشیزائیں کیا کرتی تھیں۔ اور ایسی لڑکیوں کو Pythoneses سانپ والی عورتیں کہا جاتا تھا۔ اپولو دیوتا کے مندر کی ننگی دیو داسیاں سانپ پالا کرتی تھیں۔ سانپ جنسی خواہش کا نشان ہے۔ ہندوستان میں ناگ پوجا ابھی اس طرح رائج ہے۔ جب یہ تمہاری دقعکاری ہوئی کنواریاں ٹوسٹ کرتے ہوئے سانپ کی طرح پیچ وخم کھاتی ہیں تو سرتاپا جنسی خواہش ہوتی ہیں۔ نسوانیت سے لپٹی ٹانگیں معلوم ہوتی ہیں۔

اس طرح گل لالہ توانائی اور قوت مردانگی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ انجیر کو کنواری لڑکی کے رحم سے مشابہ تصور کیا جاتا ہے۔ پتھروں کے اکثر بت جنسی اشاریت کے حامل ہیں۔ بلکہ بعض شکلیں بھی مردانہ یا زنانہ عضو مخصوص سے ملتی جلتی ہے۔ بھارت میں شیولنگ کی پوجا کی جاتی ہے۔ نئے سرے سے حال ہی میں اسے سومنات کے مندر میں نصب کیا گیا ہے۔ چولی مارگی۔ اور وان مار یوگی مندروں میں اب بھی دو فرقے ہیں جن میں مرد اور عورت کے عضو مخصوص کو روزمرہ کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اکثر عورتیں اور مرد اس شکل کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنا کر گلے میں ڈالتی ہیں۔ وہ اسے بطور گنڈہ بھی پہنتی ہیں۔ خاص کر کنواری لڑکیاں اس کے پہننے سے تمام بلاؤں سے محفوظ رہتی ہیں۔ اسلام میں بت بنانا بھی بت پرستی کے مترادف سمجھا جاتا ہے پھر یہ عجیب بات ہے کہ اسلام کی بیٹیاں آج بت بنانے کو فائن آرٹس کا لیبل لگا کر بڑے ذوق و شوق سے فائن آرٹس کالجوں اور نیشنل آرٹ کونسلوں میں جا کر بت بنانا سیکھتی ہیں۔ اسلام نے بتوں کو توڑا بتوں کو کعبہ سے بے عزت کر کے نکالا اور اسلام کی بیٹیاں ان بتوں کو فنون لطیفہ کے غیر فانی شاہکار کہتے ہوئے اپنی تعلیمات کا ضروری جزو سمجھتی ہیں ان کو جزو زندگی بنا لیا ہے۔ ملت کی بیٹیوں نے بتوں کو آستینوں میں نہیں چھپایا ہوا بلکہ سینے سے لگایا ہوا ہے۔ اور جب ایک لڑکی ماڈل بن کر عریاں اور ننگی بت تراش کے سامنے کوئی پوز بناتی ہے تو حضرت اقبال کی روح اس وقت نہ جانے کیا کہتی ہے۔

بابل میں اُشتار دیوی کی پوجا کے وقت مردانہ و زنانہ اعضا کی ہم شکل روٹیاں بنا کر پوجا کے بعد انہیں کھایا جاتا تھا۔ میں نے ملت کی کئی بیٹیوں کو اس شکل کے بیف برگر اور سینڈوچز کھاتے دیکھا ہے۔ اور نفرت سے زمین پر تھوکا ہے۔ یہ ملت کی بیٹیاں نہیں اندھیرے کی بیٹیاں ہیں، شیطان کی بیٹیاں ہیں، شیطان کے بیٹے ہیں۔ جن کے اعصاب پر جنسی بھوت کچھ اس طرح سوار ہے کہ جنس میں بھی ظلم پسندی کا مزہ لیتے ہیں۔ انہی اندھیروں میں اندھیروں کی ان بیٹیوں اور بیٹوں کی کافی تعداد ملے گی جو جنس میں ظلم پسند واقع ہوئے ہیں۔ معاشرے میں آئے دن اغوا، زنا بالجبر اور اس کے بعد قتل کی جو وارداتیں ہو رہی ہیں اسی جنسی ظلم پسندی کی نہایت ہی گھناونی شکلیں ہیں۔ ماہرین نفسیات نے اس جذبہ کا نام رکھا ہے Mosqchism یا ظلم پسندی۔ یہ معاشرہ کے عمومی رویہ کے خلاف ایک قسم کی بغاوت یا بے راہ روی ہے۔ اس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ مرد عورتوں کے جوتوں کی پالش کر کے یہ محسوس کرے جیسے اسے جنسی تسکین ہو رہی ہے۔

جنسی بے راہ روی اور کجروی آج کل اتنی کثرت سے ہمارے معاشرہ میں موجود ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جنسی قربت سے پہلے کئی عورتیں مار کھانے کی عادی ہیں۔ پٹنے سے انہیں تکلیف تو ہوتی ہے لیکن جنسی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مار کھانے کے دوران ہی جنسی منتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ کچھ مردوں اور عورتوں میں جنسی رفیق کی تکلیف پہنچانے کی خواہش موجود ہے۔ جنسی منتہا پر پہنچنے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹتے ہیں۔ میرے مشاہدہ میں دوسری لڑکیوں کے علاوہ کالج اور ہائی سکولوں کی ایسی لڑکیاں بھی آئی ہیں۔ جن کے گالوں اور سینوں پر میں نے دانتوں کے نشان دیکھے ہیں۔ یہ ایک حد تک سادیت پسندی Sadism ہے جس میں جنسی رفیق کو ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچانے کے بعد ہی جنسی منتہا کا مزا آتا ہے۔ یہ وحشی جذبہ آج کل تمہارے معاشرے میں جنون کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ جس کا محرک جنس و جرائم سے بھرپور لٹریچر ہے جسے بین کرنا چاہیئے۔

کالج کی ایک لڑکی نے اپنی سہیلی کو اپنے رومانس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا۔

"جب تک میرا بوائے فرینڈ مجھے ہنٹر سے نہیں پیٹتا، میرے بال نہیں نوچتا۔ میرے کپڑے نہیں پھاڑتا۔ مجھے مزا نہیں آتا۔ اور دوران حیض میں میری یہ

خواہش بڑی بڑھ جاتی ہے۔"

سینما کے تاریک ہال میں پردہ سیمیں پر کوئی فحش فلم دیکھتے ہوئے لڑکے کا لڑکی کو یا لڑکی کا لڑکے کو اپنے ناخنوں سے نوچنا اور چٹکیاں لینا جنسی قربت کا جزو بن جاتا ہے۔

معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے پردگی، بے شرمی اور نیم عریانی سے جنسی انحراف یا غیر فطری جنسی تجاوز کی جھلکیاں بھی عام دیکھنے میں آ رہی ہیں۔

جنسی انحراف کی ایک مثال جنس کے متعلق باآواز بلند انتہائی بے حیائی کے ساتھ گفتگو کرنے میں ملتی ہے۔ ایک عورت کا بیان ہے کہ اس کا شوہر ویسے تو بالکل مہذب اور تعلیم یافتہ ہے لیکن جب دونوں تنہا ہوتے ہیں تو اس کا شوہر جنس سے متعلق انتہائی بے شرمی کی باتیں کرتا ہے۔ اور اسے جنسی اعضا اور جنسی فعل کے ذکر میں بے حد لطف آتا ہے۔

اخباروں کے ذریعے اکثر ایسے واقعات بھی ہمیں معلوم ہوتے رہتے ہیں کہ پولیس نے کسی نوجوان کو راہ چلتی عورت کے ساتھ غیر اخلاقی باتیں یا گندے الفاظ استعمال کرنے کے جرم میں گرفتار کیا۔ اس قسم کے جنسی انحراف کو Coprophemia کہتے ہیں۔ اس کو مخالف جنس کو پیشاب کرتے دیکھ کر بھی جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے کئی واقعات معلوم ہو چکے ہیں جس میں عورت کو جنسی تسکین حاصل نہ ہو سکی لیکن کسی مرد کو پیشاب کرتے ہوئے دیکھنے سے اس کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔ اور ایسا مرد کے ساتھ بھی ہوا عورت کو پیشاب کرتے دیکھا اور جذبات مشتعل ہو گئے۔ ایسے غیر معمولی جنسی انحراف کا یہ مرض بھی معاشرے میں عام دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اڑوس پڑوس کے لڑکے لڑکیاں اکثر ایسا کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک لڑکا ایک گرلز سکول کی پیشاب گاہ کے قریب چھپا پکڑا گیا۔ وہ اسی مرض کا شکار تھا۔ یہ مرض جنسی ننگی تصویریں، کوک شاستر اور فحاشی سے بھرپور فلمیں دیکھنے سے زیادہ تر پیدا ہوتا ہے۔ کئی شخص دوسرے جوڑے کو جنسی اختلاط کی حالت میں دیکھ کر اپنی جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ بعض ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں حیوانوں کو جنسی ملاپ کرتے دیکھ کر جنسی انتشار پیدا ہوتا ہے۔

شب گزیدہ لوگو ——— !

تمہاری نئی پود کے اعصاب پر جنس کا بھوت پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہو رہا ہے۔ فیشن

زدہ پچھتر فی صد لڑکے لڑکیاں جنسی کج روی میں مبتلا ہیں۔ وہ سب Fetish ہیں۔ یہ لوگ جذباتی اعتبار سے جنسی کجروی میں مبتلا ہیں۔ اور وہ بجائے انسان کے کسی بے جان شے یا اس سے متعلقہ کسی چیز کو اپنا ذریعہ تسکین بناتے ہیں۔ اور ان کا مقصود جنس خود عورت نہیں بلکہ اس کا کوئی حصہ جسم مثلاً بال یا پاؤں یا اس کی کوئی چیز مثلاً رومال یا بلاؤز بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا مقصود جنسی عورت کے بالوں سے نکلا ہوا پھول یا لپ اسٹک یا خوشبو بھی ہو سکتی ہے۔

رومال پر پسندیدہ لڑکے لڑکی کا نام کاڑھنا بھی ایک قسم کے جذباتی لگاؤ کا مظہر ہے۔ آج کل بازاروں اور مارکیٹوں میں عورت مرد کے بکتے ہوئے مصنوعی فال۔ چوٹیاں اور وگیں اس رجحان کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ثبوت ہیں۔ اس جذبے کی تسکین کے لئے مصنوعی پستان، باڈیاں، کولہوں کو ابھارنے والے پیڈ، کمر کو تیلی اور باریک بنانے والے پیڈ فروخت ہوتے ہیں۔ تمہاری مہذب سوسائٹی میں اس قسم کی شریف طوائفیں بھی ہیں جو اس قسم کے کج رو انسانوں کی خواہشات کی تسکین کے لئے غیر معمولی طور پر اونچی ایڑی کے جوتے پہنتی ہیں بہرحال اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس قسم کی جنسی اشاریت کسی گناہ کے تصور سے جنم لیتی ہے۔ اور تمہاری روزمرہ زندگی کے لمحات میں اس رمزیت اور اشاریت کو بہت دخل ہے۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

ان اندھیروں کی جنس زدہ لڑکیاں اور لڑکے فلمی فنکاروں اور ایکٹرسوں کی تصویروں میں دیوانگی کی حد تک دلچسپی لے رہے ہیں

سن بلوغت، جوانی، شباب کی نشانیاں مثلاً چہرے پر سبزہ خط، سینہ کا ابھار وغیرہ ایک انسان کو شعوری طور پر بالغ نہیں بنا دیتا۔ جسم کو بالغ بنانے کا کام تو فطرت خود انجام دیتی۔

فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

لیکن ذہن کو بالغ بنانے میں ماحول، ابتدائی تعلیم اور تربیت کا بڑا عمل دخل ہے

جنسی رو، جنسی ماحول، تعلیم میں جنسی ترغیبات اور جنس زدہ والدین کی تربیت سے متاثر ہو کر اس معاشرہ بہت سی نوخیز کلیاں پھول بن چکی ہیں۔ کم عمر بیٹیوں کے ماں بننے کی خبریں بھی اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ جنسی شعور مختلف جنس کے افراد سے ربط و ضبط بڑھانے سے، اور ان سے جنسی اختلاط کے مواقع فراہم ہونے سے پیدا ہو رہا ہے۔ جنسی جذبات سے عدم واقفیت اتنی ہی خطرناک ہے جتنی کہ برقی رو سے بھرپور کوئی بجلی کا تار۔ جس کے جھٹکے سے نہ صرف سوسائٹی و خاندان کی بنیاد بلکہ پوری قوم بھی تباہ ہو سکتی ہے۔

اس معاشرے میں تمہیں ایسے مرد بھی ملیں گے جو کبھی عورت سے محبت کئے بغیر جنسی تعلقات پیدا کر لیتے ہیں۔ اس لئے طوائف کا وجود ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ معاشرہ میں ایسی عورتیں بھی ملیں گی جو شادی کے بغیر جنسی خواہشات کی تکلیف کرتی رہتی ہیں۔

تمہاری سماج میں جنس سے متعلق غلط تصورات کے وجود نے مختلف قسم کے خوف اور الجھنوں کو پیدا کر دیا ہے۔ جن کی بنیاد زیادہ تر جنسی ہوتی ہے۔ اور انہی کے باعث جنسی بے حسی اور جنسی ناتوانی اس وجہ سے ہے کہ ان جنسی اندھیروں کی عورت اس قدر شہوانیت پرست ہو چکی ہے کہ جنسی اختلاط سے مشکل ہی سے عروج پر پہنچتی ہے۔ اور وہ جنسی تسکین کے لئے ایک سے زیادہ مردوں سے رجوع کرتی ہے، اس طرح ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے۔

جنسی صحت اور غذا میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ جنسی کمزوریوں کی بحالی کے لئے ہزاروں قسم کی دوائیاں اور ٹیکے بازار میں فروخت ہو رہے ہیں۔ اس طرح ایک غریب اور ترقی پذیر ملک کا بہت سا سرمایہ اس جنسی بیداری پر صرف ہو کر ملک سے باہر جا رہا ہے۔

بعض قسم کے ملذذ کھانے جنسی جذبات کو ابھارتے ہیں۔ گوشت کھانے والا مرد ترکاری کھانے والے مرد سے زیادہ تیزی سے بیدار ہوتا ہے۔ اور زیادہ تیزی سے جنسی قربت کو جاری رکھ سکتا ہے۔ انڈوں اور دوسری گرم اور مصالحہ دار چٹ پٹی اشیاء کی بھی یہ خصوصیت ہے۔ کھاتے پیتے گھرانوں میں گوشت، انڈوں اور دوسری گرم چٹ پٹی چیزیں کھانے کا اسی جنسی خواہش کی تکمیل کی ترجمانی کرتا ہے۔

جنسی تحریک وکشش میں قوت شامہ کو بڑا دخل ہے۔ اس لیئے آج کل خوشبوؤں کا استعمال عام ہے۔ خوشبوؤں سے جسمانی کشش میں اضافہ ہوتا ہے۔ جنس مخالف میں جنسی رغبت پیدا کرنے کے لیئے خوشبو جادو کا کام کرتی ہے۔ بھینی بھینی خوشبو جنسی کشش اور بیداری میں بہت اہم حصہ لیتی ہے۔

جسم انسانی کی چند مخصوص بدبوؤں سے جنسی تحریک جہاں بیدار ہوتی ہے وہاں دب بھی جاتی ہے۔ مثلاً دانتوں کی بو یا میلے جسم کے پسینے کی بو سے جنسی تحریک دب جاتی ہے۔ مرد یا عورت میں وقتی طور پر جنسی جذبات دب جاتے ہیں۔ سرد پڑ جاتے ہیں۔ اور عورت مرد ایک دوسرے سے جنسی قربت سے نفرت کرتے ہیں۔ اس مرد اور عورتیں اپنی جسمانی بدبو کو دور کرنے کے لیئے بڑی تیز خوشبوئیں استعمال کرتے ہیں۔ جنسی جذبات بیدار کرنے میں بڑی زود اثر ثابت ہوتی ہے۔ ملک کا بہت سا سرمایہ آج غیر ملکی درآمد ہونے والی خوشبویات یعنی شیمپو، کریم، سنو، پاؤڈر، کاسمیٹکس اور ایرومیٹکس پر صرف ہو رہا ہے۔ جنسیات وشہوانیات کو ابھارنے والی ایسی خوشبوئیں معاشرے میں بڑی گھناونی اور خطرناک بدبوئیں پھیلا رہی ہیں۔ نئی پود کی جنسی رفتار کو تیز کر کے ذلت وظلمت اور تباہی وبربادی کے غار میں دھکیلنے میں ایسی خوشبوؤں کا بھی ہاتھ ہے۔

بن ٹھن کر آئینے میں بار بار جھانکنے کا رجحان بھی معاشرے میں بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ لڑکیاں اپنے پرس میں اور لڑکے پتلون کوٹ کی جیب میں چھوٹے چھوٹے خوشنما آئینے اور کنگھیاں لیئے پھرتے ہیں۔ بعض لڑکیوں نے تو پرس میں میک اپ کا پورا سامان رکھا ہوتا ہے۔ راہ چلتے بناؤ سنگھار کرتی رہتی ہیں۔ وہ نرگسیت یعنی محبت بالذات کا شکار ہو رہی ہیں۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ صرف عورت ہی نرگسیت کا شکار ہوتی ہے۔ مردوں میں بھی خاص کر نئی پود کے نوجوانوں میں اس کے اثرات عورتوں سے کسی صورت میں کم نہیں۔ نرگسیت اس قدر عام ہے کہ اس مظاہرے راہ چلتے لڑکے لڑکیوں میں دیکھیئے۔ لڑکوں کی اکثریت اپنے بالوں یا ٹائی کو درست کرتی ہے۔ عورتیں اکثر ہونٹوں کی سرخی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔

نرگسیت کسی حد تک اچھی بھی ہے اور بری بھی۔ نرگسیت انتہائی شکل اختیار کرتی ہے جب جنسی جذبات اپنی ذات کو پسند کرنے کے فعل میں جذب ہو جاتے ہیں یا بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔

بعض لڑکے لڑکیاں اپنے ہی ہاتھ کو چومنے سے وہی لذت حاصل کرتے ہیں جو جنسی فعل سے ہوتی ہے۔ نرگسیت چونکہ محبت بالذات کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے اس لئے ایسے لڑکے لڑکی کا منطقی تصور بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ جنسی فعل بھی خود ہی اپنی ذات سے کرے۔ لڑکیوں میں چپٹی کھیلنے اور لڑکوں میں مشت زنی کرنے کی بری عادت اس سے پیدا ہو رہی ہے۔ لڑکیوں کے پرس، کمرے کے کسی پوشیدہ گوشے یا میز کے دراز سے دستیاب ہونے والے مصنوعی مردانہ عضو مخصوص کی بیشتر مثالیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔

آج کل لڑکی جو لچر فلمیں دیکھتی ہے۔ لٹریچر پڑھتی ہے۔ [illegible] تصویریں دیکھتی ہے ان سے متاثر ہو کر جب اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی ہے تو اپنے حسن سے متاثر ہوتی ہے۔ نرگسیت کی انتہائی حد تک پہنچے ہوئے لوگ اکثر ناقابل علاج ہوتے ہیں۔

جنس زدہ ان لوگوں میں ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ جن میں دو صنفوں کے جنسی اعضا موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ جاننا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان کو مرد سمجھا جائے یا عورت کہا جائے۔ ان میں سے بعض افراد تو مرد اور عورت دونوں کی جنسی زندگی گزار رہے ہیں۔ جو سائی ڈوما فروڈائٹس ہیں، دو جنسئے ہیں۔ جو دوسری صنف کی حرکات وسکنات اور لباس اختیار کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس کے تحت جو مرد آتے ہیں وہ عورتوں کی طرح بال رکھنے اور کپڑے پہننا پسند کرتے ہیں۔ اور عورتیں مردوں کی طرح بال رکھ کر اور مردانہ لباس پہن کر ایک خوشی سی محسوس کرتی ہیں۔

کچھ افراد ایسے ہیں جن کی صرف کپڑے پہن کر تسلی نہیں ہوتی۔ اکثر تو دوسری صنف کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔

بڑھتی ہوئی جنس پرستی سے معاشرے میں ہم جنس پرستی کی بری عادت بھی عروج پر ہے۔ ہم جنس پرستی کے پردوں میں نرگسیت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ہم جنس پرستوں کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جو مفعول کا کام دیتے ہیں دوسرے فاعل کا۔ یہ دونوں اقسام مردوں اور عورتوں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ ہم جنس کا رجحان ومیلان معاشرہ میں نہایت سرعت سے پھیل رہا ہے۔ ہم جنس پرستی پیدائشی نہیں اکتسابی رجحان ہے۔

وہ لوگ جنہیں عرف عام میں مخنت، ہجڑے، زنخے کہا جاتا ہے فطری یا پیدائشی ایسے نہیں ہوتے۔ بلکہ انہیں ابتدائی تربیت اور ماحول ایسا بنا دیتا ہے۔

ان جنس زدہ لوگوں میں خود لذتی کا رجحان بھی نہایت شدت سے بڑھ رہا ہے۔ مرد اور عورتیں دونوں اس بری عادت میں مبتلا ہیں۔ اس کے ہیجان میں اضافہ کرنے والی محرکات میں عریاں تصویریں اور دوسری عورتوں کی اشتہار انگیز جسمانی کشش ہے۔ خوشبویات بھی یہ تحریک پیدا کرتی ہیں۔ تمہاری موجودہ ماڈرن سوسائٹی کے ۶۵ فی صد افراد زندگی کے کسی نہ کسی دور میں خود لذتی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ۶۹ فی صد کالج اور اسکول کے طلبا خود لذتی کا شکار ہیں۔ ۲۵ فی صد لوگ شادی کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس عادت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ خود لذتی کی عادت ماڈرن سوسائٹی کی خواتین میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان میں کالج اور اسکول کی طالبات بھی شامل ہیں۔ وہ حاملہ ہونے سے اس قدر خائف ہوتی ہیں کہ خود لذتی سے اپنی تسکین کرتی ہیں۔ جنسی کج روی کا رجحان جذبات کو مشتعل کرنے والے فحش لٹریچر اور فلموں سے اس معاشرے میں عام ہوتا جا رہا ہے

شب گزیدہ لوگو ——!

تمہارے جنس زدہ معاشرے میں جنسی تعلقات اور جنسی تحریکوں نے کچھ عجیب بھیانک اشکال اختیار کر لی ہیں۔ جس کی وجہ سے جنسی تعلقات میں صالح نسل کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک وحشیانہ جذبہ اکسا رہا ہے اور جنس کا شکار لوگ اس ابال کو ختم کرنے کے لئے نہ جانے کیسی کیسی جنسی تحریکیں چلا رہے ہیں۔ اور ہر قیمت پر اپنے جنسی تقاضوں کو وحشیانہ طریقوں سے پورا کر رہے ہیں۔ سماجی اقدار اور قوانین کی پابندی سے آزاد زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ اپنی جنسی لغزشوں کو چھپانے کی زیادہ کوشش بھی نہیں کرتے۔ ان میں وہ کم عمر لڑکے لڑکیاں بھی ہیں جو شادی سے پہلے یونہی تفریحاً جنسی جذبات کی آگ سے کھیلتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں میں جنسی معلومات کی کمی ہوتی ہے۔ ان کو اپنے آپ پر قابو نہیں ہوتا اس لئے وہ اس جنسی آگ میں بری طرح جل جاتی ہیں۔ جنسی طوفان میں بہہ جاتی ہیں۔ اس کی ذمہ داری ان کے والدین پر عائد ہوتی ہے جو ان کی نگرانی نہیں کرتے۔ اس معاشرے میں ایسے تعلیمی یا تفریحی

مقامات بھی ملیں گے جہاں لڑکیاں کنواری ہی حاملہ ہو جاتی ہیں۔ آج تمہارے گھروں میں بھی نوجوان کنواری لڑکیوں اور لڑکوں کی زیادہ نگرانی نہیں ہوتی۔ جو نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ایسی محفلیں منعقد کرتے ہیں جہاں وہ اپنے جنسی جذبات کو ہرا دے سکیں۔ بچوں کے جنسی رجحانات بہت کم عمری ہی سے ڈھلنے لگتے ہیں۔ جیسے ہی بچے دوسروں کی باتیں سمجھنے لگتے ہیں ان میں سماجی شعور پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو اس عمر ہی سے زندہ رہنے کا فن سکھانے کی کوشش کی جائے۔

جنسی تعلقات فطری ہی سہی لیکن معاشرہ کے دوسرے پہلوؤں کی طرح انہیں بھی اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہیئے۔ اور عام مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے برخلاف آج کل نوجوان لڑکے لڑکیاں پارٹیوں میں دوسروں کی موجودگی کے باوجود پیار محبت کی انتہائی حدوں پر پہنچنے سے نہیں ہچکچاتیں۔ آج کل کے والدین خود اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے بچوں کی خبر نہیں رہتی کہ وہ کیا کر رہے ہیں اس بے راہ روی اور لاپرواہی سے لڑکے لڑکیاں نہیں جانتی کہ اپنے فرصت کے اوقات کیسے گزاریں۔ اس لئے وہ محبت بازی کرنے لگتے ہیں۔

یہ صفحات اپنی شرح خود آپ ہیں، ایک شفاف آئینہ ہے جو مصلحین قوم اور ملی رہنماؤں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ ملک و ملت کے متعلق اپنی غفلت شعاریوں کا مکردہ چہرہ دیکھ سکیں۔ اگر ان صفحات کو بصیرت نگاہ سے عقل سلیم کی روشنی میں نہ پڑھا گیا تو مجھ پر بڑا ظلم ہوگا۔ یہ حقیقت و واقعیت ہے کہ اس کاغذی پیرہن میں تمہاری جسمانی، روحانی اور اخلاقی زندگی کے گھناؤنے نقوش پیش کئے گئے ہیں کہ تم لوگ اگر ان نقوش کے معنی سمجھ سکو تو سمجھ لو۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ جس وقت تک تم اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو گے سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا ادعا محض حرف غلط رہے گا۔

یہ اوراق تمہاری ظاہری و باطنی زندگی کا عکس ہیں جو مبالغہ و مغالطہ سے یکسر پاک ہے یہ اوراق سیہ کاریوں کے بازار میں تمہاری خونچکاں فطرت کا ایک گہرا مطالعہ ہیں جو تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں چشم عبرت کا محتاج ہیں۔ تمہارے افعال و اشغال کی دردناک تصویروں کی رنگ آمیزی ان کو جاذب نظر بنانے کے لئے ضروری تھی۔

یہ اوراق اور ان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ نہ تو انشاپردازی اور فصاحت و بلاغت کی مشق ہے اور یہ شعلہ بیانی اور زورِ قلم کا مظاہرہ۔ بلکہ ان اوراق میں تم میں سے جو دیکھ سکتے ہوں ان کے لئے ایک ایک لفظ ایک فوارہ خون ہے۔ ایک ایک جملہ ایک فریاد ہے۔ ایک دکھی کی پکار ہے۔ ان کے ہر عنوان میں اس دل کا دردِ پنہاں ہے جو تمہارے لئے لہو کے آنسو دیا ہے۔

اور یہ بھی نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان اوراق میں میں نے تمہارے خلاف کسی تنفر و حقارت کا اظہار کیا ہے۔ تمہاری زندگی کا فلسفہ اس قدر نفرت انگیز نہیں جس قدر درد انگیز ہے۔

زبان کے کانٹے

لبستہ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوعِ انسان قوم ہو میری وطن میرا جہاں

لسانی اور طبقاتی جھگڑے وہ کانٹے ہیں جو میرے دشمنوں نے میرے راستوں میں اس لئے بچھائے ہیں کہ میری سالمیت کو پارہ پارہ کر دیں۔ انہوں نے بین الصوبائی تعصب پھیلانے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں۔ یک جہتی کی زمین میں ہمیشہ انہوں نے انتشار کے بیج بونے کی کوشش کی ہے۔

یہ زبانیں جنھیں تم نے میرے دامن کے کانٹے بنا رہے ہو، تمھارے خبث باطن کی پیداوار ہیں۔ وہ بغض و عناد جو تمھیں میری ذات سے ہے۔ اس کی بہت سی بھیانک شکلیں ہیں۔ ورنہ ایک ہی آواز ہے اور اس کے مختلف لہجے ہیں۔ یہ زبانیں جو میرے طول و عرض کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں ایک دوسری کے لئے کوئی چیلنج نہیں، کوئی نفرت نہیں، کوئی خطرہ نہیں۔ تم ہی انہیں ایک دوسری کے لئے چیلنج بنا رہے ہو ان میں نفرت پھیلانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور ایک فرضی خطرے کو اپنے خبث باطن کے پردوں میں ڈھانپ کر اس کے ہاتھ میں تلوار پکڑاتے ہوئے اسے قتل عام پر ابھار رہے ہیں۔ میری اسلامی حیثیت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ تمھارے دل میں میرے لئے چاہت کا ایک پھول بھی باقی نہیں ہے اور پھول تم دے بھی کیسے سکتے ہو۔ تمھاری حیثیت تو اس معاشرے میں تھوہر کے پودے کی سی ہے۔ تم خود سانپ ہو میرے طول و عرض میں بولی جانے والی زبانوں میں زہر کی بوندیں بھر رہے ہو۔

میرے دامن سے الجھے ہوئے زہریلے کانٹو۔۔!

اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کو وہ ایک نشان ضرور تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد فاصل نہیں

دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے۔ جو انسان کو اس کے خالق سے متصل کرتا ہے، اور ایک ہے۔ اس لئے اس کو ماننے والوں کو بھی ایک ہونا چاہیئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو ہمارے رشتے زبانوں اور زمینوں کے زندانی نہیں ہیں اور نہ ہمارے جذبے سرحدوں کے اسیر ہیں —!

آپس میں محبت کرنا سیکھو۔ محبت اظہارِ محبت کی زباں تمہیں خود بخود سکھا دے گی!

دلِ زخم زخم

میرے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر کے صنم
آج بت خانے میں بھگوان بنے بیٹھے ہیں!

میں تو ہنس ہنس کر اپنے ان زخموں سے کھیلتا ہوں۔ جو تم نے میرے وجود معنی پر لگائے ہیں اور ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ میں نے اس مختصر داستانِ عبرت میں ان لاکھوں بدنصیبوں کی روئیداد زندگی بیان کی گئی ہے۔ جو اس ملک اس معاشرے میں تمہاری نفس پرستی اور ذاتی لالچ و مطامع کے بھیانک دیوتا پر قربان کئے جا چکے ہیں۔ تمہارے معاشی جبر اور اجتماعی غارت گری نے میرے دل پر ایسے ایسے چرکے لگائے ہیں کہ میری زندگی کا ہر نقش فریادی ہے۔

ان اوراق کے اجمال میں تمہاری سیاہ کاریوں اور تباہ کاریوں کی طرف مبہم و غیر مبہم بہت سے اشارے موجود ہیں۔ جنہیں تم دیکھنے سے گھبراؤ گے اور وہ اس لئے کہ تم کو اس آئینہ خانے کے ہر آئینہ میں اپنی صورت اور اس کے ہولناک خدوخال نظر آئیں گے۔ ان میں تم اپنا ہی عکس معکوس دیکھو گے۔ ان میں تمہیں تمہاری ہی بھیانک پرچھائیاں دکھائی دیں گی۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ روشنیوں کے جیتے جاگتے شہر میں پھیلے ہوئے اندھیروں کے حلقے ان اوراق کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ انہیں مسموم سمجھتے ہوئے ان کو چھونے سے بھی اجتناب کریں۔ ان کی یہ گریز پائی انتہائی در سازشی رویہ اختیار کرے۔ لیکن میں خوب سمجھتا ہوں کہ روشنیوں کے جیتے جاگتے شہر آزاد پاکستان کی تقریباً نصف سے زیادہ آبادی ابھی تک پا بہ زنجیر اور مہر بہ لب ہے۔ آسیب زدہ اندھیروں میں اونگھتے رینگتے لوگوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو جاگ رہے ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے جو میں محسوس کر رہا ہوں۔ وہ بھی وہی محسوس کر رہے ہیں۔ ان کے اندازِ فکر اور میرے اندازِ فکر میں بڑی مطابقت ہے۔ جن خطوط پر میں سوچ رہا ہوں۔ وہ بھی انہی خطوط پہ سوچ رہے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ یہ اوراق بصیرت نگاہ سے عقل کی روشنی میں بڑے انہماک د

استغراق سے پڑھے جائیں گے۔

ان اوراق کو یکجا کرنے سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ جو لوگ میرے مخاطب اصلی ہیں ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے ایک قطرہ خون نکال کر محاکمے اور محاسبے کی خوردبین کے سامنے رکھ دوں۔ تاکہ اس ایک قطرہ خون سے ان تمام جراثیم کا پتہ چل جائے۔ جو تمھارے نظام زندگی کو گھن لگا رہے ہیں۔

سوتے لوگ جاگتا شہر!

درحقیقت تمھارے جسد اجتماعی کا صرف ایک قطرہ خون ہے۔ جو میں بزرگان ملت کی خدمت میں نذر لایا ہوں۔ جن کا فرض تھا کہ مصلوں پر بیٹھ کر تسبیح و اعتکاف کرنے اور منبروں پر چڑھ کر بے معنی و بے نتیجہ وعظ فرمانے اور افکار و خیالات کا اظہار فرمانے کی بجائے اپنی تہذیب و تمدن، اپنی دیرینہ روایات، اپنے ملکی و ملی مناصب اور شعائر کے اس گھناونے ناسور۔ اس چلتے پھرتے کاربنکل۔ اس سانس لینے سوراکس کے لئے جس کا ایک قطرہ خون ان کی بصیرت و بصارت اور عظمت و حکمت کی خوردبین کے سامنے رکھا گیا ہے۔ کوئی مرہم شفا کوئی اکسیر تلاش کرتے اور اپنی قیادت و سیادت اور عظمت و جبروت کے پلیٹ فارم پر محض دھواں دھار تقریریں، لمبے لمبے وعظ اور اپنی لسانیت و چرب زبانی کی شعبدہ بازی دکھاتے ہوئے اندھیروں کی مخلوق کو گمراہ اور اپنے مجرم ضمیر کو تسکین دینے کی کوشش نہ کرتے۔ جو اپنے نفس کو قدرت کی نعمتوں کا اجارہ دار سمجھتے ہیں اور ان کا مجرمانہ استعمال اپنے لئے بالکل جائز سمجھتے ہیں

خدا کی مار ان سکاروں پر...... !

قدرت نے انگور پیدا کیا اور انھوں نے اس کو اپنے لئے خرمستی کا ذریعہ بنا لیا۔ اس کو سڑا گلا کر یک آتشہ، دو آتشہ، سہ آتشہ شراب بنائی۔ خم کے خم حلق میں انڈیلے کہ ان کے گناہ میں ان کی اعانت کرے۔ اس میں لذت پیدا کرے۔

فطرت نے پھول کھلائے۔ غنچے چٹکائے اور انھوں نے ان پھولوں کو شاخساروں سے چن چن کر توڑا۔ اپنے نجس و ناپاک بستروں پر کچلا مسلا۔ یہاں تک خوشنوا پرندوں کی نغمہ ریزی و نغمہ سنجی کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے ان کو پنجروں میں بند کیا۔ ان سے ان کی آزادی چھینی

قدرت نے لوہا پیدا کیا اور انہوں نے اس سے گرنے، ٹینک، توپیں، رائفلیں اور سنگینیں بنائیں۔ خون آشام تلواریں بنائیں اور پھر ان "تلواروں کو ایک دوسرے کے خون سے رنگا۔ انہوں نے توسیع ذات، توسیع زر، توسیع سلطنت کے لئے بستیوں پر بستیاں نیست و نابود کر دیں۔ اپنے تحفظ کے لئے جو سامان قدرت نے انہیں عطا کیا۔ انہوں نے وہ سب ظلم اور زبردستی کے لئے صرف کیا۔ یہ حقِ ملکیت، یہ حقِ تصرف جس کا بڑی شان سے اعلان کیا جاتا ہے جس کو جزوِ مذہب و اخلاق بنایا جاتا ہے۔ یہ تفوق و برتری کے جہازی اشتہار جو مناروں اور سبز گنبدوں پر چسپاں کئے جاتے ہیں۔ مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں، عالیشان ایوانوں اور ایف بیلوی شبستانوں میں جو ناقوس پھونکے جاتے ہیں۔ جو لاؤڈ اسپیکر شور مچاتے ہیں۔ یہ سب شور و غوغا، یہ سب ہنگامہ آرائی زیردستوں کے ساتھ زبردستوں کی زبردستی، دھونس دھاندلی اور دھمکی کا اعلان و اشتہار ہے۔ یہ ان کے مکر و فریب کے دام ہمرنگ زمین ہیں۔ جنہیں ان کی فراست و فہم ایکس پلائٹیشن کہتا ہے یعنی بڑی مچھلی کا چھوٹی مچھلی کو نگل جانا۔ ذہین کا کند ذہن کو ذہنی چکر دینا۔ طاقتور کا کمزور کو کچل دینا۔ مکار کا سیدھے سادھے لوگوں کو الو بنانا۔ لوگوں کی نظر بندی کر کے پرکاڈار بنانا۔ جگلر اور مداری بن جانا۔ یہ سب موجودہ سیاست کی زبان میں ایکس پلائٹیشن ہے۔ جس کے جادو کے ڈنڈے سے رہنمائے ملت اور لیڈر قوم بن جانا بڑا آسان ہے۔ اسی جادو سے آج کل محراب و منبر کی قندیلیں روشن ہوتی ہیں اور امیر شریعت پاکبازی و پارسائی پر بازاری عورت ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ حاملین شریعت حقہ اپنی عبا و قبا کے پورے رعب و داب کے ساتھ آستین چڑھاتے ہوئے اور منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے لاکھوں کے ہجوم میں گرجتے چمکتے ہیں کہ اس زانیہ کو زندہ در گور کرو۔ ہماری آنے والی نسلوں کو زندہ در گور کر رہی ہے۔

جتنے علمائے کرام ہیں اتنی ہی جمعیتیں بھی ہیں اور ان کا اپنا اپنا پرچم ہے۔ اپنا اپنا پلیٹ فارم ہے۔ دوسروں سے الگ تھلگ اپنا ایک نظریہ ہے۔ جب کہ ہونا تو یہ چاہئے کہ وہ سب جمعیتیں صرف ایک جمعیت ہو جائیں۔ بس ایک جمعیۃ علماء۔ جس کا بس ایک ہلالی پرچم ہو۔ ایک پلیٹ فارم ہو۔ بس ایک نظریہ ہو۔ کیونکہ اسلام ایک ہے، کتاب ایک ہے۔ رسول ایک ہے۔ ان

سب کے لئے پاکستان کا پرچم ہی کافی ہے اور ان سب کے لئے بس ایک ہی لائحہ عمل ہے اور وہ ہے۔ پاکستان کی تعمیر و ترقی، لیکن ان کے اپنے اپنے الگ راستے ہیں اور ان کے خلاف آواز بلند کرنا ان کو مشتعل کرنا ہے۔ پھر وہ پکٹنگ کرتے ہیں۔ گھراؤ کرتے ہیں۔ پتھراؤ کرتے ہیں۔ لیکن جو آواز بلند ہو چکی ہے۔ وہ بند نہیں ہو سکتی۔ پانی کا وہ قطرہ جو مسلسل گرتا رہتا ہے۔ ایک دن پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔ آج اپنی پاکبازی و پارسائی کا، اپنی مظلومیت کا، اپنی حق پرستی کا ایک حقیقت ناشناس، خود غرض اور ظاہر پرست دنیا کو یقین دلانا مشکل ہے۔ لیکن وہ دن آئے گا۔ جب پتھروں میں سوراخ ہو جائیں گے۔ جب بڑے بڑے سرکش سر جھکانے پر مجبور ہوں گے۔ پھر کھوٹا سکہ زر خالص نہ کہلائے گا۔ زہد و اتقا کے اسباب، مکر و فریب کے ذریعے ہاتھ میں تسبیح لے کر داڑھی میں عطر پھیلیل لگا کر ملت کی جیب سے اس کا سرمایہ نہ نکالیں گے نہ شریعت کے نام پر عیاشی و نفس پرستی ہو گی۔ پھر کوئی بھیڑیا ناقص العقل بکریوں کے ریوڑ کا گڈریا ہونے کا دعویٰ نہ کرے گا۔ کسی عصمت فروش سیاست کی دکان نہ چمکے گی۔ بڑے بڑے عمامے والے اپنے علم و فضل کو اپنی اغراض فاسدہ کی تکمیل کے لئے استعمال نہ کر سکیں گے۔ کوئی نقلی مولانا، حضرت اقدس اور جناب محترم کہیں مصلے پر کسی حجرے میں بیٹھ کر کسی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر کوئی غلط فتویٰ نہ دے سکیں گے۔ مذہب حقہ مولویانہ معمہ بازی سے بالکل خارج ہو گا۔

لیکن اس وقت تو میرے لئے بڑی ہی الجھنیں ہیں اور ان الجھنوں کو سلجھانے والا کون ہے؟

کہاں ہے؟\
کیا تم سلجھا سکو گے؟\
کیا جبہ و عمامہ سلجھا سکا ہے؟\
تسبیح و مصلے سلجھا سکا؟\
رہبر ملت اور تاجدار سیاست سلجھا سکے؟\
کوئی غمخوار قوم سلجھا سکا؟

ہرگز نہیں۔ وہ الجھنیں جہاں تھیں۔ بدستور وہیں ہیں۔ بیٹا باپ کو نہیں سمجھا بھائی

بھائی کو نہیں سمجھ سکا۔ بیٹی ماں کو نہیں پہنچان سکی۔ ماں اولاد کو نہیں پہچان رہی۔ کوئی ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں سمجھ سکا۔

باوجود ادعائے عقل و فہم معمولی پیش پا افتادہ حقائق بھی سمجھ میں نہیں آسکے

وہی منزلیں وہی مرحلے وہی کاررواں وہی فاصلے

مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

یہ جو لوگ باطن میں مذہب سے دور رہتے ہوئے ظاہر میں مذہب مذہب پکارتے ہیں۔ درحقیقت ایک قسم کے بت پرست ہیں۔ ان کے بت پتھر یا لکڑی کے نہیں سونے چاندی کے ہیں۔ گوشت پوست کے ہیں۔ تخیل و توہم ان کے دیوتا ہیں۔ ذاتی خواہش ان کا خدا ہے۔ مندر اور شوالہ کی بجائے ان کا دیوتا ان کے اغراض و مقاصد کے سومنات میں رہتا ہے۔ خدا سے زیادہ یہ سب اس دیوتا کے غلام ہیں۔ ان کے پجاری ہیں۔

میں پوچھتا ہوں۔ مذہب کی جو تعلیمات تمہارے سامنے ہیں۔ ان تعلیمات نے تمہارے احساس و ادراک کے کتنے پردے اٹھائے ہیں۔ تمہارے علم میں کتنا اضافہ کیا ہے۔ آج اٹھائیس سال گزر چکے ہیں۔ اس سیاہ پردے کا ایک کونہ بھی تم سے نہ اٹھایا جا سکا۔ جو تمہاری عقل پر پڑا ہے۔ طوطے کی طرح چند خود ساختہ اصولوں کو رٹتے جانے میں کوئی منطق نہیں ہے۔ مذہب کا جو تصور تم نے بنا رکھا ہے۔ وہ بڑا ہی بھیانک ہے۔ میں اس سے بیزار ہوں۔ اس تصور کے پرستاروں نے روشنیوں کے اس شہر میں جس قدر فساد برپا کیا ہے۔ جس قدر خون بہایا ہے۔ اس کی حد و انتہا نہیں ہے۔ یہ زندگی کے جس قدر اصول اور قاعدے بنائے جاتے ہیں۔ سب باور ہوا ہیں۔ آج ایک قلعہ قائم ہوتا ہے۔ کل ٹوٹ جاتا ہے۔ تمہاری زندگی کی بس یہی ترکیب ہے کہ الجھتے جاؤ۔ ایک الجھے کو سلجھانے کی کوشش میں اور بیس الجھیڑے مزید پیدا کر لو۔

فلسفی کا فلسفہ، حکیم کی حکمت، منطقی کی منطق، ولی کی ولایت، صوفی کا تصوف، سیاست دان کی سیاست، یہ سب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں جو اندھیروں کے سمندر میں کبھی ڈوبتی ہیں کبھی تیرنے لگتی ہے۔

یعنی تم.....!

جو محلوں کے خواب دیکھ رہے ہو اور تمھارے جھونپڑے میں آگ لگی ہے۔ تمھارا تخیل تم کو ایک اونچے پہاڑ پر چڑھا رہا ہے۔ جب کہ تم اپنی ہی غلاظتوں کے گڑھے میں گرے ہوئے ہو۔

تم وہ ہو جو آزاد ہو کر بھی ان گنت زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہو۔ ایک کی غلامی کا جوا کندھوں سے اتار کر تم نے جانے کتنوں کی غلامی کا جوا کندھوں پہ اٹھا لیا ہے۔ تمھاری ان زنجیروں کے مختلف نام ہیں۔ دیکھو اور پہچانو تم سے لپٹی ہوئی زنجیروں میں کونسی زنجیر کا کیا نام ہے۔ تم وہ ہو جن کو جن کا تصور بہکا رہا ہے۔ دھوکہ دے رہا ہے کہ تم شدت اور عزت کے ساتویں آسمان پر چڑھے جا رہے ہو۔ تمھارے گلے میں منوں ہار پڑے ہیں۔ تمہاری گاڑی کو ہزاروں انسان کھینچ رہے ہیں۔ تم فرعون اور نمرود بنے بیٹھے ہو۔ تمھارے جلال کے آتشیں کوڑے ہانپتے کانپتے بھوکے پیاسے انسانوں کی پیٹھ پر پڑ رہے ہیں۔ تمہاری ہر سانس کے ساتھ حریت کے شعلے نکل رہے ہیں۔ پھر سوتے سوتے اچانک تم جاگتے ہو تو خنڈو خانے کے بوسیدہ بوریے پر اپنے آپ کو پڑا پاتے ہو۔

تمھارا پیکر خیال تمھیں یہ خیالی غچہ دیتا ہے کہ تمھارے ہاتھوں کو فرشتے بوسے دے رہے ہیں۔ حوریں اور غلمان سر جھکائے تمھارے سامنے کھڑے ہیں۔ تمھارے ایک اشارے پر جنت و دوزخ کے دروازے کھولے اور بند کئے جا رہے ہیں۔ پھر اچانک لوہے کے بھاری کواڑوں کے بند ہونے کی آواز تمھیں چونکا دیتی ہے اور تمھیں معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک منکوحہ عورت کو فرار اور فرم کا روپیہ غبن کرنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیئے گئے ہو۔

تم تصور کر رہے ہو کہ تم تلاوت قرآن کر رہے ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کر رہے ہو۔ دودھ میں پانی، گھی میں موبل آئیل، مرچوں میں چوکر اور خالص میں ناخالص ملا رہے ہو یہ ہے تمھارے ضمیر کی میزان۔

تم خواب دیکھ رہے ہو شیر کے شکار کا اور سوتے سوتے ناک پر مچھر کے ڈنک کی تکلیف سے اچھل پڑتے ہو۔ تمھارا تخیل تمھارے منہ میں لذیذ اور لطیف غذاؤں کے لقمے دے رہا ہے لیکن تمھارے ہاتھوں میں سوکھی ہوئی روٹی کا پھپھوندی لگا ٹکڑا ہے۔ تم خواب دیکھ رہے ہو

حاکمانہ عظمت وجلال کا لیکن آنکھ کھلنے کے بعد اپنی اصلیت کو ایک غلام سے زیادہ نہیں پاتے۔

تم خواب دیکھ رہے ہو تمھارے ہاتھ میں میزانِ عدل ہے۔ جس کے دونوں پلڑوں میں تمھاری نیکیاں ہی نیکیاں تل رہی ہیں۔ لیکن جب تمھاری آنکھ کھلتی ہے تو تم دیکھتے ہو۔ تمھارے ہاتھ میں ایک ایسا ترازو ہے۔ جس کے دونوں پلڑوں میں پاسنگ ہے۔ بٹے اپنے مخصوص وزن سے کم ہیں اور تم کم تول رہے ہو۔ یہ ہی وہ ترازو ہے جس میں تم اپنے آپ کو اپنی روح کو اپنے ضمیر کو تول رہے ہو۔

لیکن اس وقت تمھیں خواب اور اس کی تعبیر کا فرق معلوم نہیں ہو رہا۔ تم خواب خرگوش میں مبتلا ہو۔ لیکن عنقریب ہی تمھیں وقت جھنجھوڑ کر جگائے گا اور اپنے نیزوں کی نوک تمھارے سینے پر رکھ دے گا اور میں تم سے کہوں گا۔

"لاؤ جو کچھ تم نے مجھ سے گذشتہ سالوں میں چھینا ہے اور اس خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دو جو تم نے میرا بہایا ہے۔ مٹے ہوئے ارمانوں، ٹوٹی ہوئی امیدوں، زخمی دلوں، بگاڑے ہوئے نصیبوں کی قیمت ادا کرو۔ ایک ایک زخم گن لو۔ جو تم نے لگائے ہیں۔ سب ہرے ہیں۔ ان میں سے ہر زخم کے بدلے تمھاری بدکردار روح کو ٹکٹکی سے باندھ کر ایک ایک لاکھ چابک لگائے جائیں گے۔ اس دن تمھارے غرور اور غفلت کی کمر ٹوٹے گی۔ اس دن خدا کے انصاف کی ترازو کے پلڑے برابر ہو جائیں گے"

لیکن یہ میرا انتقام نہیں محاسبہ ہوگا ...!!

جارحیت نہیں عدم جارحیت، کیونکہ جارحیت میرے مسلک میں کسی شکل میں بھی موجود نہیں اور یہ میری تفہیم کے لئے ایک اہم اشارہ ہے۔

تمھارا یوم حساب قریب ہے۔ اس دن تم کو معلوم ہو گا کہ تم نے اپنے بنیادی حقوق کو مٹی میں ملا دیا۔ جب کہ ان کا تصور تمھارے لئے کوئی نیا نہ تھا ہو سکتا ہے۔ دوسروں کی نگاہ میں ان حقوق کی تاریخ یو۔ این۔ او کے چارٹر سے شروع ہوتی ہو یا انگلستان کے میگنا کارٹا سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ لیکن تمھارے لئے اس تصور کا آغاز بہت پہلے ہوا۔ جبکہ مغربی

دنیا میں انسانی حقوق کا تصور دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا۔

سب گزیدہ لوگو۔!

تمھاری نیند اگر موت کی نہیں ہے تو جاگ اٹھو۔ بس اب اٹھ جاؤ۔ جس قدر عبرت کی صدائیں تمھیں جگانا چاہتی ہیں۔ اتنی ہی تمھاری نیند گہری ہوتی جارہی ہے اور تم جو کچھ بڑ بڑا رہے ہو تمھاری بیمار عقل کا ہزیان ہے۔ یہ کسی تہذیب کا لہجہ نہیں اور نہ کسی اخلاق کی زبان ہے۔ سب سے اچھی خیرات میٹھے بول ہیں اور تم لوگ ایسے ہو جو یہ خیرات دینے سے بھی معذور ہو اور میں سوچ رہا ہوں۔ ایسی باتوں کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ آخر تم کیا ہو؟ تم — جو روشنی کی تلاش میں اندھیروں میں جھانک رہے ہو۔ جالوں میں گھلے جا رہے ہو۔ تمھارے چہرے میں یہ تمھاری آنکھیں نہیں۔ آسیب زدہ رات کی آنکھیں ہیں۔ تم اپنے دل کے چور دروازے سے باہر جھانکنے والوں میں سے ہو۔ تم زندگی کے بارے میں جس انداز سے سوچتے رہے ہو۔ وہ اس انداز سے تمھارے گلے نہیں ملی۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جو اپنی زندگی ہی میں مر جاتے ہیں۔ نہ ان کی قبریں بنتی ہیں اور نہ کتبوں پہ ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ ایسے انسانوں کے جینے کا کیا مقصد ہے۔ جو سانس لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں جی رہے ہیں؟